نایاب جیلانی

زرد پتّوں کا شجر

نایاب جیلانی

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958

www.alqurash.com email: info@alqurash.com

پیش لفظ

لکھنا کوئی غیر ممکن کام نہیں۔ تاہم لکھے ہوئے کو سمجھنا دشوار ہے۔ ہر کوئی اپنی فہم کے مطابق پڑھتا اور سمجھتا ہے۔ لکھنے کے ''سیاق'' بھی الگ ہوتے ہیں۔ اسی طرح پڑھنے کے بھی انداز الگ ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لفظ ''سحر'' طاری کر لیتے ہیں اور کچھ ''بے مول'' ہو جاتے ہیں۔ ہر لکھاری اپنی طرف سے کہانی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

میں نے کہاں تک اپنے لکھنے کا ''حق'' ادا کیا، یہ تو پڑھنے والوں کی ''حذاقت'' پر منحصر ہے۔

''زرد پتوں کا شجر'' پڑھیے۔ یہ میری بہترین تحریروں میں سے ایک بہترین کاوش ہے۔ امید ہے کہ آپ پسند فرمائیں گے۔

دعا گو

نایاب جیلانی

برسات کے موسم ہمیشہ یادوں کے نخلستان میں لے جاتے ہیں۔ اچھی اور بری یادیں' تلخ اور شیریں یادیں۔ روشانے خان بھی یادوں کے طویل سفر پر رواں دواں تھی۔

وہ اس وقت پچھلے برآمدے میں کھڑی رم جھم برستی بارش کا نظارہ کر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دھلے دھلائے درختوں اور جھومتے سرخ گلاب کے پودوں کو دیکھ رہی تھیں۔ دائیں طرف کبھی زنان خانے کے باتھ روم ہوا کرتے تھے۔ سیلن زدہ دیواروں والے' جن کی ٹوٹی چھت میں چوہوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔ اکھڑے پلستر والے فرش پر جگہ جگہ پانی ٹھہر جاتا تھا۔ زنان خانے کے ان باتھ رومز میں غسل کرتے ہوئے ابکائی آنے لگتی تھی' لیکن اب ان کا نام و نشان نہیں تھا۔ بہت سال پہلے انہیں گرا دیا گیا تھا۔ پھر اس اونچی نیچی زمین کو برابر کر دیا گیا۔ یہاں پر اس وقت بہت بڑا چڑیا گھر بنا دیا گیا تھا۔ ہر طرح کے جانور چہل قدمی کرتے ہوئے موسم انجوائے کر رہے تھے۔ یہ چڑیا گھر اس کی چھوٹی دونوں بیٹیوں ماہی اور ماہ نور کے شوق کی وجہ سے ان کے بابا نے بنوا کر دیا تھا۔ اس سے آگے وسیع و عریض لان تھا۔ کبھی یہاں کچا صحن ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے آم اور کیکر کے درخت سایہ فگن تھے۔ آج لش گرین گھاس سے پورا لان سجا سجا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اعلیٰ قسم کے پھولوں کے جھومتے پودے بہار دکھا رہے تھے۔

لان میں ماہی اور ماہ نور کے لئے جھولے بھی لگوائے گئے تھے۔ پورچ میں ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس کے ایک طرف ماہی اور ماہ نور کی سائیکلیں بھی کھڑی تھیں۔ ایک ہی رنگ کی یہ دو سائیکل زخام لے کر آیا تھا۔ یہ دونوں پچھلے صحن میں اپنے سائیکلنگ کے شوق کو پورا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے بابا موڈ میں ہوتے تو دونوں بچیوں کو فارم ہاؤس لے جاتے۔

کون کہتا ہے وقت بدل نہیں سکتا۔ وقت بدل سکتا ہے۔ سوچ میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے صرف ایک چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ لگن اور صبر کی۔

تیرہ سال بعد وہ ایک خوشنما جزیرے پر قدم رکھ چکی تھی۔

✦✻✦

بیکن ہاؤس میں سمر ویکیشنز کا اعلان ہوتے ہی ہاسٹلز کے رومز میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ سب کی خواہش تھی کہ ہاسٹل سے نکلنے والی وہ ہی پہلی لڑکی ہو۔

روشانے ازبک نے جگر جگر کرتی آنکھوں سے اس دل افروز منظر کو دیکھا اور کامن روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہ رات کو ہی پیکنگ کر چکی تھی۔ اس وقت اسے صرف ایک فون کرنا تھا۔ گھوڑا گلی کے ایک سکول میں اس کی ایک سال چھوٹی بہن شانزے زیر تعلیم تھی۔ اس نے مس ڈائنا سے پرمیشن لے کر شانزے کو فون کیا۔ شانزے بھی ''ازبک ہاؤس'' جانے کے لیے بے تاب تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے پاپا احمد خان ازبک کا ڈرائیور لمبی سی چمکتی گاڑی میں اسے لینے کے لیے آ گیا۔ ازبک ہاؤس میں پہنچ کر آزادی اور خوشی کے احساس نے روشانے کو فریش کر دیا تھا۔ وہ اسی سرشاری کے عالم میں گول زینہ عبور کر کے سیکنڈ فلور پر اپنے اور شانزے کے مشترکہ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا سجا سجایا قیمتی ڈیکوریشنز سے سجا اور جگمگاتی روشنیوں میں نہایا روم بالکل ویسے ہی تھا۔ وہ کاٹن کا آرام دہ سوٹ پہن کر نیچے آ گئی۔

ماربل کے چکنے فرش پر اپنے ازلی بااعتماد باوقار انداز میں چلتی ہوئی لان کے پچھلے حصے کی طرف آ گئی۔ چار عدد خوب صورت مور گھاس پر ٹہل رہے تھے۔

تب ہی ڈرائیو وے پر ایک اور گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

روشی بھاگ کر شانزے تک پہنچی۔ شانزے نے خوب بھینچ بھینچ کر اسے پیار کیا تھا۔ وہ بھی بھیگی آنکھوں سے شانزے کی پیشانی چومنے لگی۔

''یہ بزرگانہ سٹائل کہاں سے سیکھا ہے؟''

شانزے نے حیرانی سے پوچھا۔ پاپا کو یہ مڈل کلاس کے محبت بھرے اظہار کہاں بھاتے تھے اور نئی می سے ایسا کچھ سوچنا بھی حماقت تھی۔ روشانے مسکرائی تھی' شانزے ہنسنے لگی۔

مائلہ می اپنی شادی کے دس سال بعد بھی ان کے لئے نئی می تھیں۔ می' پاپا کی سیکنڈ وائف تھیں۔ حسین' سٹائلش اور پاپا کی طرح ویل ایجوکیٹڈ۔ ان کی ماں بدصورت اور ان پڑھ تھیں' سو پاپا کا ملال نئی می کو پا کر بھی کم نہیں ہوا تھا۔ ان کی ماں نے بدقسمتی سے پاپا کے ساتھ صرف تین سال گزارے تھے۔ می کی وفات کے بعد مسز ڈیوڈ نے ان کی پرورش کی تھی۔ چار یا پانچ سال کی تھیں تب پاپا ان کے لئے نئی می لے آئے تھے۔ مائلہ کا ان کے ساتھ روایتی سوتیلی ماں کا سا سلوک نہیں تھا۔ وہ ان سے نہ محبت جتاتی تھیں' نہ نفرت۔ پاپا کی صرف وہ ہی دو اولادیں تھیں۔ مائلہ ہر سال انہیں مردہ بیٹے کا تحفہ دے کر انہیں خوب ناراض اور بے زار کر دیتی تھیں۔

اس کے پاپا بہت وجیہ آدمی تھے۔ اونچے لمبے' گورے چٹے' دولت کی فراوانی' خوشحالی کی وجہ سے ان کی صحت قابل رشک تھی۔

مائلہ اپنے دو بھائی جہیز میں لائی تھیں جو کہ روشی اور شانزے سے چھ' سات سال بڑے تھے۔ وہ دونوں

برلن کے کسی کالج میں زیر تعلیم تھے۔ کافی پڑھاکو اور ذہین لڑکے تھے۔ آتے جاتے حال احوال پوچھنے کے علاوہ سٹڈیز سے متعلق گفتگو بھی کر لی جاتی تھی۔ ولی اور صمیم کی آمد بھی قریب قریب تھی۔

شانز ے طویل سفر کی وجہ سے بہت تھکی ہوئی تھی۔ اس لیے کھانا کھا کر فوراً سو گئی' جبکہ روشی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔

وہ بہت مہم جو قسم کی لڑکی تھی۔ ہر وقت متحرک رہتی' جبکہ شانی اپنے آپ میں مگن رہنے والی تھی۔ وہ کھیل کود میں حصہ بھی نہیں لیتی تھی۔ البتہ روشی کو نت نئے گیمز میں دلچسپی تھی۔ وہ فٹ بال اور جمناسٹک کی شوقین تھی۔ سکول کی طرف سے ہونے والے سالانہ مقابلوں میں اس نے سائیکلنگ میں اول انعام حاصل کیا تھا۔

سکول کا پہلا دن پہلے دن کی دلہن کی طرح یادگار تھا۔ ہمیشہ زندہ رہنے والا۔ دونوں پُرجوش سی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ تب ہی مسز ڈیوڈ کی تاسف سے بھرپور آواز سنائی دی۔

''کاش بے بیز کی ماما ہوتیں۔''

''ماما......'' روشی کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ پہلی مرتبہ کچھ کھو دینے کا احساس روشی کی پلکوں کو بھگو گیا تھا۔

پھر ممی ان کی زندگی میں چلی آئیں۔ بے حد لبرل سی ممی نے نہ جانے کیسے ان کی خاندانی روایات کو تسلیم کر لیا تھا' شاید پاپا کی محبت میں۔ پاپا کی شخصیت میں کچھ ایسا سحر تو ضرور تھا' تب ہی تو ممی جیسی ماڈرن خاتون باہر نکلنے سے پہلے چادر اوڑھ لیا کرتی تھیں۔ پاپا کے حکم سے سرتابی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

ان کے از بک ہاؤس میں دنیا جہاں کی نعمتیں تھیں۔ انگریزی ناول' سٹوریز' اخبارات اور رسائل کی بہتات تھی۔ روشی اچھی کتابوں کی دیوانی تھی۔ سو اس کا سارا دن پاپا کی لائبریری میں گزرتا۔ پھر اچانک اک نیا واقعہ رونما ہوا۔ ممی ہسپتال گئیں اور ان کے لئے ایک اور بھائی لے آئیں۔ بہت خوب صورت گلابی گلابی سا یہ بچہ صرف چار دن زندہ رہا تھا۔ مسز ڈیوڈ نے بتایا یہ ان کا پانچواں بھائی تھا جو کم سنی میں ہی وفات پا گیا تھا۔ ممی رو رہی تھیں' شانی کو بھی رونا آ گیا۔

ان دنوں پاپا بہت جلال میں نظر آتے تھے اور ممی بہت چپ چپ تھیں۔ پھر غیر محسوس طریقے سے ممی ان کے قریب آتی چلی گئیں۔ اب وہ ان کے بیڈ روم میں اچھا خاصا وقت گزارنے لگی تھیں۔ ان کے ساتھ سکول کی باتیں کرتیں۔ اپنے بچپن کی شرارتیں بتاتیں' یہ کہ وہ بہت جینئس تھیں۔ بہت بولڈ تھیں۔ بالکل روشی کی طرح۔ روشی اپنی تعریف پر شرما گئی تھی۔

ممی اکثر انہیں اپنے ساتھ لے جاتیں' کبھی پردے والی گاڑی میں وہ ایبٹ آباد کی سڑکوں کو روندتے ہوئے دور دور تک نکل جاتیں۔ ایک دن ممی انہیں ریسٹورنٹ لے گئی تھیں۔ وہ تینوں فیملی کیبن میں بیٹھی تھیں۔ ممی نے آنے سے پہلے انہیں بھی چادریں اوڑھنے کے لیے دی تھیں۔ شانی حیران تھی کہ روشی نے بغیر احتجاج کیسے چادر اوڑھ کیسے لی ہے۔

ممی نے انہیں بہت سٹائلش کپڑے بھی لا کر دیئے تھے اور ان کی جینز شرٹ وارڈ روب سے غائب ہو گئی تھیں۔ روشی نے کچھ دیر سوگ منایا اور پھر خوشی خوشی ممی کے لائے ڈریسز زیب تن کر لیے۔ وہ زیادہ دیر صدمات کو اپنے اوپر طاری کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ پھر ایک صبح پاپا نے ناشتہ کرتے ہوئے ان دونوں کو بیک وقت مخاطب کیا تھا۔

''اب تم دونوں پردے والی گاڑی میں سکول جایا کرو گی اور دونوں چادر اوڑھا کرو گی۔'' شانی تو خاموش رہی تھی' البتہ روش بول پڑی۔

''ہم لوگ سندھی اجرک اوڑھ کر سکول جاتے ہیں بابا۔''

''گڈ گرل۔'' پاپا کے منہ سے تعریفی کلمات برآمد ہوئے۔ ''مجھے خوشی ہے کہ میری بیٹیاں ہر طرح کے ماحول اور وقت کے مطابق خود کو ہر جگہ ایڈجسٹ کر لیتی ہیں۔''

''تھینکس پاپا!'' ان دونوں کے لیے پاپا کے یہ الفاظ کسی اعزاز سے کم نہیں تھے۔ وہ کہاں کسی کی تعریف کرتے تھے۔

''روشی! اب تم بائیک لے کر باہر نہیں جایا کرو گی۔ سائیکلنگ بھی نہیں کیا کرو گی۔ اسکیٹنگ کے خیال کو بھی دل سے نکال دو۔ میں تمہارے اینملز گوٹھ بھجوا رہا ہوں۔ یہ گھر ہے کوئی Zoo نہیں۔ ویسے بھی تم اب بڑی ہو چکی ہو۔ یہ شوق بچپن کی حد تک ٹھیک تھے۔ ان ویکیشنز میں تم دونوں کی ٹریننگ شروع ہو جائے گی۔'' پاپا' روشی کے حواس اڑاتے ممی کی طرف متوجہ ہوئے۔

''مائلہ! تم انہیں اپنی زیر نگرانی کوکنگ سکھاؤ گی۔ سلائی کڑھائی بھی آنی چاہیے۔ ان کی ماں ہر فن میں طاق تھی۔ ہمارے خاندان کی عورتیں بہت سلیقہ مند ہوتی ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میری بیٹیاں بہت سمجھ دار ہیں۔ اچھی بیٹیاں اپنے بزرگوں کی دستار کا بھرم رکھتی ہیں۔''

''او کے پاپا!'' روشی جو احتجاج کرنا چاہتی تھی' ایک دم لب بھینچے' خاموش ہو گئی۔

ان کا تعلق ازبک قبیلے سے تھا۔ ان ہی رسم و رواج کی وجہ سے روشی کو اپنی بہت سی خواہشات کا گلا گھونٹنا پڑا تھا۔ گوٹھ میں دادا تھے' دادی تھیں۔ دادا کے کئی بھائی تھے۔ ان کی بیویاں اور بچے' پاپا شہر میں رہتے تھے' اس لیے وہ شہر کے بہترین انگریزی سکول میں پڑھ رہی تھیں۔ دادی کو تو فرنگن عورت کا پوتیوں کو نہلانا دھلانا پسند نہیں تھا' بلکہ انہیں تو روشی اور شانی کا فر فر انگریزی بولنا بھی کھٹکتا تھا۔ جینز شرٹ سے بھی انہیں چڑ تھی۔ روشی انگریزی' چائنیز اور اٹالین کھانوں کی شوقین تھی اور دادی کو اس کے کھانے پینے پر بھی اعتراض رہتا تھا۔

جانوروں سے روشی کو بے انتہا محبت تھی۔ ان کے جانے کے بعد وہ کئی دن بولائی بولائی سی پھرتی رہی تھی۔ اس کی افسردگی کو محسوس کر کے شانی نے کہا۔

''روشی! تم اچھی طرح رو کر دل کا غبار ہلکا کر لو۔ میں جانتی ہوں تمہیں جانوروں کے گوٹھ چلے جانے کا

بہت دکھ ہے۔"

"میں کیوں روؤں۔ بزدل روتے ہیں شانی ڈارلنگ! میں تو سٹون گرل ہوں' بہت بہادر اور دلیر۔"

وہ ایک دم ہنسنے لگی تھی۔ اس کی بہت ساری عادتیں پاپا جیسی تھیں۔ بہادر' نڈر اور کسی بھی مشکل میں نہ گھبرانے والے۔

✦❋✦

بیکن ہاؤس میں ان کا آخری سال تھا۔ ان ویکیشنز کے بعد انہیں صرف ایک مرتبہ سکول جانا تھا' صرف اور صرف فائنل ایگزامز کے لیے۔

ان ہی دنوں دادا' دادی ازبک ہاؤس چلے آئے۔ وہ ہری پور سے آ رہے تھے۔ دادی کی زبانی پتا چلا تھا کہ ہری پور سے ایک سو پچھتر میل دور روشی اور شانی کا ننھیالی گاؤں ہے۔ اس کے نانا' دادا کے سگے بھائی تھے۔ وہ اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ ان کے مرنے کے بعد اس کے آخری نمبر والے ماموں قبیلے کے سردار بنے تھے۔ اورنگ زیب میر سے بڑے اس کے پانچوں ماموں وفات پا چکے تھے اور آج دادا نے بتایا تھا کہ وہ ہری پور اس لیے گئے تھے کہ اورنگ زیب میر نے اپنے سب سے بڑے ولی عہد کے سر پر دستار رکھ کر اسے علاقے اور قبیلے کا سردار بنا دیا ہے اور اس ضمن میں وہاں ایک ضیافت کا انتظام تھا۔ دادا بتا رہے تھے اورنگزیب میر بہت دولت مند ہیں۔ ان کی بہت سی جاگیریں اور جائیدادیں تھیں۔ اورنگ زیب حیات میر کے اس عمل کو دادا بہت سراہ رہے تھے۔

دادا ایک ہفتہ رہ کر چلے گئے تھے۔ ان دنوں دادی' ممی سے کافی کھنچی کھنچی سی تھیں۔ صرف ایک ماہ بعد دادا اور دادی ایک دفعہ پھر آ گئے تھے۔ اس دفعہ وہ اکیلے نہیں تھے' بلکہ پوری برادری ان کے ساتھ تھی۔ یکا یک پورچ میں کئی گاڑیاں آ کر کھڑی ہونے لگیں۔ پجارو' جیپ' پراڈو' دادا کی لینڈ کروزر' ہر رنگ کی قیمتی چمکتی دمکتی گاڑیاں۔ ان گاڑیوں میں سے اجلے سفید رنگ کے اونچے شملے والے ادھیڑ عمر آدمی نکلے۔ کئی عورتیں بھی تھیں۔ پہاڑی لباس پہنے' سر سے لے کر پیروں تک سیاہ چادر میں لپٹی۔ لان میں لگے جھولوں کی طرف بھاگتے دوڑتے' اچھلتے کودتے بچے بھی تھے۔

کچھ حیران اور کچھ پریشان دکھائی دیتے پاپا بھی بریف کیس تھامے آ گئے تھے۔ یقیناً دادا نے فون کر کے انہیں بلوایا تھا۔ شانی اسے کھینچ کر گلاس ونڈو کی طرف لے آئی تھی۔ اب وہ دونوں بہت حیرانی کے عالم میں نیچے جھانک رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد سب لوگ اندر چلے گئے تھے۔ مسز ڈیوڈ نے کہا۔

"تم دونوں کو نیچے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لنچ تمہیں بیڈ روم میں ملے گا۔"

"کیوں آنٹی؟" شانی خاموش تھی' مگر روشی خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

"نو کوئسچن۔" مسز ڈیوڈ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''پھر بھی آنٹی! کچھ تو بتایئے۔'' روشی کا تجسس اپنے عروج پر تھا' مگر انہیں کچھ بھی بتایا نہیں گیا۔ چند گھنٹوں بعد گاڑیوں کے دروازے کھولنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ گاڑیاں سٹارٹ ہوئیں' چوکیدار نے گیٹ وا کر دیا تھا۔

روشی نے پردے برابر کیے اور پھر اپنے بیڈ پر آ کر ڈھے گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی شانی کی طرح گہری نیند سو رہی تھی۔

رات ڈنر کے لیے انہیں نیچے بلوایا گیا تھا۔ وہ فریش ہو کر نیچے آئیں تو ڈائننگ روم میں ایک اور چہرے کا اضافہ ہو چکا تھا۔

''یہ گل بخت ہے۔'' ان دونوں کے چہروں پر بڑے بڑے سوالات مائلہ نے پڑھ لیے تھے۔

''کون گل بخت؟'' روشی نے حیرانی سے پوچھا۔ شانی ہمیشہ کی طرح خاموش تھی۔

''تمہاری ماں کی چچا زاد اور تمہارے پاپا کی خالہ زاد گل بخت ہے۔'' یہ تعارف کچھ الجھا الجھا سا تھا۔

''ہیلو گل بخت!'' اس نے اور شانی نے اپنا اپنا ہاتھ گل بخت کی طرف بڑھایا۔ پہاڑی گھیر دار سرخ ریشمی لباس زیب تن کیے ہلکے پھلکے سونے کے زیورات پہنے وہ بے حد گوری سی لڑکی روشانے کی ہم عمر تھی۔ پندرہ سالہ گل بخت نے شرمائے شرمائے انداز میں ان سے ہاتھ ملایا۔

''گل بخت نہیں' ممی بولو۔ یہ تم دونوں کی نئی ممی ہے۔'' مائلہ نے پورے اطمینان سے انہیں بے اطمینان کر دیا۔

''آپ کیا کہہ رہی ہیں ممی؟'' روشی لرز اٹھی۔ وہ پہلے کی طرح پرسکون تھیں۔

''تو کیا انہیں پاپا کی ایک اور شادی کا افسوس نہیں ہوا؟'' روشی نے حیرانی سے سوچا۔

''ممی! آپ کو دکھ نہیں ہوا' آپ نے پاپا کو روکا نہیں۔''

''بہت سے معاملوں میں ہم لوگ بے اختیار ہیں' تمہارے دادا کا یہ فیصلہ احمد کو بھی پسند نہیں تھا' مگر تمہارے پاپا کو ایک اور شادی پر اعتراض نہیں تھا کہ ایک وارث کی خواہش ان جاگیرداروں کو مضطرب رکھتی ہے ہمیشہ۔ انہیں اعتراض گل بخت سے شادی پر تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ ان پڑھ ہے۔'' مائلہ نے انگریزی میں اپنی بات مکمل کی تھی۔

ان دونوں نے بے دلی سے کھانا کھایا۔ پھر اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں۔

شانی کو دادا' دادی کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ گل بخت سے پاپا اتنے بڑے تھے ان کے خاندان میں بے جوڑ شادیوں کا ازل سے رواج تھا۔

ممی اور گل بخت کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ ممی جیسی حسین اور پڑھی لکھی فرفر انگریزی بولنے والی خوب صورت رنگ رنگ کی ساڑھیوں میں ملبوس عورت کا گل بخت سے مقابلہ ہو بھی کیسے سکتا تھا' مگر گل بخت نے ان دو

سالوں میں اس تیزی سے میم کی طرح رنگ ڈھنگ اپنائے تھے کہ ہاسٹل سے آکر روشی اور شانی حیران ہی تو رہ گئیں۔ مائلہ ان دنوں ملک سے باہر تھیں۔

ان کی ملاقات رات کے کھانے پر گل بخت سے ہوئی تھی۔ وہ اس وقت جدید انداز کے کاٹن کے سوٹ میں ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ان دو سالوں میں اس نے پاپا کے دو بیٹوں کو جنم دے کر ازبک ہاؤس میں اپنی حیثیت کو منوا لیا تھا۔ دادی تو ویسے بھی ہر وقت بھانجی کے واری صدقے جاتی تھیں۔ دولڑکوں کی ماں بن کر یہ پہاڑی لڑکی پورے ازبک ہاؤس کی حکمران دکھائی دینے لگی تھی۔ احمد صاحب ان دنوں ملک سے باہر گئے تھے۔

واپس آئے تو ان کے ساتھ دو فلپائنی عورتیں تھیں۔ اثمر اور اشنان کے لیے علیحدہ علیحدہ گورنس آئی تھیں۔ ان کے بیڈ رومز بھی بہت خوب صورت تھے۔ رنگا رنگ کھلونوں' جھولوں اور دیدہ زیب چیزوں سے بھرے ہوئے۔ پاپا' اثمر اور اشنان کے لیے بہت ساری چیزیں لائے تھے۔ ان دونوں کے لیے بھی خوب صورت تحائف اور پرفیوم تھے۔ روشی خوشبوؤں کی دیوانی تھی۔

گل بخت کے لیے انہوں نے علیحدہ سے کافی شاپنگ کی تھی۔ اسی لیے وہ ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔

✦❋✦

ولی اور صمیم واپس آ چکے تھے۔ ان کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور دونوں ہی کسی غیر ملکی فرم سے منسلک ہو چکے تھے۔ اب وہ دونوں علیحدہ فلیٹ میں رہتے تھے۔ روشی لان میں ٹہل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سفر نامہ تھا۔ ''مشرق کا سوئٹزرلینڈ سوات'' اس نے یہ سفرنامہ کئی مرتبہ پڑھا تھا۔ وہ اس قفس میں قید تھی۔ اسے ''ازبک ہاؤس'' اور بیکن ہاؤس کے علاوہ کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

بقول دادی کے' وہ دونوں بڑی ہو چکی ہیں۔ ان دونوں کو سکول سے اٹھا لینا چاہیے۔ مگر پاپا نے دادی کی اس خواہش کو پورا نہیں کیا تھا۔

وہ دونوں اب اے لیول کر رہی تھیں۔

گل بخت کے چھ عدد بہن بھائی پورے گھر میں غل غپاڑہ مچائے رکھتے تھے۔

شانی پہروں کڑھا کرتی۔ پھر زبردستی روشی کی توجہ بھی اس مسئلے کی طرف مبذول کرواتی۔ روشی خود بھی حیران تھی۔ ممی کے دو بھائی بھی تو تھے مگر وہ ایسے نہیں تھے۔ بہت سلجھے ہوئے' شائستہ مزاج کے ذہین لڑکے تھے۔ خصوصاً ولی میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہ بہت نفیس مزاج کا تھا۔ اس کا دھیمے پُراثر لہجے میں بولنا روشی کو بہت پسند تھا۔ اس کی شائستگی' اس کی ذہانت اور شخصیت کا سحر روشی کو بہت اپنا اپنا لگ رہا تھا۔

''ایں ...... یہ میں ولی کو کیوں سوچ رہی ہوں؟'' روشی نے حیرانی سے خود کلامی کی۔

''روشی ...... روشی!'' شانی آوازیں دے رہی تھی۔

روشی جلدی سے کتاب اٹھائے اندر کی طرف بھاگی۔
''یہ لو بات کرو۔'' شانی نے اس کے ہاتھ میں ریسیور تھمایا۔
''کس کا فون ہے؟'' اس نے اشارے سے پوچھا۔
''ممی کا۔'' شانی میگزین اٹھا کر صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ دونوں ہی ممی کو بہت مس کرتی تھیں۔
''ممی! آپ کب آئیں گی؟'' وہ تیسری مرتبہ پھر پوچھ رہی تھی۔
''کچھ دنوں تک۔'' ممی کچھ الجھی الجھی سی تھیں۔
''ممی! ہم دونوں آپ کو بہت مس کر رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں محبت تھی' احترام تھا۔
''میں جلد آؤں گی۔'' ممی نے اس کی ڈھارس بندھائی۔
''تم دونوں اپنا خیال رکھنا' دیکھو گل بخت سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔'' ممی تاکید کر رہی تھیں۔ انہیں دور بیٹھ کر بھی ان کا خیال تھا۔
''پاپا کب آتے ہیں؟''
ممی! پاپا کسی کے لیے بھی اپنی روٹین چینج نہیں کر سکتے۔'' روشی نے ممی کو تسلی دی تھی۔ دوسری طرف ممی شاید جھینپ گئی تھیں۔
تب ہی گل بخت اشنان کو اٹھائے چلی آئی۔
''تمہارے پاپا کا فون آنے والا ہے۔ فون رکھو' انہوں نے ضروری بات کرنی ہے۔''
''اونہہ......'' روشی ریسیور کریڈل پر پٹخ کر دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔
شام کو اشنان کو لے کر شانی کالونی کی سڑکوں پر نکل گئی۔ روشی نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ خرگوش کے خالی پنجرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس پنجرے میں اب اثمر کے آسٹریلین طوطے چہک رہے تھے۔ کچھ دور گل بخت کی بکری کے بہت خوب صورت سفید بچے گھاس پر منہ مار رہے تھے۔ یہ بچے گل بخت اشنان کی پیدائش کے بعد گوٹھ سے لائی تھی۔ اسے اپنی اس بکری کے بچوں سے بہت پیار تھا۔ احمد صاحب نے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ نہ جانے کیوں روشی کا دل اداس سا ہو گیا۔
''پاپا نے مجھ سے کہا تھا یہ گھر ہے' زو نہیں اور اب پاپا کو اس گھر میں موجود زو نظر نہیں آتا۔''
''پگلی......'' گل بخت نہ جانے کس کونے سے برآمد ہوئی تھی۔ ''ایسے نخرے' لاڈ صرف شوہر اٹھا سکتے ہیں۔ ادھر گوٹھ میں اماں ہر وقت مجھے کوستی رہتی تھی۔ لاڈو (بکری کا بچہ) کے پاس جانے نہیں دیتی تھی۔ میں نے اماں کے بٹوے سے پیسے لے کر مرغی کے بچے خرید لیے تو اماں نے ڈنڈے کے ساتھ میری دھنائی کی۔ وہاں اچار کے ساتھ سوکھی روٹی ملتی۔ اماں نے بکری کا بچہ چوری بیچ دیا۔ ان دنوں ابا پر قرض چڑھا تھا

مجھے معلوم ہوا تو تین دن روتی رہی تھی۔ ایسا تاپ چڑھا کہ آٹھ دن بستر پر پڑی رہی۔ ہم اچھے کپڑے اور اچھے کھانے کے لیے ترستے تھے۔ خالہ (روشی کی دادی) مہینے بعد آتی تھیں۔ فروٹ، کپڑے اور راشن لے کر۔ سچ کہوں، یہاں میری ساری خواہشات پوری ہوگئی ہیں۔ تم بھی اس وقت کا انتظار کرو جب تم دلہن بنو گی۔"

لفظ دلہن کس قدر اچھوتا اور پیارا سا احساس تھا۔ اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں کوئی شادی اٹینڈ نہیں کی تھی۔ اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ اسے سوچنے کے لیے وقت ہی کہاں ملتا تھا۔ وہ سفرنامے پڑھتی تھی، کوکنگ کرتی تھی۔ سلائی کرتی تھی۔ کورس کی کتابیں پڑھتی تھی۔ چھوٹے بھائیوں کو نئے گیمز سکھاتی۔ سائیکلنگ کرواتی۔ سٹوریز سناتی۔ مزے مزے کی ڈشز بنا کر کھلاتی۔ گل بخت حیران ہو کر روشی کو دیکھتی رہتی کہ اتنا کچھ بنانا آتا ہے۔ گل بخت کبھی کبھی حیرت سے اسے دیکھتی اور کہتی۔

"کاش! میں تمہارے جیسی بااعتماد اور بولڈ ہوتی۔ فرفر انگریزی بولتی، انگریزی کھانے بناتی۔ میرے ہاتھ میں بھی تمہارے جیسا ذائقہ ہوتا۔ پھر تمہارے پاپا میری تعریف کرتے۔ میری کوکنگ کو سراہتے۔ پھر انہیں مائلہ آپا کی یاد کم آتی۔"

"بے چاری شوہر پرست عورت۔ اس کی صرف اتنی محدود سی خواہش ہے۔" روشی حیرانی سے سوچتی۔ اس وقت اسے یہ اندازہ نہیں تھا یہ محدود خواہش نہیں تھی۔ دراصل اسی ایک خواہش کے ساتھ عورت کی پوری زندگی جڑی ہوتی ہے۔

✦❋✦

"روشی!" کسی نے بہت نرمی سے اسے پکارا تھا۔ وہ جو "دریچہ شب" کو پڑھتے پڑھتے اونگنے لگی تھی، ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"ولی بھائی! آپ! آپ کب آئے ہیں؟"

"تئیس سال پہلے۔" ولی اطمینان سے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ رہا تھا۔

"ازبک ہاؤس کب آئے ہیں؟"

"ابھی ابھی، تم کیوں کھڑی ہو، بیٹھ جاؤ۔" ولی نے نرمی سے کہا۔

"آپ کے کہنے پر نہیں، اپنی مرضی سے بیٹھ رہی ہوں۔" اسے اپنی ناک بڑی عزیز تھی۔ ولی ہنس دیا۔

"بالکل نہیں بدلیں، ویسی ہی ہو، جیسی میں چھوڑ کر گیا تھا۔"

وہ روشانے کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔

اس کے ریشمی سیاہ بال، کالی رات کی مانند نم سی آنکھیں، جن میں ذہانت جگمگا رہی تھی۔ اوس میں بھیگی نوکیلی مڑی ہوئی لانبی پلکیں۔ وہ تو سراپا گلاب تھی۔

روشی بہت چھوٹی تھی، جب وہ وسیع وعریض محل نما "ازبک ہاؤس" میں آیا تھا۔ وہ اسے بہت پیاری لگی

تھی۔ بہت اپنی اپنی سی۔ مگر دل کے ہزار چاہنے کے باوجود وہ روشی کے قریب نہیں ہو سکا تھا اور وہ اپنی دنیا میں گم رہتی تھی۔ وہ پاپ کارن اور چپس کھانے کی شوقین تھی۔ ولی ڈھیروں ڈھیر پاپ کارن کے لفافے لا کر کیبنٹ میں رکھ دیتا تھا۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا خیال رکھنے لگا تھا۔

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں ولی بھائی!''

''آں...... ہاں......'' ولی چونکا۔

''آپا کا کوئی فون آیا ہے؟'' وہ مائلہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''تقریباً روز ہی بات ہوتی ہے۔''

قیس ٹرالی گھسیٹتا آ گیا تھا۔ ولی نے اس کی بیمار ماں کی طبیعت کا پوچھا۔ وہ ایسا ہی تھا' بہت حساس اور نرم مزاج' اسی پل اثمر نے سٹنگ روم میں جھانکا۔

''آپی! مجھے فلیگ بنا کر دو۔'' اس کے ہاتھ میں ڈرائنگ بک تھی۔

''ہائے اثمر! آپ تو اتنے بڑے ہو گئے ہو۔'' ولی نے اثمر سے ہاتھ ملایا۔ روشانے کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ اپنی بہن کی سوکن کے بیٹے کو کس والہانہ انداز میں پیار کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی حیرت ولی سے چھپی نہیں رہ سکی۔ تبھی تو وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''بچے تو بچے ہوتے ہیں' معصوم انجان۔'' اس نے اثمر کے گال پر پیار کیا۔

وہ گل بخت سے بھی ملا تھا۔ پھر لنچ کیے بغیر چلا گیا۔ حالانکہ گل بخت نے ولی کو بہت روکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد شانی افسردہ ہو گئی۔ روشی کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر ''گردش میں پاؤں'' اور ''سورج کے ساتھ ساتھ'' میں گم ہو چکی تھی۔

✦❋✦

ان ہی دنوں مائلہ واپس چلی آئیں۔ ممی پہلے سے زیادہ سمارٹ ہو چکی تھیں۔ وہ پہلے بھی زیادہ نہیں بولتی تھیں۔ اب تو بالکل خاموش ہو چکی تھیں۔ زیادہ تر اپنے بیڈروم میں رہتیں۔

''ازبک ہاؤس'' میں تو گل بخت چہکتی تھی۔ اس نے اب پہاڑی لباس پہننا ترک کر دیا تھا۔ وہ ریشمی، نفیس، شیفون کی ساڑھیاں پہنتی تھی۔ بوتیک سے سٹائلش سوٹ منگواتی، ٹی وی دیکھ دیکھ کر اسے میک اپ کرنے کا سلیقہ بھی آ گیا تھا۔

ان ہی دنوں ایک بار پھر گھر میں کچھ غیر معمولی سی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ دادی کی آمد کے ساتھ کچھ نہ کچھ نیا اور انوکھا ضرور ہی ہوتا تھا۔

اب بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ شانی رو رہی تھی۔ اس کے مسلسل آنسوؤں نے روشی کو چڑا دیا۔

''کیا ہوا ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟'' روشی نے کوئی بیسویں مرتبہ پوچھا۔

''ممی جا رہی ہیں۔'' اس نے سوں سوں کرتے ہوئے بتایا۔

''کہاں ......؟'' روشی اچھل پڑی۔ ''ابھی دو ہفتے پہلے تو وہ آئی ہیں۔'' اس کی حیرت بجا تھی۔

''واپس برلن۔'' شانی نے ناک رگڑی۔

''مگر کیوں ......؟''

''پاپا نے دادی کے مجبور کرنے پر یہ گھر اثمر اور اشنان کے نام کر دیا ہے۔ ممی کو اس بات کا غصہ ہے۔ ان کی حیثیت کو چیلنج کیا گیا ہے اور وہ اب ''ازبک ہاؤس'' میں رہنا نہیں چاہتیں۔''

''اور پاپا کیا کہتے ہیں؟''

''انہوں نے ممی کا غصہ کم کرنے کے لیے ایک گھر خرید کر ممی کے نام کیا ہے، مگر وہ ''ازبک ہاؤس'' تو نہیں ہے نا۔'' شانی رنجیدگی سے بولی۔

''اب کیا ہو گا شانی!'' روشی بھی گھبرا گئی۔ ممی سے وہ دونوں ہی اٹیچ تھیں۔ دوسرے دن اس نے ممی کو دیکھا۔ انہوں نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا اور ان کی آنکھیں سوجی سوجی تھیں۔ دادی نے سنا تو پھر سے طوفان کھڑا کر دیا۔ مگر ممی نے کچھ اور ہی طے کر رکھا تھا۔ انہوں نے کورٹ کے ذریعے احمد صاحب سے خلع لے لیا اور ان

دونوں کو بلکتا چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔
ممی کے جانے سے نہ روشی خوش تھی' نہ شانی۔ حتیٰ کہ گل بخت بھی چپ چپ تھی۔ فقط دادی خوش تھیں۔ گل بخت جسے وہ دونوں دادی کے ہزار مرتبہ ٹوکنے پہ "ام بی بی" کہنے لگی تھیں' دادی کا دایاں بازو تھی۔ دادی کی خدمتیں کرنے کے علاوہ بھی وہ دادی کی پسندیدہ ہستی تھی۔
گل بخت نے ہی انہیں ایک دن بتایا تھا کہ دادی' روشی کی مما یعنی دادا کی بھتیجی سے احمد صاحب کی شادی کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔ مگر دادا کی ضد اور فیصلے سے ٹکرانا کہاں آسان تھا۔ دادی نے ان کی ماں پر زندگی کے دروازے تنگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ رات دن جانوروں کی طرح ان سے کام لیا جاتا تھا۔ وہ کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی تھیں۔ پاپا شہر میں رہتے تھے۔ شاید اسی لیے وہ جلد ہی زندگی سے بے زار ہو کر ابدی نیند سو گئی تھیں۔ احمد صاحب کا رویہ ان کے ساتھ نارمل تھا۔ مگر وہ کم کم ہی گوٹھ جاتے تھے۔

✦❋✦

ممی نے برلن جا کر ان سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں لاشعوری طور پر ان کی کال کی منتظر تھیں۔ پھر ایک دن ولی "ازبک ہاؤس" چلا آیا۔ اس کے ساتھ صمیم بھی تھا۔ صمیم بھی ولی کی طرح بہت سجیلا تھا۔ دونوں بھائی ایک ہی فیلڈ سے وابستہ تھے۔
"ممی نے محض اینٹوں کے اس مکان کی خاطر اپنی دس سالہ ازدواجی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔"
"آپا کی سوچ ہمیشہ سے خود غرضانہ تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے لیے سوچتی ہیں۔" صمیم نے کہا تو روشی کو بہت برا لگا۔
"نہیں' ممی ایسی نہیں تھیں۔"
"اب وہ تمہاری ممی نہیں کسی اور کی مسز بن چکی ہیں۔" صامی کے لہجے میں تلخی تھی۔ ولی نے سر جھکا لیا تھا۔
"ممی نے کس سے شادی کی ہے؟" روشی کے اٹھنے کے بعد شانی نے پوچھا۔
"کسی پاکستانی پروفیسر کے ساتھ۔" یہ جواب صمیم کی طرف سے آیا تھا۔
"ممی نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ وہ کب تک تنہا رہ سکتی تھیں۔" شانی نے افسردگی سے کہا۔ اسی پل روشی ٹرالی گھسیٹتی آ گئی۔ لوازمات سے بھری ٹرالی دیکھ کر صمیم نے خوش گوار لہجے میں کہا۔
"آج میں نے لنچ بھی نہیں کیا۔ سارا دن سائٹ پر گزر گیا تھا۔ اس ظالم انسان نے کچھ کھانے نہیں دیا۔"
"میرے حصے کے بھی تین سینڈوچ ہضم کیے ہیں اس نے۔" ولی نے جل کر اسے دیکھا۔
"تو آپ صمیم بھائی کو لنچ کروا دیتے۔" شانی نے ہمدردی جتائی۔ "یہ کنجوس اپنی جیب میں سے کھوٹا پیسہ

بھی خرچ نہیں کرتا۔'' صمیم نے مظلوم شکل بنالی۔
''تو تم نے ہی حاتم طائی کو خوش کر دینا تھا سخاوت کر کے کہ ان کی گدی سنبھالے ایک ''سخی'' اب تک موجود ہے۔'' ولی نے تلملا کر کہا۔
''میں نے گدی تمہارے لیے رکھ چھوڑی ہے۔'' صمیم چکن رول سے انصاف کرتے ہوئے بولا۔
ولی نے بھی حساب برابر کر کے ہاتھ جھاڑے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کی نوک جھوک روشی اور شانی کے لبوں پر مسکان لے آئی تھی۔

✦❋✦

شانی کو موسمی بخار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ان دنوں گل بخت گوٹھ گئی ہوئی تھی۔ گھر میں روشی اور شانی تھیں یا پھر نوکروں کی فوج۔ دوپہر تک شانی کا بخار کم نہ ہوا تو روشی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے لگی؟
بخار کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ شانی پر غشی طاری ہونے لگی تو اس نے پاپا کو فون کیا۔ پاپا میٹنگ میں مصروف تھے۔ ان کی سیکرٹری نے کہا کہ وہ گاڑی مع ڈرائیور کے بھیجتی ہیں۔ کچھ دیر بعد گاڑی آ گئی تھی۔
ڈاکٹر اسجد بیگ نے شانی کا معائنہ کر کے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے تھے۔ شام تک رپورٹس مل گئی تھیں۔ شانی کو یرقان کی شکایت تھی۔ شانی کو بخار کا زور نہ ٹوٹنے کی وجہ سے ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ پاپا میٹنگ کے بعد کلینک چلے آئے تھے۔ انہیں اچانک بیرون ملک جانا پڑ گیا تھا اور ادھر شانی بھی ایڈمٹ تھی۔ پاپا کچھ دیر سوچتے رہے تھے' پھر انہوں نے فون کر کے کسی کو بلوایا تھا۔
کچھ دیر بعد ولی کو پاپا کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ ممی کے اس انتہائی ردعمل کے باوجود پاپا کا ولی سے ملنا ملانا اچنبھے کا باعث تھا۔
ولی انتہائی ذمے داری سے ڈاکٹرز روم اور میڈیکل سٹور کے چکر لگا رہا تھا۔ روشی نے ان پانچ' چھ گھنٹوں میں اس کی بہت سی خوبیوں کو محسوس کیا تھا۔
ولی اور روشی نے کھانا اکٹھے کھایا تھا۔ وہ روشی کو لحظہ بہ لحظہ حیران کر رہا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک اس کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ رکھ دیتا تھا۔ اس کے انداز میں کس قدر اپنائیت تھی۔
روشی ابھی کچھ سمجھنے نہ سمجھنے کے درمیان معلق تھی۔ جو خواب وہ دیکھتی تھی' ان کا پورا ہونا ممکن ہی نہیں تھا یا شاید پورے ہو جاتے' اگر وہ ازبک خاندان کی بیٹی نہ ہوتی۔ وہ احمد خان ازبک کی بیٹی نہ ہوتی۔
''روشی! کیا سوچ رہی ہو؟'' ولی نے بہت نرم لہجے میں پوچھا تھا۔
''آہاں۔'' وہ چونکی تھی' پھر ولی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر قدرے جھینپ گئی۔ ''میں سوچ رہی تھی کہ میں فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹرز کر سکوں گی۔''

''تو اس میں مشکل کیا ہے۔ تمہارے پاپا ہر طرح کی مہنگی تعلیم افورڈ کر سکتے ہیں۔'' ولی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے اس کے ہاتھ میں کوک تھما دی۔

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

صبح تک شانی کا بخار اتر گیا تھا۔ دس بجے تک وہ اسے گھر لے آئی تھی۔ گل بخت بھی آ چکی تھی اور اب شانی کو یرقان کے نقصانات کے متعلق بتا رہی تھی۔

''انگریزی دوائی کھانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں گوٹھ سے دوائی منگوا کر دوں گی۔ ہیبت خان بہت اچھا حکیم ہے۔''

گل بخت ہمدردی سے شانی کا سر دباتی رہی۔ پھر اس کے لیے اسی حکیم کا بنایا ہوا شربت لے آئی۔ شانی اس شربت کو پینا نہیں چاہتی تھی۔ روشی کا بھی یہ ہی خیال تھا' مگر گل بخت نے زبردستی شانی کو یہ شربت پلا دیا اور وہ جو بیماری کی وجہ سے پہلے ہی چڑچڑی سی ہو رہی تھی شربت پی کر منٹوں میں بھلی چنگی ہو گئی۔ نہ جانے اس شربت میں کیا جادو تھا کہ پھر شانی کو ڈاکٹر اسجد بیگ کے کلینک لے کر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ دونوں حیران تھیں اور گل بخت مسرور انہیں دیکھ رہی تھی۔

✦❋✦

ان دنوں ولی ایک بہت بڑے پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس کامیابی پر اسے مزید کئی پروجیکٹ ملنا تھے۔ یہ تمام تعمیراتی پروجیکٹ بیرون ملک کے تھے۔ سنڈے کو اس کی بیونس آئرس کی فلائٹ تھی۔ وہاں اسے تین اور ہوٹلز کا پروجیکٹ ملا تھا۔ سو یہ اس کے کیریئر کا بہترین پروجیکٹ تھا۔ روشانے خان کی ہمراہی اس کی اولین خواہشوں میں سے ایک تھی اور وہ اسے پانے کے لیے طویل ترین انتظار بھی کر سکتا تھا۔ ابھی رات کو ہی تو ولی نے شانی کی خیریت پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔ فون روشی نے اٹھایا تھا اور وہ اس سے بہت دلچسپی سے بیونس آئرس کے جانوروں کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ اس سے وعدہ لے رہی تھی کہ وہ روشی کے لیے اعلیٰ نسل کا خرگوش یا کتے لے کر آئے۔

ولی حیران تھا کہ روشی کو کپڑوں' جیولری کا شوق نہیں تھا۔ اسے شاپنگ پر جانا پسند نہیں تھا۔ نہ جانے کس رو میں ولی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ روشی میں تمہیں دنیا گھماؤں گا اور وہ حیران تھی' پریشان تھی۔

''ایسا کیسے ممکن ہے ولی بھائی!'' اس کے لہجے میں بلا کی معصومیت تھی۔

''باہر جانا مشکل نہیں۔ اگر تمہارے پاپا چاہیں تو تمہاری یہ چھوٹی سی خواہش پوری ہو سکتی ہے۔'' ولی نے اس کی آزردگی محسوس کر لی تھی۔

''ہماری بہت سی ایسی خواہشیں ہیں جو پوری نہیں ہو سکتیں۔ اسی لیے میں کسی بھی چیز کا ''غم'' نہیں کرتی۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' ولی اس کے بلند حوصلے کو ہمیشہ سراہتا تھا۔

اگلی شام وہ بیونس آئرس پہنچ گیا تھا۔ وہ جلد از جلد پاکستان میں روشانے کے شایان شان گھر بنانا چاہتا تھا۔اس کے لیے بہت زیادہ سرمائے کی ضرورت تھی۔ اسی لیے وہ رات دن کی پروا کیے بغیر کام کر رہا تھا۔

✦❋✦

یہ جرمنی کا شہر برلن تھا۔ وہ مائلہ آپا سے ملنا چاہتا تھا۔ ان کے اس شدید ردعمل کی ''وجہ'' جاننا چاہتا تھا۔ طلاق کا یہ انتہائی فیصلہ انہیں اس وقت کرنا چاہیے تھا جب احمد خان ازبک نے شادی کی تھی۔اب جبکہ ان کے دو بیٹے بھی ہو چکے تھے' یہ ڈیمانڈ کرنا کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ دیں' یہ سراسر حماقت ہی تو تھی۔

وہ مقررہ وقت کے مطابق ڈنر سے پہلے ان کے فلیٹ پہ پہنچ چکا تھا۔ مائلہ کے نئے ہزبینڈ سے ملاقات اتفاقاً نہیں ہوسکی تھی۔ وہ کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے تھے۔

رات کو فرصت سے ہو لینے پر مائلہ آپا سے گفتگو کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔مگر وہ بھی گویا جان چکی تھیں۔تب ہی پہلے ہی پیش بندی کے طور پر انہوں نے مصروف سے انداز میں کہا۔

''مجھے صبح کے لیے لیکچر تیار کرنا ہے۔تم بھی تھکے ہوئے ہو۔ابھی سو جاؤ' پھر بات کریں گے۔'' اب مزید بھلا وہ کیا بات کرتا۔

آپا کے سرد رویے کی وجہ سے جو تلخی ابھی فی الحال وہ محسوس کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کڑواہٹ کا اثر زائل ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر اک بھولے بھالے معصوم سے نوخیز چہرے کا عکس نمودار ہونے لگا تھا۔جس کی آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک تھی۔ وہ کسی دھلے ہوئے تروتازہ گلاب کی مانند تھی۔شگفتہ' دلفریب اور حسین۔ وہ ہر رنگ میں بہت پاکیزہ تھی۔ دلنشین اور معصوم۔

ولی خاقان نے یاسیت سے سوچا تھا کہ کیا احمد خان ازبک اپنی بیٹی کو ولی خاقان کے حوالے کر دیں گے؟ وہ جوان کی سابقہ بیوی کا بھائی ہے۔ جسے انہوں نے بہت چھوٹی عمر میں اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ کتنے احسان تھے احمد خان کے ان پر' مگر آپا نے خان کی کسی قربانی کی احسان کو یاد نہیں رکھا تھا۔

ان دونوں بھائیوں نے اچھی اور مہنگی ترین تعلیم احمد خان کی بدولت حاصل کی تھی۔ جب مائلہ نے اپنے پہلے شوہر سے طلاق لے لی تھی اور مالک مکان نے اپنا گھر خالی کروالیا تھا۔ ان دنوں رشتے دار بھی اپنے رنگ بدل چکے تھے۔تب احمد خان نے ہی انہیں سہارا دیا تھا۔

مائلہ' احمد خان کی سیکرٹری تھیں۔ پھر ایک دن انہوں نے گھر آکر بتایا تھا کہ وہ احمد خان سے شادی کر چکی ہیں۔صرف چند دن بعد وہ سب ''ازبک ہاؤس'' میں شفٹ ہو گئے تھے۔ جہاں ہر طرح کی آسائشات تھیں۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی' مگر اپنائیت نہیں تھی۔ آپا کے پاس ان کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ مائلہ نے اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ جوڑ لیا تھا۔

دس سال بعد آپا کی احمد خان سے علیحدگی کم از کم اس کا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔ ان ہی سوچوں میں گم وہ

نیند کی وادی میں اتر گیا تھا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ یونیورسٹی جا چکی تھیں۔ فریش ہونے کے بعد اس نے ناشتہ کیا۔ پھر اچانک ہی اس کے دل میں شدید خواہش ابھری کہ وہ روشانے سے بات کرے۔

اس کی انگلیاں ''ازبک ہاؤس'' کا نمبر ڈائل کرنے لگی تھیں۔ فون روشی نے ہی اٹھایا تھا۔

''ولی بھائی!'' روشی کی نیند ایک دم غائب ہوگئی تھی۔

''کیسے ہیں ولی بھائی؟ کب آئیں گے؟'' روشی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ابھی فی الحال تو بہت کام ہے۔'' وہ اسے اپنے کام کی تفصیل بتانے لگا تھا۔

''اچھا تو پھر آپ میرے لیے ہمنگ برڈ لے کر آیئے گا۔''

''ہمنگ برڈ؟ یہ کیا چیز ہے؟'' ولی حیران ہوا۔

''یہ چیز نہیں' پرندہ ہے۔ دنیا کا سب سے چھوٹا پرندہ۔'' روشی اب اسے پرندوں کی نسل کے بارے میں بتانے لگی تھی۔ شاید اسے ایک بہترین سامع کی ضرورت تھی' جو اس کی گفتگو کو بڑے شوق اور تحمل سے سنتا رہتا اور قطعاً بور نہ ہوتا۔

''یہ بہت خوب صورت پرندہ ہے۔'' (روشی کو سارے جانور خوب صورت ہی لگتے تھے۔ وہ غلیظ سا ڈینی بھی) ولی نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

روشی کہہ رہی تھی۔ ''یہ پرندہ ایک جگہ رُک کر پرواز کر سکتا ہے۔ پیچھے کی جانب بھی اڑ سکتا ہے۔ پرواز کے دوران اپنے پروں کو پھڑ پھڑاہٹ سے گنگنانے کی آواز پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' ولی چشم تصور سے روشی کے جگمگاتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

''کاش ولی بھائی! میں بھی ایک پرندہ ہوتی۔ جہاں مرضی پرواز کرتی۔'' وہ حسرت سے کہہ رہی تھی۔

''نہ ویزے کی بھاگ دوڑ کرنا پڑتی' نہ پاسپورٹ کے جھنجٹ میں وقت اور پیسہ برباد کیا جاتا۔ نہ سرحدوں پر چیکنگ جیسی جھنجھلاہٹ کا شکار ہونا پڑتا۔'' ولی نے اس کی رنجیدگی محسوس کر کے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اچھا یہ بتاؤ کالج کیسا جا رہا ہے؟''

''پھر وہ کافی دیر روشی سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کی طبیعت ایک دم فریش ہوگئی تھی۔

✦❋✦

''تم نے میرا پرس چھینا ہے۔'' وہ جو کوئی بھی تھی بہت تیزی سے اس سے ٹکرائی تھی۔ ولی نے مڑ کر اس لڑکی کی طرف دیکھا تھا' جو پھولی سانسوں سمیت چیخ رہی تھی۔

''کیا بکواس ہے؟'' ولی نے تنک کر غصیلے لہجے میں پوچھا۔ وہ ابھی ابھی بینک سے کرنسی چینج کروا کے باہر

نکلا تھا۔ جب یہ فضول انگریز لڑکی اس سے ٹکرا گئی تھی۔
''تم نے میرا پرس چھینا ہے۔'' وہ لڑکی ایک مرتبہ پھر چلائی۔
''بکومت۔'' ولی دھاڑا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ لڑکی صرف پیسے حاصل کرنے کے لیے ڈرامہ کر رہی ہے۔ یورپ میں ایسے ''فراڈ'' معمول کی بات تھی۔
''تمہارا والٹ اس وقت ''مارک'' سے بھرا ہوا ہے۔ کہاں سے لیے تم نے اتنے نوٹ۔ ابھی فوراً میری رقم لوٹا دو' ورنہ پولیس کو بلوا لوں گی۔'' وہ اس کام میں ماہر لگتی تھی۔ پولیس کی دھمکی تو ان لوگوں کی نوک زبان پر مچلتی رہتی تھی۔
''ہٹو' میرے راستے سے۔'' ولی نے ناگواری سے کہا۔
''میری رقم دو۔'' وہ بھی کوئی ڈھیٹوں کے خاندان سے تھی۔
''یہ ڈرامہ کسی اور کے سامنے کرنا۔ میں ان داؤ پیچ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کسی اور کو الو بناؤ۔'' ولی تلخی سے کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگا تھا۔ وہ لڑکی بھی بھاگتی ہوئی اس کے برابر چلنے لگی۔
''پلیز مجھے تھوڑے سے پیسے دے دو۔'' اب کے اس لڑکی کا لہجہ التجائیہ تھا۔ اس نے ''میری رقم'' کہنے کے بجائے بھکاریوں کے انداز میں منمنانا شروع کر دیا تھا۔
''میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ کسی اور کا راستہ روک لو۔'' ولی نے بے مرّوتی سے کہا۔
''مجھے کچھ رقم دے دو۔ میں نے دوا لینی ہے۔'' وہ منتوں پر اتر آئی تھی۔ ''میں بیمار ہوں اور صبح سے بھوکی بھی ہوں۔''
''بھاڑ میں جاؤ تم اور تم لوگوں کی ''بھوک'' مائی فٹ۔'' ولی نے سخت تنفر سے کہا۔
''تمہیں تمہارے اللہ کا واسطہ۔'' اب وہ گڑگڑا رہی تھی۔ ولی نے کچھ چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔ ولی نے پہلی مرتبہ اسے بغور دیکھا تھا۔ وہ لڑکی شاید حاملہ تھی۔
''پلیز! مجھے مارک دے دو۔ میں دودھ اور ڈبل روٹی خریدوں گی۔ میری ماں بھی بیمار ہے۔ اس کو شدید بھوک لگ رہی ہو گی۔'' وہ ایک مرتبہ پھر گڑگڑائی۔
اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آ رہے تھے۔ مجموعی طور پر وہ بہت خوب صورت نہیں تھی۔ اس کی رنگت بے انتہا سفید تھی۔ اس قدر سفید کہ دوسری مرتبہ دیکھ کر دل کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ آنکھیں نیلی تھیں یا سبز' ان میں موجود نمی' نیلم پر اوس کی مانند لگ رہی تھی۔ بالوں کا رنگ زردی مائل تھا۔ انڈے کی زردی جیسا' جو کہ بہت ہی برے لگ رہے تھے۔ وہ خوب صورت جسامت کی مالک نوعمر لڑکی تھی۔
وہ اس شدید سردی میں بغیر کسی گرم سویٹر کے ٹھٹھر رہی تھی۔ ولی نے دو پل میں ہی اس کی مالی حالت کا

اندازہ لگا لیا تھا۔ اس کے دل میں سامنے کھڑی اس لڑکی کے لیے ذرہ برابر ہمدردی نہیں تھی۔ وہ اک تلخ نگاہ اس پر اچھالتا آگے بڑھنے لگا تھا۔ جب وہ ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے آگئی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ دھیمی آواز میں بمشکل بولی۔

''میرا نام جیلینا ہے۔ سب مجھے جیلی کہتے ہیں۔ تم بھی جیلی کہہ سکتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لیے تیار ہوں۔ بس مجھے رقم کے متعلق بتا دو۔ کیا تم مجھے آج کے دن کا راشن خرید کر دے سکتے ہو۔''

''مائی گاڈ'' ولی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ حالانکہ یورپ میں جگہ جگہ سڑکوں پر کچھ وقت دینے والیاں مل جاتی تھیں۔

''تم ......'' ولی نے گویا دانت پیسے۔ ''کوئی کام وام کر لو۔ کسی کے گھر برتن دھو لو' کچرا اٹھا لیا کرو' کسی ہوٹل میں ڈش واشنگ کر لو۔'' وہ دھاڑا۔

''یہ آسان نہیں ہے۔'' جیلینا کے آنسو چھلک پڑے۔

''جہنم میں جاؤ تم!'' وہ غصے سے پھنکارا تھا۔ جیلی تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے برابر چلنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

''میں تمہارے برتن بھی دھو دوں گی۔ صفائی بھی کر دوں گی اور جو تم چاہو گے کروں گی۔ ابھی فی الحال کرسمس کی وجہ سے چھٹیاں ہیں۔ ان دنوں کام ملنا مشکل ہے۔''

''آؤ میرے ساتھ۔'' ولی نے چڑ کر قدم بڑھا دیئے تھے۔ بیونس آئرس میں اس کا کام ختم ہو چکا تھا۔ یہاں جرمنی میں اسے ایک اچھی کمپنی میں جاب کی آفر ہوئی تھی۔ سو وہ چند دن بعد یہاں شفٹ ہو گیا تھا۔ فی الحال وہ ایک کرائے کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ وہ یہاں کچھ سال کام کرنا چاہتا تھا۔ کم از کم اتنا سرمایہ اکٹھا کرنا چاہتا تھا کہ پاکستان میں ایک گھر اور ذاتی بزنس شروع کر سکے۔

''یہ ساری صفائی کر دو' برتن بھی دھو دینا۔ ویکیوم سامنے کیبنٹ میں موجود ہے۔'' ولی اسے ہدایات دے کر خود کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ وہ صرف ایک گھنٹے میں فارغ ہو چکی تھی اور اپنا معاوضہ چاہتی تھی۔ ولی نے کافی سارے نوٹ اسے تھما دیئے تھے اور کچن میں سے کھانے پینے کی چیزیں لینے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ جیلینا نم آنکھوں سے مسکرا دی۔ وہ جانے لگی تھی' جب ولی نے ایک دم اسے آواز دے کر روکا۔

''تم شادی شدہ ہو؟'' کچھ سوچ کر ولی نے غیر ارادی طور پر پوچھ لیا تھا۔ وہ کچھ پل اسے دیکھتی رہی تھی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ اسے کیا بتائے پھر تلخی سے بولی۔

''نو ......''

''جاؤ تم۔'' ولی نے ناگواری سے کہا تھا۔ اس پل ولی کو اس لڑکی پر شدید غصہ آیا تھا۔

✦❋✦

وہ لیٹن ہیوٹ کے فارم میں لائن میں کھڑی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ لیٹن ایک فشر مین تھا۔ اس کا کاروبار بہت بڑا تھا۔ یہاں سے اردگرد کے دیہاتوں کے لوگ اور چھوٹے پیمانے پر مچھلی بیچنے والے کم ریٹ پر مچھلی خریدتے تھے۔

اس کی پڑوسن مارٹی بھی آئی تھی۔ وہ بھی مچھلی بیچنے کا کام کرتی تھی۔ اس نے ہر قسم کی مچھلی خریدی تھی۔ اب وہ جھینگے خرید رہی تھی۔ مارٹی کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ اتنی مہنگی مچھلی خرید سکتی تھی۔

جیلی کا ارادہ ٹرف لابسٹر خریدنے کا تھا۔ اس کے پاس صرف اتنی ہی رقم تھی کہ وہ کیکڑے کا گوشت خرید سکتی۔ یہ گوشت اس نے تین بلاک گھوم کر بیچنا تھا اور صرف تین مارک منافع کے طور پر ملنا تھا۔ اس کی ابھی سے ٹانگیں مسلسل کھڑے ہونے کی وجہ سے شل ہو رہی تھیں اور ابھی اسے پیدل چل کر واپس بھی جانا تھا۔

کیکڑے کا گوشت مغرب میں بڑی لذیذ ڈش سمجھی جاتی ہے۔ پہلے پہل وہ لابسٹر اور پرانز کے سینڈوچ بیچا کرتی تھی۔ کرسٹل شرمپس، کرلڈ فش بناتی تھی مگر ماں کی بیماری کی وجہ سے یہ کام بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اب اس نے مچھلی بیچنے کا کام شروع کیا تھا اور اسے یقین تھا کہ یہ کام بھی چند دن تک ہی چل سکے گا۔ زیادہ دیر تک چلنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس کی کمر اور ٹانگیں درد کی وجہ سے اکڑنے لگتی تھیں۔ پیروں میں ورم آ جاتا تھا۔ وہ ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ یہ تجربہ کس قدر مشکل اور اذیت ناک تھا...... یہ بچہ جو کہ اس کی مرضی کے خلاف دنیا میں آ رہا تھا، جسے ختم کرنے کے متعلق جیلی نے کئی مرتبہ سوچا تھا، مگر ''عمل'' کا مرحلہ بہت مشکل تھا۔

آدھا گھنٹہ مزید انتظار کرنے کے بعد اس کی باری آ ہی گئی تھی۔ لیٹن ہیوٹ نے ہمیشہ کی طرح اسے للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اسے گالیوں سے نوازنے لگی۔

واپسی پر گوشت کا تھیلا اٹھائے کمر درد بھلائے وہ تیز تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ تین بلاک گھومنے کے بعد اور بھاؤ تاؤ کرنے میں اس کا دماغ پلپلا ہونے لگا تھا اور جب نوٹ گننے کی باری آئی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

وہ چند مارک کے نوٹ لے کر ایک چھوٹے یوٹیلیٹی سٹور میں گھس گئی۔ سرف، دالیں، چاول خریدنے کے بعد پیسے ختم ہو چکے تھے اور وہ مرے مرے قدم اٹھاتی بس کے ذریعے گھر چلی آئی۔

وہ جس علاقے میں رہائش پذیر تھی وہاں زیادہ تر سبزی فروش، خاکروب وغیرہ رہتے تھے۔ اس کی ماں بھی خاکروب تھی۔ مگر جیلی کو اس کام سے کراہیت آتی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو ماں اسے دیکھتے ساتھ چلانے لگی تھی۔

''کیا خرید کر لائی ہے؟ یہ دالیں، سرف اور چاول...... میں کیا کھاؤں گی۔'' وہ جیلی کے ہاتھ میں موجود

تھیلے کو دیکھ کر چلانے لگی۔

''ممی! چلاؤ مت۔'' جیلی نے ناگواری سے کہا تھا۔ پھر ایک چھوٹے شاپر کو ماں کی طرف اچھال کر بولی۔

''کھاؤ' مرو' تم تو صرف کھانے کے لیے زندہ ہو۔''

''او...... پنیر کے سینڈوچ' کیک' نگٹس۔'' ممی شاپر میں سے اپنی پسندیدہ چیزوں کو نکالتے ہوئے خوش ہو رہی تھی۔ جیلی نے تلخی سے اس منظر کو دیکھا اور میٹرس پر دراز ہوگئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب کل کا دن کیسے گزرے گا۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ ساری رات سوچوں کے بھنور میں گزر چکی تھی۔ صبح وہ ایک فیصلہ کر کے نہانے کے لیے واش روم میں گھس گئی۔

دو گھنٹے بعد ایک مرتبہ پھر وہ ولی کے گیٹ کے سامنے تھی۔

''تم!'' ولی کو اسے دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

''تمہیں پھر سے روپے چاہیے ہوں گے۔''

''نہیں' مجھے کام چاہیے۔'' جیلی نے پہلی مرتبہ اعتماد سے کہا۔

''آئی ایم سوری! مجھے میڈ کی ضرورت نہیں۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''مگر مجھے کام کرنا ہے۔''

''تو کہیں بھی جا کر کرلو۔''

''اس کنڈیشن میں' میں زیادہ مشقت نہیں کرسکتی۔'' وہ رسان سے کہنے لگی۔ گویا اسے ولی کے غصے کی قطعاً پروا نہیں تھی۔

''تمہیں میڈ کی جاب کہیں بھی مل سکتی ہے۔ نیوز پیپر پڑھا کرو۔'' ولی نے ناگواری سے کہا۔

''میں یہاں اطمینان سے کام کرسکتی ہوں۔ کہیں اور جاب کرنے میں میرے لیے دشواری ہے' تم مجھے اچھے لگے ہو' تم میں بہت سی اچھی عادتیں ہیں۔''

''مثلاً کیا کیا؟'' ولی کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خوشامد کر رہی ہے۔

''تم اچھے انسان ہو۔'' جیلی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی خوبیاں کیسے بیان کرے۔

''تم ...... کیریکٹر لیس نہیں۔'' وہ نگاہ چرائے دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی' جبکہ ولی ششدر سا اسے دیکھنے لگا۔

✦❋✦

''تم آج لنچ میرے ہاں کرنا۔'' مائلہ فون پر اس سے کہہ رہی تھیں۔

''میں بزی ہوں۔ شاید آج نہ آسکوں۔'' ولی واقعی مصروف تھا۔ سارا دن اس کا سائٹ پر گزر جاتا تھا۔

''ایسی بھی کیا مصروفیت۔ صرف آدھے گھنٹے کے لیے آجانا۔'' مائلہ نے اصرار کیا۔

''بہت کام ہے آپا!''
''کیا کارخانے' فیکٹریاں لگانے ہیں۔'' مائلہ نے ہنس کر کہا۔
''یہ ہی سمجھ لیں۔'' وہ مبہم سا بولا۔
''بلند لوگ بلند خواب ہی دیکھتے ہیں۔''
''آپ کو کس نے بتایا ہے کہ میں بہت بلندی کے خواب دیکھتا ہوں۔'' اس کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔
''تمہارے چہرے پر لکھا ہے' تمہاری آنکھیں بتاتی ہیں' ایسے ہی تو از بک ہاؤس کے چکر نہیں لگتے۔''
مائلہ نے لطیف انداز میں طنز کرتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔ ولی تو دم بخود رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جو راز اس کے دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ ہے اس تک مائلہ کی رسائی ہو جائے گی۔''
''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ چاہ کر بھی لہجے کو بے پروا نہیں بنا سکا تھا۔
''ہم سے کیا پردہ داری۔'' مائلہ ہنس رہی تھیں۔ ولی نے غصے کے عالم میں فون پٹخ دیا تھا۔ ابھی وہ ان ہی سلگتی سوچوں میں گم تھا' جب فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی۔ ولی نے سی ایل آئی کی سکرین پر جگمگاتے نمبر کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔
از بک ہاؤس کا نمبر تھا۔ اس کا دل ایک نئی لے پر دھڑکنے لگا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ روشی اسے فون کرے گی۔
''ولی بھائی! ہیلو' ہیلو...... آپ سن رہے ہیں۔'' روشی کی آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔
''ہاں روشی! بولو میں سن رہا ہوں۔''
''ولی بھائی! آپ نے واپس نہیں آنا۔''
''کیوں؟'' ولی کا دل دھڑکنے لگا۔
''آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔'' روشی اسے کچھ یاد دلانا چاہ رہی تھی۔
''کون سا وعدہ؟'' وہ اک پل کے لیے سب کچھ بھول گیا۔
''آپ کو کچھ یاد نہیں۔'' روشی نے مایوسی سے کہا۔
''نہیں۔''
''تو پھر یاد دلانے کا فائدہ بھی نہیں۔'' وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔
''مجھے سب یاد ہے روشی!'' ولی اسے زیادہ دیر خفا نہیں کر سکتا تھا۔
''اچھا'' وہ ایک دم خوش ہو گئی تھی۔ اس کی بچوں جیسی مدھر ہنسی کی آواز نے ولی کے دل کو گلزار کر دیا۔
''تو پھر آپ کب آئیں گے؟''
''ابھی تو یہاں بہت کام ہے اور میں بہت سے پیسے جمع کرنا چاہتا ہوں روشی!'' نہ جانے کس رو میں بہک

کر وہ کہتا چلا گیا۔
"کیوں ......؟ اتنے ڈھیر سے پیسوں کا آپ کیا کریں گے۔ آپ کیا پاپا جیسا بننا چاہتے ہیں۔ پھر تو ہم ولی بھائی کو ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔"
"مجھے ایک گھر بنانا ہے' جس کا لان بہت وسیع ہو گا' جس میں گارلینڈ' ہولی ہوک' پوپی' میری گولڈ اور ٹیولپ کے بے شمار پودے ہوں گے۔ ان پر رنگا رنگ پھول لگیں گے۔ لان میں ایک طرف بہت بڑا Zoo ہو گا۔ سنہری ہرن کے بچے ہوں گے' بہت سے مور ہوں گے' چھوٹا سا تالاب بناؤں گا' جس میں بطخیں سوئمنگ کیا کریں گی۔"
"کتنا خوب صورت ہوگا آپ کا لان؟" روشی خواب کی کیفیت میں کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ننھے ننھے سے دیے جگمگا رہے تھے۔ گویا وہ اس خوب صورت لان کو چشم تصور سے دیکھ رہی تھی۔ فون بند ہو چکا تھا' مگر ولی ایک خواب کی کیفیت کے زیر اثر تھا۔ اس سنہری طلسم کو جیلی کی آمد نے توڑا تھا۔
"تم پھر آ گئی ہو؟" ولی غصے سے پھنکارا۔
"مجبوری ہے۔ مجھ سے مچھلی بیچنے کا کام نہیں ہوتا۔ ایک تو مچھلی کی بو۔" ان دنوں ویسے بھی جیلی کا جی ہر وقت متلاتا رہتا تھا۔
"بھاگو یہاں سے۔ ایک دن نیکی کی تھی' تم تو گلے ہی پڑنے لگی ہو۔"
"گلے کہاں پڑی ہوں۔ سات فٹ دور تو کھڑی ہوں۔"
جیلی نے ناراضی سے جتایا۔
"تم آخر چاہتی کیا ہو؟"
ولی زچ ہو اٹھا۔
"تمہاری ہاؤس کیپر بن جاتی ہوں۔ مناسب سا معاوضہ دے دینا۔ مجھ سے گلی گلی گھوما نہیں جاتا۔" جیلی نے گویا التجا کی۔
"میں اپنے کام خود کر سکتا ہوں۔ ہاتھ سلامت ہیں میرے اور اتنا امیر نہیں ہوں کہ میں ہاؤس کیپر افورڈ کر سکوں۔" وہ تنک کر بولا۔
"تم جتنا افورڈ کر سکتے ہو' اتنے ہی روپے دے دینا۔"
"آئی سوری! تم کسی اور کا گھر دیکھ لو۔"
وہ قطعاً اس کی التجاؤں سے متاثر نہیں ہوا تھا۔
"ہم جیسوں کو کام مشکل سے ملتا ہے۔" جیلی رو دینے کو تھی۔
"کیا مطلب ......؟" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"ممی اور میں ترکی سے آئے ہیں۔ دس سال پہلے ممی نے ایک انگریز سے شادی کر لی تھی۔ پھر ہم لوگ برلن آ گئے۔"

"تو ابھی تک ال لیگل ہو۔ چوری چھپے کام کرتی ہو۔" ولی گویا ساری بات سمجھ چکا تھا۔

"نہیں، ایسی بات نہیں۔ پیپرز کلیئر ہیں، مگر......"

وہ کچھ ہچکچا کر خاموش ہو گئی۔

"مگر کیا......؟"

ولی مشکوک نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

"ممی غلط قسم کا کام کرتی تھی۔ یہ لوگ غیر ملکیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ پولیس آئے دن کے چھاپوں اور انکوائری کی وجہ سے ممی کا کام ٹھپ ہو گیا تھا۔ پھر ممی نے ایک بلڈنگ میں فلیٹ کرائے پر لیا اور اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا، مگر اس کام میں بھی ممی کو پرافٹ نظر نہیں آیا۔ ممی شراب نوشی کی وجہ سے بیمار ہو گئی تھی، تبھی مجھے کام کرنا پڑا۔" اس نے سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"تو میں کیا کروں؟"

پورا قصہ سن کر ولی کا دل کچھ اور بھی برا ہو گیا تھا۔ اس نے بازو سے پکڑ کر جیلی کو گھسیٹا اور دروازے سے باہر دھکا دے کر بولا۔

"آئندہ مجھے تم دوبارہ نظر آئیں تو پولیس کو بلوا لوں گا۔"

آخری کوشش کے طور پر وہ لیٹن ہیوٹ کے فارم میں چلی آئی۔ اس کی توقع کے برعکس لیٹن ہیوٹ نے ادھار مچھلی دے کر جیلی کو سرشار کر دیا تھا۔ وہ خوشی خوشی ٹراؤٹ کا بھاری بھرکم تھیلا اٹھائے واپسی کے لیے چل دی تھی۔

تین سیکٹر گھوم کر گھر گھر مچھلی کے خریداروں کے در کھٹکھٹاتی جیلی بہت نڈھال ہو چکی تھی۔ اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔ وہ تھکن سے چور وجود لیے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔

"کیا تھا جو وہ پاکستانی مجھے میڈ کی جاب دے دیتا۔"

وہ رنجیدگی سے سوچنے لگی۔

"تو کیا جیلینا ولمر! تم ایک مرتبہ پھر کسی پاکستانی پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار تھیں۔"

جیلی نے شدت کے ساتھ اس بوجھ کو محسوس کیا تھا، جو اس کے اندر سانس لے رہا تھا۔ جیلی کی آنکھیں لمحہ بہ لمحہ بھیگنے لگیں۔

✦❋✦

پاپا معمول کے بزنس ٹور کی غرض سے برطانیہ گئے تھے۔ واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک افریقین عورت تھی۔ کالی سیاہ، بے حد بدصورت، بڑی بڑی آنکھوں والی۔ موٹے موٹے ہونٹ تھے اور سفید ہموار موتیوں جیسے جگمگاتے دانت۔ اس کے دانتوں کی خوب صورتی کالی رنگت کی وجہ سے ماند پڑ گئی تھی۔ بال بے حد گھنگھریالے تھے، بھورے سے، سیاہی مائل، اتنے برے لگتے کہ دیکھ کر جی متلانے لگتا۔ وہ قطعاً خوب صورت نہیں تھی، مگر پاپا کو نہ جانے اس میں کیسا حسن دکھائی دیا تھا کہ وہ ڈولن سے نکاح کر کے اسے گھر لے آئے تھے۔

گل بخت کی جگمگاہٹیں ماند پڑنے لگی تھیں۔ اس کا نوخیز حسن اداسی کی لپیٹ میں چھپ گیا۔ وہ جو کہتی تھی کہ احمد صاحب اگر چوتھی، پانچویں شادی کر لیں اسے قطعاً پروا نہیں ہوگی۔ اب اس غم کی وجہ سے کملا کر رہ گئی تھی۔ دادا، دادی، گل بخت کے اس صدمے کو کسی بھی طرح کم نہیں کر سکتے تھے۔

مگر پھر آہستہ آہستہ وہ اثمر اور اشنان کے وجود میں اپنے لیے سکھ اور مصروفت ڈھونڈ چکی تھی۔ مگر احمد صاحب نے ایک مرتبہ پھر گل بخت کو عظیم صدمے سے دوچار کر دیا۔ اثمر اور اشنان کو کانونٹ میں بھیج دیا گیا تھا۔ گل بخت ایک مرتبہ پھر روتی دھوتی رہ گئی تھی۔ وہ بچوں کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر پاپا کو بیٹوں کا مستقبل عزیز تھا۔

ان دنوں شانی بھی نہ جانے کن خیالوں میں گم رہتی تھی۔ کبھی کبھی روشانے سے بہت یاسیت بھرے لہجے میں کہتی۔

"روشی! تم کس قدر حسین ہو اور میں......"

شانی خوب صورت نہیں تھی۔ اس کی رنگت بھی سانولی تھی۔ نقش بھی معمولی تھے۔ البتہ اس کا دل بہت پیارا تھا۔

وہ عمر میں شانی سے ایک سال بڑی تھی۔ مگر اس کی سوچ پر کسی بھی آلودگی کی چھاپ نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک جانوروں کو دیکھ کر پُرجوش سی چمک امڈنے لگتی تھی۔ وہ لڑکپن کی بھول بھلیوں میں گم تھی۔ ابھی تو کوئی خواب آنکھوں میں نہیں اترا تھا۔ جب اسے کسی کے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔ یہ دادا، دادی نے کیسا فیصلہ کیا تھا۔ یہ کیسا ان کا حکم تھا جسے پاپا نے خاموشی سے سن لیا۔ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اتنا بھی نہیں کہہ سکے تھے کہ اس کی تعلیم ادھوری ہے۔ شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکے گی۔ مگر ان کے خاندان میں عورت کے جذبات و احساسات کا خیال رکھا ہی کب جاتا تھا۔ عورت تو ان لوگوں کے نزدیک ربڑ کی گڑیا تھی جسے توڑ مروڑ کر اپنی پسند کے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے۔

✦✻✦

اے لیول کے فائنل ایگزامز کے بعد اس کی شادی طے کر دی گئی تھی۔ دادی تو اتنا پڑھانے کے حق میں نہیں تھیں۔ انہیں یہ ہی خوف ہمیشہ جکڑے رہا تھا کہ فرفر انگریزی بولنے والی ان کی یہ پوتی کالج میں جا کر کوئی

چن نہ چڑھا لے۔

پھر وہ لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ انہیں پوتیوں سے یہ ہی خدشہ رہا تھا اور وہ شکرانے پڑھتی تھیں کہ گل بخت کے ہاں کسی لڑکی کی ولادت نہیں ہوئی۔

روشی نے ایک مرتبہ بھی پوچھا نہیں تھا کہ اسے کس کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ وہ پوچھ کر کرتی بھی کیا۔

دادا' دادی اور گل بخت کس قدر مسرور تھے سب اور گل بخت کہہ رہی تھی۔

''میر ذکاء حیات خان' روشی کے سگے ماموں کا بیٹا ہے اور گل بخت کا پھوپھی زاد بھائی ہے۔'' درانی قبیلے کے نئے سردار میر ذکاء حیات سے اس کا مقدر جڑنے والا تھا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اپنے ننھیال والوں کا نام سنا تھا۔ یہ کیسے خون کے رشتے تھے' جنہوں نے کبھی پلٹ کر اپنی اولاد کی اولاد کو پوچھا تک نہیں تھا۔ ملنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اب وہ ہی اس کے اصل حق دار ٹھہرے تھے۔

✦❋✦

دو جنوری کی شام ہری پور سے ایک قافلہ آیا تھا۔ بزرگ مردوں کے سروں پر سفید براق پگڑیاں تھیں۔ نوجوان لڑکوں نے کندھوں پر اجرک رکھی تھی اور پہاڑی باپردہ عورتوں کی سج دھج دیکھنے کے لائق تھی۔ گھیردار ریشمی نفیس اور قیمتی فراک پہنیں زیورات سے لدی پھندی عورتیں آج مسکرا بھی رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں نے بھی اپنا روایتی لباس پہن رکھا تھا۔ ان کے سروں پر بھی چھوٹی چھوٹی فراک کے ہم رنگ اوڑھنیاں تھیں۔

روشی ایک کمرے میں کسی پتھر کی مورت کی طرح سجی سنوری خاموش بیٹھی تھی۔ اسے شہر کی بہترین بیوٹیشن نے تیار کیا تھا۔ اس کا لباس بھی بہت قیمتی اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا تھا۔

یہ پہاڑی گاؤں تھا۔ اسے ایک سرخ پتھروں سے بنی وسیع و عریض عمارت میں لایا گیا تھا۔ نہ جانے کتنے برآمدے، کتنی راہ داریاں اور کتنے ہی دلان تھے اس عمارت میں۔ اونچی چھتوں والی یہ عمارت اپنے وقت کے معماروں کی ذہانت اور حسن ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ لکڑی کے بھاری، قدیم منقش دروازے، ہوا دار کمرے، دیواروں میں نصب کیکر کی لکڑی کی کھڑکیاں کھلے کھلے روشن دان، دیواروں پر بھی خوب صورت نقش نگاری کی گئی تھی۔ فرش دبیز قالین سے آراستہ تھا اور روشانے قالین کے ڈیزائن میں کھوئی بدلتے وقت کی کروٹوں میں چھپی ان دیکھی الجھنوں کو محسوس کرنے کی کوشش میں تھی۔

یہاں سب چہرے روشی کے لیے انجان تھے۔ ان عورتوں میں کسی سے کوئی بھی بارات کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ حتیٰ کہ مہر افزوں بھی نہیں جو کہ اس کی سب سے چھوٹی مامی اور ساس کے عہدے پر فائز تھیں۔

روشی سر جھکائے لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی۔ جب ایک مدھر سی آواز سن کر اس نے پلکوں کی چلمن اٹھا کر دیکھا۔ اس کے بالمقابل ایک بلا کی حسین اور نازک اندام عورت کھڑی تھی۔ اس قدر خوب صورت کہ بار بار دیکھنے کو جی ہمکنے لگتا اور طبیعت پھر بھی سیر نہ ہوتی۔ میدے جیسی سفید اور سرخ گلاب کی طرح تروتازہ۔ یوں لگتا تھا کہ وقت اس عورت کو چھوئے بغیر گزرتا رہا ہے۔ سیاہ آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ اس کے بال بھی یقیناً سیاہ تھے۔ گلابی دوپٹے کو اوڑھے وہ بہت باوقار، خوب صورت دکھائی دے رہی تھیں۔ مہر افزوں نے شاید کسی ملازمہ کو آواز دی تھی۔

''گنجورا، او گنجورا!''

"جی کراں، حکم بی بی!" ایک درمیانی عمر کی خرانٹ سی عورت کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھال تھا۔ جس میں بے شمار سکے تھے۔

"اندر لے بھی آ۔ میں میر ذکاء کی بیوی کا صدقہ تو اتاروں۔ میری پہلی نوں (بہو) کا قدم پڑا ہے۔"

"زری خان کو بلاؤ۔" مہر افزوں نے اسی ملازمہ سے کہا۔ کچھ دیر بعد زردس خان جسے سب پیار سے زری خان بولتے تھے اندر چلا آیا تھا۔

"مما! کیا بات ہے؟" وہ ناگواری سے بولا۔

"ادھر بھرجائی کا گوڈا پکڑ کر نیک مانگ۔"

"اچھا۔" زردس خان کی ناگواری پل بھر میں زائل ہو گئی تھی۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے عین روشانے کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

"ہاں، تو بھرجائی اب بتا دو، کیا دو گی؟ کتنا ظرف ہے دینے کا؟ میں کیا مانگوں تم سے؟" اس کے لبوں پر شوخ سی مسکراہٹ تھی۔ روشانے کو نگاہ اٹھا کر دیکھنا پڑا۔ اس کے سامنے خوش لباس اور بلا کا خوش شکل نوجوان بیٹھا تھا۔

"بھرجائی کو تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ انگریزی میں بات کرو نا زری خان۔" اس شوخ آواز پر روشی نے سر انہیں اٹھایا تھا۔ یہ آواز گیتی کی تھی۔

"بولو نا بھرجائی! کیا دو گی؟" زری خان اب بہت شکستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ روشی، زری خان کے انگریزی بولنے پر حیران نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے قبیلے میں مردوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی جاتی ہے کیونکہ ان ہی مردوں کے نام سے ان کے خاندان کی حشمت برقرار رہتی ہے البتہ عورتوں کی اکثریت ان پڑھ ہوتی ہے۔

"رسم میں تو پیسے دیے جاتے ہیں۔ تم مانگو کیا مانگتے ہو؟" روشی کی مدد کے لیے گل افشاں میدان میں کود پڑی تھی۔

"یہ میرا اور میری بھرجائی کے درمیان معاملہ ہے۔ تم لوگوں کو بیچ میں آنے کی ضرورت نہیں۔" زری خان نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔

"کیا دوں؟" گھونگھٹ کی آڑ میں سے اس کی مدھم آواز ابھری تھی۔

"میں تم سے روپیہ نہیں مانگوں گا۔"

"تو کیا لو گے؟" روشی کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

"ایک عہد۔" وہ دھیرے سے مسکرا لیا۔

"کیسا عہد؟" روشی پھر حیران ہوئی۔

''تم عہد کرو میر ذکاء کے سامنے کبھی نہیں جھکو گی۔ تم نے میر ذکاء حیات کے دل کو بدلنا ہے۔ سوچ کو بدلنا ہے۔ تم نے پڑھے لکھے جاہل نہیں دیکھے نا' میر ذکاء کو دیکھ لینا۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا پوزیشن ہولڈر ہے۔ وہ اس بستی' اس قبیلے اور ہمارے علاقے کا سردار ہے اور ہم سب اس کے فیصلوں کے محتاج' بے بس ہیں حتیٰ کہ بابا بھی اس کے فیصلے کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتے۔'' اس نے کچھ دیر انتظار کیا تھا۔ روشی ششدر میں بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا تھا۔ پھر تیزی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد روشی اس کمرے میں تنہا تھی۔ اسے جہیز میں احمد صاحب نے کئی مربع زمینیں دی تھیں' سونا دیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے از بک ہاؤس سے کچھ نہیں ملا تھا۔ نہ توجہ' نہ پیار' نہ محبت۔

''روشی! تم احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔ تم پاپا سے بولو' وہ تمہیں اپنے قبیلے میں مت کھپائیں۔ وہاں تم کیسے رہو گی۔ تم سسک سسک کر مر جاؤں گی روشی! تم بولتی کیوں نہیں ہو؟ کچھ کہتی کیوں نہیں ہو؟''

''گل بخت بولی تھی کیا؟ جب اسے جوان ہوتی لڑکیوں کے باپ سے بیاہ دیا گیا تھا۔ مائلہ ممی نے احتجاج کیا تھا؟ پھر میں کیسے بولوں؟'' وہ اطمینان سے کہتی اور قل قل ہنسنے لگتی' وہ اپنی کھنکھناتی ہنسی میں تمام درد پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ شانی آزردگی سے اسے دیکھتی رہ جاتی۔

''گل بخت کا تم سے کیا مقابلہ وہ تو گوٹھ کی اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا پانے پر خوش ہے' جبکہ تم روشی!'' شانی کے حلق میں آنسوؤں کی چبھن ہونے لگتی تو وہ لب بھینچے خاموش ہو جاتی۔

''پاپا کے سینے میں دل کی جگہ پتھر فٹ ہے۔ کیا تھا جو میر ذکاء کی جگہ ولی خاقان کے پرپوزل کو ایکسیپٹ کر لیا جاتا۔ کئی خوبیاں ہیں ولی بھائی میں۔ کس قدر خوش اخلاق ہیں۔ کتنی خوب صورت باتیں کرتے ہیں۔ کتنا احترام کرتے ہیں ان کی آنکھوں میں' لہجے میں' ہمارے ساتھ بات کرتے ہوئے۔''

''ولی بھائی ......'' روشی کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''ولی بھائی کا پرپوزل میرے لیے یہ سب کی بات ہے؟'' دھک دھک کرتے دل کے ساتھ روشی نے پوچھ ہی لیا تھا۔

''ممی نے بات کی تھی پاپا سے' علیحدگی سے کچھ عرصہ پہلے۔''

''تمہیں کس نے بتایا ہے؟'' روشی نے احمقانہ سا سوال کیا۔

''مجھے سب پتا چل جاتا ہے۔ تمہیں اپنی خبر نہیں۔ دوسروں کی کیا رکھو گی۔ کبھی ولی بھائی کی آنکھوں میں غور سے دیکھا ہے۔''

''نہیں۔'' روشی نے بے ساختہ نفی میں سر ہلا دیا۔

''مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے وہ تمہیں چاہتے ہیں بے حد و حساب۔'' شانی پرسوچ انداز میں کہتی۔

''نہیں ......نہیں' ایسا کچھ بھی نہیں۔'' وہ دل کی بدلتی دھڑکنوں سے خوف زدہ ہو گئی تھی اور پھر جب نکاح نامے کے کاغذ اس کے سامنے آئے تو بغیر کچھ بھی سوچے اس نے دستخط کر دیئے تھے۔

اور اب وہ اس کمرے میں بالکل تنہا خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔
یکدم دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا' روشی چونک سی گئی۔ اس کا دل پہلو میں زور سے دھڑکا تھا' کمرے میں داخل ہونے والا اب اس کے مقابل کھڑا تھا۔ وہ کوئی مرد نہیں عورت تھی۔ اگرچہ روشی نے میر ذکاء کو دیکھا نہیں تھا۔ مگر اس کی وجاہت کے کافی قصے سن رکھے تھے۔ لاشعوری طور پر وہ میر ذکاء کا انتظار کر رہی تھی۔
وہ گل زیبا تھی۔ اس کے سب سے بڑے ماموں کی بڑی بیٹی۔
''کس کا انتظار کر رہی ہو روشانے خان!'' وہ آنکھوں میں اترا پانی صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''ذکاء آج تو نہیں آئے گا۔ آج تم دونوں ساس بہو کے سہاگ شغل فرما رہے ہیں۔ مہر افروز کو کوئی پروا نہیں۔ تم بھی بے پروا ہو جاؤ۔ تب ہی تو یہاں زندگی بسر کر پاؤ گی۔''
وہ پھر سے ہنسنے لگی تھی۔ جب ہی دروازہ کھلا تھا اور شاید میر ذکاء اندر داخل ہوا۔ گل زیبا کو دیکھ کر اس کی پیشانی شکن آلود ہوتی چلی گئی تھی۔
''آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟''
''جا رہی ہوں۔'' وہ ہنسنا ترک کر کے بوکھلا کر باہر نکل گئی تھی۔
''کیا باتیں کی ہیں گل زیبا نے؟'' اب وہ روشی کی طرف متوجہ ہوا۔
''کک' کچھ بھی نہیں۔'' وہ ایک دم گھبرا سی گئی۔
''کہہ بھی دیں تو میری بلا سے۔'' میر ذکاء تنفر سے بولا۔ پھر ایک دم ہی اس نے لہجہ بدل لیا تھا۔ آج تو اسے غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آج تو فتح کی جشن کی رات تھی۔ وہ مسرور تھا' شاد تھا۔ احمد خان ازبک کی بیٹی اس کی خواب گاہ میں موجود تھی۔ اس کی پھوپھی کو اذیتیں' تکلیفیں دینے والوں کا تمام عمر اس کے سامنے سر جھکا رہے گا۔ اس سے بڑی فتح کیا ہو سکتی ہے۔
اس نے اپنی دادی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بھی احمد خان ازبک کی بیٹی کو ایسے ہی زندانوں میں قید رکھے گا۔ وہ اپنی پھوپھی مشیرہ گل کے قاتلوں سے اسی طرح بدلہ لینا چاہتا تھا اور اس کی دادی بہجت نور اس کے تمام فیصلوں کو سراہتی تھیں۔
''اچھا تو تم احمد خان کی بیٹی ہو۔'' میر ذکاء نے گویا بہت ہی لطف لیا تھا۔ روشی اس کے لب و لہجے کی کاٹ پر دنگ رہ گئی تھی۔
''کیا کوئی پہلی رات اپنی دلہن سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔'' وہ سوچتی رہ گئی تھی اور بہت بہادر ہونے کے دعوے کرنے والی روشانے خان کی آنکھیں جھلنے لگی تھیں۔
''میری پھوپھی کے ساتھ تمہارے باپ نے پتا ہے کیا کیا تھا؟'' وہ دو قدم چل کر اس کے قریب چلا آیا تھا۔ اتنا قریب کہ روشانے اس کی گرم سانسوں کو بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔

''اس کا گلا یوں گھونٹ کر مار دیا تھا۔'' میر ذکاء نے اپنے دونوں ہاتھوں سے روشی کی گردن پر اتنا دباؤ ڈالا تھا کہ گلے میں موجود نیکلس اس کی نازک گردن میں کھب کر رہ گیا تھا۔ روشی کی بے ساختہ گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔

''اس لیے کہ میری پھوپھی تمہارے باپ کے معیار پر پورا نہیں اتر سکی تھی۔ وہ بدصورت تھی۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ وہ ان پڑھ تھی۔ تو کیا ان باتوں کی وجہ سے ایک عورت کا قتل کر دینا جائز ہے؟''
اس کے خون آشام لہجے میں بھوکے شیر کی غراہٹ تھی۔

''قتل' میری ماں کا قتل پاپا نے کیا ہے؟'' روشی کا دماغ چکرانے لگا تھا۔ اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

''میں نہیں مانتی۔'' اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

''کوئی بھی نہیں مانتا۔ اس ڈرامے کی پوری سٹوری تمہاری دادی بدیہی جہاں نے ترتیب دی تھی۔ وہ ہی اس ڈرامے کی ڈائریکٹر تھیں۔'' وہ نفرت سے سر جھٹک کر بولا۔ ''تمہارا باپ ایک عیاش آدمی ہے۔''

''تم خود کیا ہو؟'' روشیا نے بھی اسی طرح تنفر سے سر جھٹک کر کہنا چاہتی تھی۔ مگر لب بھینچ کر صرف اسے دیکھتی رہ گئی۔ ''اس گھر میں رہنا چاہتی ہو تو زبان سی کر اور سر جھکا کر رہنا ہوگا۔ بک بک کی تو گولی سینے میں اتار دوں گا۔ ہماری عورتیں مردوں کے دوبدو گفتگو نہیں کرتیں۔ تمہارا کام صرف خدمت کرنا ہے۔''

رفاقتوں کی یہ سیاہ شب روشانے خان کے لیے نفرتوں اور ذلتوں کا ایک نیا باب کھول گئی تھی۔

ساری رات روشانے سسکتی رہی تھی۔ اس کا انگ انگ تھکن سے چور تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں طبعی موت مری تھیں۔ البتہ اس کی دادی کی وہ ناپسندیدہ بہو تھیں۔

اس شادی کا اصل مقصد بہت جلد روشی پر واضح ہو گیا تھا۔ اس کے سسر اور سگے ماموں میر اورنگ زیب نے احمد خان کی بیٹی سے اس لیے میر ذکاء کی شادی کی تھی کہ اپنی بہن مشیرہ گل کو جہیز میں دی جانے والی لاکھوں ایکڑ اراضی کو واپس لیا جائے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ گل زیبا نے اسے بتایا تھا کہ اورنگ زیب کے اس کے پاپا کے ساتھ بے شمار اختلافات تھے۔ سیاسی' سماجی ہر طرح کے اختلاف۔

ہر الیکشنز پر ان کا جھگڑا لازمی ہوتا تھا۔ روشی کے بڑے تایا مسلسل تیسری مرتبہ قومی اسمبلی کی اپنی خاندانی سیٹ جیت گئے تھے۔ اس فتح کا جشن آٹھ دن منایا گیا تھا۔ پاپا' تایا کو ہر طرح سے سپورٹ کرتے تھے۔ میر اورنگ زیب کو اس بات پر بھی غصہ تھا۔ وہ ازبک قبیلے والوں کو زک پہنچانے کا موئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے اور اب تمام عمران کا سر جھکانے کے لیے ایک کمزوری اورنگ زیب میر کے ہاتھ آ گئی تھی اور وہ اس کمزوری سے ہر صورت فائدہ اٹھانا چاہتے تھے جبکہ روشی بھی خود سے ایک عہد کر چکی تھی۔

✦✻✦

کسی کے جھنجھوڑنے پر روشی نے مندی مندی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اتنے لوگوں کو دیکھ کر روشی ہڑبڑا کر اٹھ گئی تھی۔

یہ اس گھر میں روشی کی تیسری صبح تھی۔

''میں تمہیں جگانا نہیں چاہتی تھی' مگر ان بچوں نے تنگ کر رکھا تھا۔ یہ اپنی بھرجائی کو دیکھنا چاہتے تھے۔'' مہرافزوں نے اپنے اردگرد کھڑے بچوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مما! پہلے تعارف تو کروائیں۔'' اک شرمائی شرمائی نیلی آنکھوں والی لڑکی نے کہا۔

''میں بتاتی ہوں بھرجائی کو کہ ہم کون ہیں۔'' دوسری پُراعتماد سی لڑکی پٹر پٹر بولنے لگی۔ ''ہم مہرافزوں کی بیٹیاں ہیں۔ بھائی ذکاء سے چھوٹا زری خان ہے' پھر یہ خنیا آپی ان کے بعد ماوئی ہے' پھر میں ہوں' میرا نام جوہی ہے۔ پھر پنا اور پزمان ہیں۔ پری دخت پانچ سال کی ہے اور اس سے نو سال بڑا زخام ہے۔ اسے بی جاناں (دادی) نے بورڈنگ بھجوا دیا ہے' حالانکہ مما اسے بھیجنا نہیں چاہتی تھیں۔ مگر وہ بہت ہی کالا ہے۔ سو بی جاناں کے جاری کردہ بیان کے تحت وہ خانوں کی نسل میں کلنک کا ٹیکا ہے۔ اسے بی جاناں اپنا پوتا سرے سے تسلیم نہیں کرتیں۔ ہم چھ بہنیں اور ہمارے تین بھائی ہیں۔ بھائی ہمیں جان سے پیارے ہیں اور بھایا ہماری جان لینے پر تلے رہتے ہیں۔ ہم زبانیں رکھنے والی بے زبان مخلوق ہیں۔''

''جوہی!'' مہرافزوں نے ناگواری سے جوہی کو ٹوکا تھا۔ وہ ہونٹ کچلتے ہوئے خاموش ہوگئی۔ یہ چھ لڑکیاں اس کی نندیں تھیں اور مقام افسوس یہ تھا کہ ان میں سے کسی نے بھی سکول کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھیں۔ اس گھر میں ٹی وی نہیں تھا۔ لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر موجود تھے۔ مگر صرف ذکاء کے کمرے میں۔ جوہی نے بتایا تھا ٹی وی وغیرہ گیسٹ ہاؤس میں ہے۔ سی ڈی پلیئر اور میوزک سسٹم بھی وہیں ہیں۔ عورتوں کی اکثریت ان پڑھ تھی اسی لیے کسی اخبار یا رسالے کا گھر میں آنا ناممکن سی بات تھی۔

''اب تم اٹھ چکی ہو تو میں تمہارا ناشتہ بھجواتی ہوں۔'' مہرافزوں نے پری' ماوئی اور پنا کے باہر جانے کے بعد کہا۔

''میں پہلے ہاتھ لوں گی۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا۔

''ہاں' ٹھیک ہے۔ میں پانی گرم کروا دیتی ہوں۔'' انہوں نے عام عورتوں کی طرح جتلاتی' ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھ کر شرمندہ نہیں کیا تھا۔ ان کے لہجے میں بلا کی سادگی تھی۔

وہ ایک سادہ سا نفیس سوٹ اور اپنا تولیہ نکال کر باہر نکلنے لگی تھی' پھر کچھ سوچ کر پلٹ آئی۔ اس نے اپنے امپورٹڈ بیگ میں سے باڈی لوشنز' باڈی اسپرے' ہیئر اسپرے' کولڈ کریمز اور ایئر فریشنر کی بوتلیں نکال کر دیوار میں نصب آئینے کے نیچے بنے بہت ہی سٹائلش شیلف نما سٹینڈ میں ترتیب سے رکھدی تھیں۔ اس کرسٹل کے سٹینڈ میں صرف ایک ہیئر برش اور مردانہ کلون رکھا تھا۔ پھر روشی نے اپنا سارا کاسمیٹکس کا سامنا بھی اسی وسیع و

عریض کرسٹل کی شیلف پر سجا دیا تھا۔

وہ اپنے دھیان میں اس قدر مگن تھی کہ اسے کچھ پل کے لیے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ چونکی جب کچھ پُرشوق نظروں کی تپش محسوس ہوئی۔ اس کے قریب جوہی' یزمان اور پری کھڑی تھیں۔ وہ بہت ہی اشتیاق سے اس سجی سجی کرسٹل کی شیلف کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے ایسی چیزیں بھلا کہاں دیکھی تھیں۔

''بھرجائی! تم یہ سب لگاؤ گی۔'' یزمان نے جگمگاتی آنکھوں سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''پھر تم اور بھی حسین لگو گی۔'' پری خوش دلی سے بولی۔

''پتا نہیں' یہ تم بتانا۔'' وہ فیس واش اور شیمپو کی بوتل اٹھا کر باہر نکل گئی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے بچیوں سے کہا۔''میں ابھی آتی ہوں پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے بھرجائی!'' انہوں نے خوشی خوشی کہا۔ وہ طویل عریض راہ داریاں' برآمدے عبور کر کے دالان میں آ گئی تھی۔ دائیں جانب ایک ترتیب سے تین غسل خانے بنے تھے۔ اس نے تینوں میں جھانک کر دیکھا اور بدمزہ ہو کر وہیں کھڑی سوچتی رہ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہو بھرجائی؟'' ماوئ نہ جانے کس کونے سے برآمد ہوئی تھی۔

''اچھا اچھا تم نے غسل کرنا ہے۔ یوں کرو اس ساتھ والے باتھ روم میں چلی جاؤ۔'' ماوئ نے ہاتھ کے اشارے سے ایک الگ تھلگ بیٹھک نما کمرے کے ساتھ بنے واش روم کی طرف اشارہ کیا۔''یہ مردوں کے استعمال میں ہے۔''

وہ اس کے برابر چلتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔ روشی نے جوں ہی دروازہ کھولا تو وہ حیران ہی رہ گئی۔ سفید دودھیا جگمگاتے ٹائلوں سے چمکتا دیوار میں نصب صاف شفاف آئینہ' بڑے بڑے سفید رنگ کے چمکتے واش بیسن ترتیب سے لگے تھے۔ چمکتی ٹائلوں سے سجی دیواریں۔ ٹونٹیاں' شاور' حتیٰ کہ گیزر بھی۔ نفیس شیشے کی شیلف پر کئی طرح کے صابن' شیمپو' باڈی سپرے' ترتیب سے رکھے تھے۔ ایک سفید رنگ کی کھونٹی بھی تھی جس پر میر ذکاء کا سوٹ لٹکا ہوا تھا۔

''اپنے لیے ہر طرح کا آرام اور سہولت مہیا کر رکھی ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟ یہ کیسے حاکم ہیں؟ جو اپنی رعایا کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرتے ہیں اور رعایا میں بھی تو ان کے خون کے رشتے تھے۔ ماں' بہنیں' بھابیاں' بیٹیاں۔ پھر یہ ظلم کیوں؟ یہ زیادتی کیوں؟ اتنی تفریق کیوں؟'' روشی سوچے جا رہی تھی۔ اس نے بہت دل لگا کر غسل کیا تھا۔

باہر آئی تو ماوئ ابھی تک شاید اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

''اتنی دیر لگا دی تھی بھرجائی! اگر بھایا آ جاتے تو......''

''تو کیا کہہ لینا تھا میر صاحب نے۔'' وہ بہت فریش تھی۔ کھلی کھلی تروتازہ۔ اس وقت اس پر کسی اذیت' کسی تکلیف' کسی غم کا شائبہ نہیں تھا۔

''حشر کر دینا تھا انہوں نے میرا بھی اور تمہارا بھی۔ اس طرف کسی کو آنے کی اجازت نہیں۔''

''اچھا اب بھایا کو بتانا نہیں اور صبح والی بات بھی نہ بتانا۔'' ماویٰ نے تنبیہ کی۔

''کون سی بات؟'' روشی چونک سی گئی۔

''یہی کہ ہم نے تم کو صبح جگا دیا تھا۔''

''یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں کہ میر صاحب کو بتائی جائے۔'' روشی ہنس پڑی۔

''یہ تو تم کہہ رہی ہو نا۔ اگر بھایا کو خبر ہو گئی کہ ہم نے تمہاری نیند میں خلل ڈالا ہے تو سمجھو ہم سب کی خیر نہیں۔ ان لوگوں کو اپنی بیویوں کے آرام کا بڑا خیال رہتا ہے۔ بیویوں سے مشقت جو لینی ہوتی ہے۔''

ماویٰ نے عام سے لہجے میں کہا تھا' مگر روشی کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ اتنی سی بچی کے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر اس کا حیران ہونا فطری تھا۔ ماویٰ ابھی پندرہ سال کی تھی۔ اس عمر میں روشی کو تو جانوروں کے لاڈ اٹھانے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اور یہ لڑکی کس قدر باشعور تھی۔ وہ ماویٰ کو سمجھانا چاہتی تھی' مگر سامنے سے آتی جوہی کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

''بھرجائی! ناشتہ کر لو۔''

دستر خوان گول کمرے میں لگتا تھا۔ مگر روشی کو کھانا اس کے کمرے میں دیا جاتا تھا۔ یہ بی جاناں کا حکم تھا۔ سو آج بھی روشی سوچ رہی تھی کہ تنہا ہی ناشتہ کرنا پڑے گا۔ مگر اس کا خیال اپنے کمرے میں موجود ہر عمر اور ہر سائز کی نند کو دیکھ کو غلط ثابت ہو گیا۔

فیروزہ اور خنیا نے ناشتے کے لوازمات میز پر سجا دیئے تھے۔

''بھرجائی! آج ہم تمہارے ساتھ ناشتہ کریں گے۔'' پری دخت نے بڑے پیار سے کہا تھا۔ پشتو لہجے میں اردو بولتی پری اور بھی پیاری لگتی تھی۔ سرخ انار جیسے دہکتے پھولے پھولے گال اور سنہری آنکھوں میں معصومانہ چمک لیے وہ اپنی نئی نویلی سجی سجی سی بھرجائی کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے پاس بیٹھنے' چھونے اور ڈھیر ساری باتیں کرنے کا ارمان پری کے دل میں تھا۔ بھرجائی کے قریب سے کس قدر بھینی بھینی روح میں اتر جانے والی دلفریب معطر خوشبو آتی تھی۔ اسی لیے تو روشی جب بالوں کو برش کر کے خود پر کسی بہترین پرفیوم کو اسپرے کرنے کے بعد صوفے پر بیٹھنے لگتی تھی تو پری جھٹ سے روشی کے دائیں طرف چپک کر بیٹھ گئی۔ اس کے بائیں طرف پنا اور پزمان بیٹھی تھیں۔ جب ہی مہر افزوں بھی چائے کا تھرموس اٹھائے آ گئیں۔

''ان سب کی خواہش تھی تمہارے ساتھ ناشتہ کرنے کی۔ تبھی تو دستر خوان پر صرف بی جاناں کو دکھانے کی

غرض سے منہ چلاتی رہی ہیں۔'' انہوں نے کچھ شرمندہ سے انداز میں بتایا تو روشی بے اختیار بولی۔

''مما! مجھے بھی تنہا کچھ بھی کھانے کی عادت نہیں۔''

''ہاں ...... ہاں! اس لیے میں نے میر کو کہا بھی تھا۔ دلہن کے ساتھ ناشتہ کر لے۔ میں نے کہا شہر کی بچی ہے۔ آہستہ آہستہ عادی ہو جائے گی' مگر یہاں کے مرد' عورت کی بات کو بے قیمت سمجھتے ہیں۔ چاہے مقابل ماں ہی کیوں نہ ہو۔ بولا' زیادہ سر چڑھانے کی ضرورت نہیں۔''

وہ بہت آہستہ آواز میں گویا خود سے مخاطب تھیں۔ وہ اسی طرح دھیما دھیما پُر اثر بولتی تھیں۔ یہاں پر سب عورتیں ہی آہستہ بولنے کی عادی تھیں۔

''بھرجائی! کھاؤ نا۔'' خنیا تمام ڈشز سے ڈھکن اٹھاتے ہوئے بولی۔

شکر قندی کا حلوہ' قیمہ بھرے پراٹھے' انڈے' گرما گرم تازہ روسٹ فش' آم کا مربہ' روشی کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ حالانکہ وہ دیسی قسم کے ناشتے کی عادی نہیں تھی۔

''بھرجائی! میں تو کھانا بھی تمہارے ساتھ کھاؤں گی۔'' روایتی گھیردار فراک پہنے سر پر دوپٹہ اوڑھے پانچ سال پری دخت معصومیت سے بولی تھی۔ ابھی وہ صرف پانچ سال کی تھی اور اسے بڑی بوڑھیوں کی طرح کس کر دوپٹہ اوڑھایا گیا تھا۔

''کیوں نہیں۔ میں تو خود پری کے ساتھ لنچ اور ڈنر کروں گی۔'' اس نے پری کے گال کو نرمی سے تھپتھپایا۔

''بی بی! بڑے خان جی بلا رہے ہیں۔'' گنجور نے دروازہ کھول کر مہر افروز سے کہا تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑا نوالہ پلیٹ میں رکھ کر اٹھ گئی تھی۔

''مما! ناشتہ تو کر لیں۔'' روشی بے ساختہ بولی۔

''بڑے خان جی کروا دیں گے۔'' جوہی اور ماوئی ہنس رہی تھیں۔

''ابھی ایک منٹ بھی مما لیٹ ہو جاتیں تو بابا جان نے طوفان کھڑا کر دینا تھا۔'' خنیا دھیمی آواز میں روشی کو بتانے لگی تھی۔

✦❋✦

از بک ہاؤس سے اس کے لیے ایک بھی فون نہیں آیا تھا۔ اگر آیا بھی تھا تو روشی کو کسی نے بتانا گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی شانی بہت پریشان ہو گی۔ شانی سے ملنے کو وہ بھی بہت بے چین تھی۔ فون سیٹ بی جاناں کے کمرے میں تھا اور روشی اپنی سگی نانی کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ان سے خائف رہتی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ رات کو میر جب آئے گا تو وہ اس کے سیل فون سے شانی کو فون کرے گی۔

جب پہلی مرتبہ روشی نے بی جاناں کو دیکھا تو حیران رہ گئی تھی۔ دبلی پتلی' بے حد سرخ و سفید' سفید براق کپڑے پہنے' سفید دودھیا بال' تخت پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ یوں لگتا گویا کسی ریاست کی ملکہ ہیں۔

چہرے پر لاتعداد جھریاں' گہری گہری لکیروں میں چہرے کے نقش گم ہو چکے تھے۔ شاید کسی زمانے میں بہت خوب صورت تھیں۔ اس دبلے پتلے سراپے میں بلا کا غیظ چھپا تھا۔ نہ جانے کون کون سی نفرتوں کا جوار بھاٹا سلگ رہا تھا۔ روشی کو دیکھتے ہی انہوں نے منہ پھیر لیا۔

''اورنگ زیب کی ضد تھی' ورنہ احمد خان ازبک کی بیٹی کبھی یہاں دکھائی نہ دیتی۔'' انہوں نے نہ جانے کتنی دفعہ جتایا تھا۔ روشی حیران تھی کہ انہوں نے سگی نواسی کو پیار کرنا' ایک نظر دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ مہر افزوں اس کے اترے چہرے کو دیکھ کر ہولے سے بدبدائی تھیں۔

''بی جاناں! نواسی ہے آپ کی۔ سر پر ہاتھ پھیر دیں۔'' جواباً نانی نے مہر افزوں کو جھڑک کر خاموش کروا دیا تھا۔ مہر افزوں نے اسے اشارہ کیا تھا اور وہ اٹھ کر ان کے پیچھے آ گئی۔ اس گھر میں بے شمار عورتیں تھیں۔ اس کی پانچ بڑی ممانیاں' پانچوں سگی بہنیں تھیں اور بی جاناں کے بڑے پانچ بیٹوں سے بیاہی تھیں۔

اس کے تین بڑے ماموں خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ چوتھے نمبر والے سیاست پر قربان ہو چکے تھے۔ کسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انہیں گولی ماردی گئی تھی۔ پانچویں نمبر والے ماموں سینیٹ کے ممبر تھے۔ علاقے میں بڑا نام تھا' پہچان تھی۔ وہ ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ سب سے چھوٹے اورنگ زیب تھے۔ ان کا بھی سیاست میں عمل دخل تھا۔ ہمیشہ ازبک قبیلے والوں کے مخالفین کے سپورٹر رہے تھے۔

سوائے ایک ممانی کے باقی چاروں بہنیں بانجھ تھیں۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ عشق النساء کی بھی صرف چار بیٹیاں تھیں۔ گل زیبا' گل مالا' گیتی' گل افشاں۔

بی جاناں کو اس غم نے ادھ موا کر رکھا تھا کہ ان کی نسل کا نام اور پہچان ختم ہو جائے گی۔ اسی لیے انہوں نے دوران تعلیم ہی اورنگ زیب کی شادی کر دی تھی۔ چودہ سالہ مہر افزوں نے آتے ساتھ ہی انہیں پہلا پوتا دیا تھا۔ ایک سال بعد زردس چلا آیا تھا۔ پھر دو دو سال کے وقفے سے چھ بیٹیاں تھیں۔

اگلی بار جب ان کی فیملی ڈاکٹر نے پھر سے پوتے کی خوش خبری دی تو بی جاناں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ مگر زخام کو دیکھ کر ان کے دل کو دھچکا لگا۔ انہوں نے گائنی ڈاکٹر مسز کبیر الدین سے کہا۔

''تمہیں یاد تو ہے کہ یہ ہمارا ہی بچہ ہے؟''

''سو فیصد آپ کا بچہ ہے بہجت بیگم۔'' انہوں نے یقین دلایا تھا' مگر ننھا زخام' دادی کی فطری محبت سے محروم رہا تھا۔

✦*✦

پھر اس صبح پہلی مرتبہ روشی کو ماموں جان کا پیغام ملا۔ وہ حیران سی ملازمہ کی ہمراہی میں طویل کوریڈور عبور کر کے دوسرے حصے میں داخل ہو گئی تھی۔ کوریڈور کے آمنے سامنے بے شمار کمرے تھے۔

''یہ میر صاحب کا کمرہ ہے۔'' ملازمہ نے مؤدب لہجے میں کہا اور واپس چلی گئی۔ روشی نے دروازہ ناک کر کے ہینڈل گھمایا اور پھر اندر داخل ہوگئی۔ یہ بیڈ روم کسی سپر لگژری ماسٹر بیڈ روم سے کم نہیں تھا۔ سفید چمکتی دیواروں والا۔ اس کے پیروں کے تلوے بہت ہی نفیس اور امپورٹڈ کارپٹ کو محسوس کر رہے تھے۔ اتنا نفیس اور شان دار فرنیچر تھا۔ گولڈن اور وائٹ کلر نمایاں تھا۔ بیڈ پر بہت نرم اور آرام دہ میٹرس بچھا تھا۔ جس کے اوپر بیڈ شیٹ بھی کسی کے اعلیٰ ذوق کی نشاندہی کرتی تھی۔ فلور کشنز کے کور بھی سفید تھے۔ صوفہ بھی وائٹ کلر میں تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر سات' آٹھ قسم کے پرفیوم رکھے تھے۔ دائیں دیوار پر وونٹن کا اسپلٹ لگا تھا۔

رائٹنگ ٹیبل بھی ایک کونے میں رکھی تھی۔ جس کے اوپر دو کمپیوٹر لیپ ٹاپ اور بے شمار فائلیں پڑی تھیں۔ داہنی طرف دیوار میں بک ریک میں ڈھیروں کے حساب سے کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ اکیس انچ کا ٹی وی اور میوزک سسٹم بھی موجود تھا اور سب سے زیادہ روشانے کو متاثر کرنے والی سفید ہی امپورٹڈ فریم میں موجود اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی تصویریں تھیں۔ سفید' سرخ اور سیاہ ریشمی بالوں والے گھوڑے۔ وہ ایک ہی نظر میں پورے کمرے کا جائزہ لے چکی تھی۔

''بابا! اگر غور فکر کرلیا ہے تو ادھر بیٹھو۔'' اس کی سماعتوں میں اورنگ زیب خان کی آواز اتری۔ وہ کچھ خجل سی ہوکر صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ بیٹھتے ساتھ جوں ہی اس کی نگاہ اٹھی تو وہ گویا دنگ سی رہ گئی تھی۔ بیڈ سے کچھ فاصلے پر ریوالونگ چیئر رکھی تھی۔ جس پر میر ذکاء بیٹھا بڑی فرصت سے آنکھیں سکوڑے روشانے کو دیکھ رہا تھا۔

''آپ نے بلوایا تھا؟'' روشانے اپنے ازلی پُراعتماد لہجے میں بولی تھی۔ میر ذکاء کو دیکھ کر تو اس کے لب و لہجے میں اور بھی ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

''ہاں بابا! تم سے کچھ بات کرنا تھی۔'' وہ اخبار اور بائی فوکل گلاسز سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر سیدھے ہو گئے تھے۔ روشی نے دیکھا' وہ چھ فٹ کے اونچے اور صحت مند سراپا رکھنے والے بے حد وجیہہ آدمی تھے۔ ان کی آنکھوں کا رنگ بادامی تھا۔ نقوش بھی کھڑے کھڑے تھے جن میں سختی نمایاں تھی۔ میر ذکاء اپنے باپ کی ہوبہو کاپی تھا۔ انہوں نے سفید کاٹن کا لباس پہن رکھا تھا اور وہ بہت ہی تروتازہ اور فریش لگ رہے تھے۔ ان کے ساتھ مہر افزوں جیسی عورت ہی سجتی تھی' ان ہی جیسی باوقار' بردبار اور بہت بلند۔

''کون سی بات؟'' روشی چونک سی گئی۔

''کتنا پڑھی لکھی ہو۔'' اس سوال پر روشی اور بھی حیران ہوئی۔ تاہم اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اے لیول کیا ہے پھر......''

''پھر کیا......؟'' اب کہ اورنگ زیب خان نے چونک کر پوچھا۔

''پھر شادی ہوگئی۔''

''اوہو...... یہ تو بڑا سانحہ رونما ہوا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا؟'' میر ذکاء نے بھی خاموشی توڑ کر بڑی

دلچسپی سے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا۔'' وہ جز بز سی بولی۔ جی تو چاہ رہا تھا پٹاخ سے نہ کہہ دے' مگر یہ سوچ کر خاموش رہی تھی کہ نہ جانے کب اس خان زادے کا موڈ بدلے اور شائستگی کا چولا اتار پھینکے۔

''تمہیں یہاں کوئی شکایت تو نہیں کسی سے۔'' وہ بہت بے ضرر سے سوال کر رہے تھے۔ روشی نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

''مہر تمہارا خیال رکھتی ہے؟''

''جی!'' روشی دھیمی آواز میں بولی۔

''بی جاناں کے رویے پر رنجیدہ مت ہونا۔ ان کا مزاج ہی ایسا ہے۔'' وہ کچھ سوچ کر بولے تھے۔

''میں کسی کے رویے پر رنجیدہ نہیں ہوتی۔'' روشی کے لہجے میں عجیب سی چبھن تھی۔ میر ذکاء نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

''بابا جان! روشانے کو مبارکباد دیں نا۔'' اب وہ اٹھ کر باپ کے برابر بیٹھ گیا تھا۔ عجیب سے طنز کی کاٹ تھی اس کے لہجے میں۔

''بکواس مت کرو میرو!'' وہ ناراضی سے گویا ہوئے۔ ''روشانے ہماری بیٹی ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا۔ باقی جو بھی مخالفت' رنجشیں اور جھگڑے ہیں وہ سب ازبک قبیلے والوں کے ساتھ ہیں۔ ان کا روشی سے کوئی تعلق نہیں۔''

''اگر اتنی ہی پاپا کے ساتھ دشمنی تھی تو ان کی بیٹی کو بیاہ کر کیوں لائے ہیں؟'' وہ پوچھنا چاہتی تھی' مگر لب بھینچے خاموش بیٹھی رہی۔

''رباحت خان سے ہمارے سیاسی جھگڑے ہیں۔ زمین کے معاملوں کی وجہ سے مخالفت اور مقدمے بازی چل رہی ہے۔ احمد خان اور رباحت خان نے مجھ پر ناجائز قبضے کا کیس کیا تھا۔ اس کے فیصلے کی آخری تاریخ ستائیس ہے۔''

وہ گویا خود کلامی کر رہے تھے۔ ذکاء خان باہر چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد واپس جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

✦❋✦

اسے شانی سے بات کرنا تھی اور وہ میر ذکاء کے کمرے میں فون دیکھ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میر ذکاء اس وقت اپنے کمرے میں موجود نہیں ہوگا۔ اسی لیے کھانا کھائے بغیر دبے قدموں سے چلتی ہوئی راہداری سے بیرونی دروازے کی چٹخنی گرا کر باہر نکلنے لگی تھی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' یہ آواز گل زیبا کی تھی۔ روشی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''مم میں ......'' وہ ہکلا کر رہ گئی تھی۔ اگر وہ گل زیبا کو بتا دیتی کہ اپنی بہن سے بات کرنے جا رہی ہے تو

گل زیبا نے پورے عالم میں نشر کر دینا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس کے فون کرنے پر پابندی لگ جاتی۔ بی جاناں نے پہلے ہی حکم دے دیا تھا کہ روشی ازبک ہاؤس والوں سے کوئی تعلق نہیں رکھے گی اور ان کی دست راست عشق النساء بھی یہ ہی چاہتی تھیں۔ انہیں بھی روشی کا وجود کھٹکتا تھا۔

''مجھے میر نے بلوایا ہے۔''

''اچھا۔'' اس نے دیکھا' گل زیبا کے چہرے پر عجیب سی حسرت تھی۔

''جاؤ تم۔'' وہ کہہ کر ایک دم پلٹی اور اندھیری راہداری میں گم ہوگئی۔ روشی بے دھڑک ذکاء خان کے کمرے میں داخل ہوگئی تھی۔ مگر سامنے موجود زردس خان کو دیکھ کر گھبرا اٹھی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ خان کے کمرے میں کوئی اور بھی ہوسکتا ہے۔

''آؤ بھرجائی! رُک کیوں گئی ہو۔'' اس نے محسوس کیا تھا' زری خان کچھ گھبرا گیا ہے۔ حالانکہ گھبرانا تو روشی کو چاہیے تھا' مگر زری خان کی بوکھلاہٹ کی وجہ وہ جان نہیں سکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا۔ گلاس میں کوئی مشروب تھا اور وہ فوراً ہی کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ روشی اس کے باہر جاتے ہی بے قراری سے فون کی طرف لپکی' مگر دوسری طرف سے کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔ باہر سے کھٹکے کی آواز آئی تھی۔ روشی گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

''زہے نصیب۔ میں تو تمہیں بلوانے والا تھا۔ مگر لگتا ہے تم مجھ سے بھی زیادہ بے تاب ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کتنی بھلی لگتی تھی۔ روشی نظریں جھکائے شرمندہ سی کھڑی تھی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' وہ واش روم سے نہا کر آیا تھا۔ اس کے بالوں سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ وہ گم صم سی میکانکی انداز میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ میر ذکاء کے لیے کھانا آیا تھا۔

''تم کھا چکی ہو؟'' وہ گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''ہوں۔'' اس کی بھوک ایک دم ختم ہوگئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی شانی نے کال کیوں نہیں ریسیو کی؟

''کیا سوچ رہی ہو؟'' ذکاء خان نے اسے گم صم دیکھ کر پوچھا۔

''آپ مجھے کس چیز کی مبارک باد دینا چاہتے تھے؟''

''بھلے وقت میں یاد کروا دیا ہے۔'' وہ فروٹ سلاد کھاتے ہوئے مزے سے بولا۔

''تمہاری افریقن ممی سے ایک گفٹ ملا ہے تمہارے پاپا کو۔''

''کیسا گفٹ؟'' روشی کا دل دھڑکنے لگا۔

''تمہاری ایک بہن ہوئی ہے۔''

''کب......؟'' وہ چکرا کر رہ گئی تھی۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں کے متعلق بہت دھیان رہتا تھا انہیں۔

''ابھی کچھ دن پہلے...... ویسے ایک بات ہے' بچہ افریقن' امریکن عورت سے نہیں بلکہ خاندانی عورت سے

ہونا چاہیے۔'' وہ کھانا کھا چکا تھا۔ اب بہت سہولت سے روشی کے چہرے کے تاثرات پڑھنے میں مصروف تھا۔

''اونہہ ...... ایسی خاندانی عورت جو تمام عمر آپ کی باندی بن کر رہے۔ آپ کے بچے پیدا کرے۔ اطاعت کرے اور بدلے میں صرف ذلت اور نفرت ہی ملے اسے۔ آپ لوگ خاندانی عورتوں سے شادی اس لیے کرتے ہو کہ وہ روایتوں اور خاندان کی نام نہاد رسموں میں جکڑی ہوتی ہیں۔ تمام عمر زبان سیے رکھتی ہیں' جبکہ باہر کی عورتیں میری ممی کی طرح ذرا سی شراکت' بے وفائی کو دیکھتے ساتھ الگ ہو جاتی ہیں۔''

روشی نے زری خان کی سنہری باتوں کو ذہن میں محفوظ کر رکھا تھا اور اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ نہ ڈرے گی' نہ جھکے گی چاہے مقابل ذکاء خان ہو یا بہجت بیگم۔

''تم تو سمجھ داری کی باتیں بھی کرتی ہو۔'' ذکاء خان حیران ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چھپی شرارت بتا رہی تھی کہ یہ حیرانی مصنوعی ہے۔

اس کا موڈ خوش گوار تھا اور مردوں کے موڈ کس وقت خوش گوار ہوتے ہیں۔ روشانے جان چکی تھی۔ وہ اس گھر کے ہر فرد کو اچھی طرح سے جان چکی تھی۔ میر ذکاء اپنی ذات کے غرور اور زعم میں مبتلا تھا۔

اورنگ زیب خان کو جاگیروں اور جائیدادوں کو وسیع کرنے کا خبط تھا۔ اسی وجہ سے روشانے یہاں موجود تھی۔

بہجت بیگم کو دوسروں پر فیصلے ٹھونسنے اور حکمرانی کی عادت تھی۔ عشق النساء کو بیٹیاں دیکھ دیکھ کر ہول اٹھتے تھے۔ وہ ان کی شادیوں اور بڑھتی عمر کی وجہ سے پریشان تھیں۔ باقی چاروں ممانیوں کی اپنی مصروفیات تھیں۔ نمازیں پڑھنا' وظیفے کرنا اور سلائی کڑھائی کرنا۔ وہ دنیا سے اور دنیا کے جھمیلوں سے الگ ہو گئی تھیں۔

پھر مہر افروز تھیں۔ خاموش' غمگین' تابعدار۔ عشق النساء کی بیٹیاں تھیں۔ ہر وقت شعلے اگلتی رہتیں۔ کبھی شبنم کی طرح برسنے لگتیں۔ گل اشفاں بھی پینتیس سے اوپر کی ہو رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں ناکام خواہشوں کے نوکیلے کانچ چبھتے رہتے تھے۔ عشق النساء کو یہ غم تھا کہ گھر کا ایک لڑکا روشی کو لے آیا ہے۔ دوسرے سے بھی کوئی امید نہیں تھی۔ انہوں نے اچھے رشتوں کے انتظار میں بیٹیوں کو ایب نارمل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اور روشی کو لگتا تھا کہ وہ اتنے ایب نارمل لوگوں میں کیسے نارمل رہ سکے گی۔ وہ شانی جتنی حساس نہیں تھی مگر وہ ان دنوں حد درجہ حساس ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ خود ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ ایک ماں کے درد کو جاننا اب اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اسے مہر افروز اور عشق النساء کی آنکھوں کا درد بے چین کیے رکھتا تھا۔

اگر اس کے ہاں بیٹی ہوئی تو کیا وہ بھی اتنی ہی بے بس اور مجبور ہو گی۔ وہ شدت سے دعا کرتی تھی کہ اس کے ہاں بیٹی نہ ہو۔

✦❋✦

پورے آٹھ ماہ ہو گئے تھے، مگر وہ ایک مرتبہ بھی ''ازبک ہاؤس'' جا نہیں سکی تھی۔ اسے جانے ہی نہیں دیا گیا تھا۔ پھر ایک دن شانی کا فون آیا۔ وہ اس وقت میر ذکاء کے کمرے میں تھی۔ شانی کی آواز سن کر وہ چیخ اٹھی۔

''کہاں ہو تم؟ تمہاری شادی کی تھی۔ بیچا نہیں تھا۔'' جواباً شانی بھی کافی غصے سے بولی۔

''میں نے اتنی مرتبہ فون کیا' مگر کوئی ریسیو نہیں کرتا۔ جب بھی ذکاء بھائی آتے ہیں اتنا اصرار کرتی ہوں کہ تمہیں بھی لے کر آئیں' مگر مجال ہے جو انہوں نے وعدہ ایفا کیا ہو۔''

''ذکاء خان وہاں جاتے ہیں؟'' وہ حیران سی بولی۔

''تو اور کیا۔ کئی مرتبہ آئے ہیں۔ ویسے گل بخت کو بتا رہے تھے کہ تمہیں وہ ڈلیوری کے لیے ادھر چھوڑ کر جائیں گے۔ کب تک آؤ گی؟''

''پتا نہیں۔'' وہ تو حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ نہ جانے اس بندے کے کتنے رنگ تھے۔

''روشی! سن رہی ہو۔'' شانی گھبرا کر بولی۔

''ہاں سن رہی ہوں۔'' اس نے گہرا سانس خارج کیا۔

''وہ رفیقن چلی گئی ہے۔'' شانی نے بتایا۔

''کیوں......؟'' آج تو حیران ہونے کا دن تھا۔

''پتا نہیں۔ یہ تو پاپا کو معلوم ہو گا۔ دادی نے اس کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا۔ شاید اسی لیے دلبرداشتہ ہو کر چلی گئی ہے۔'' شانی نے لاپروائی سے بتایا۔

''اور اس کی بچی؟''

''یہیں ہے اس کے لیے گورنس کا انتظام ہو چکا ہے۔ اس کا نام علیزے رکھا گیا ہے اور وہ پتا ہے کیسی ہے؟''

''کیسی ہے؟'' روشی نے حیرت سے کہا۔

''ڈولن جیسی۔''

''تو اپنی ماں پر ہی ہے نا۔'' روشی ہنس پڑی۔

''دادی کو بڑا غم تھا انہوں نے بڑی کوشش کی تھی کہ ڈولن علیزے کو لے جائے' مگر پاپا کو یہ گوارا نہیں تھا۔'' انکشافات اسے حیران کر رہے تھے۔

''تایا جی بیمار ہیں۔'' اب اس نے رباحت خان کی بیماری کے متعلق بتایا۔ وہ ایک دم ہی سب سے ملنے کو بے قرار ہو گئی تھی۔ تایا جی' پاپا' دادی' دادا۔ گل بخت' اثمر اور اشنان۔ اس کی پیاری بہن علیزے۔

''ممی کا فون آتا ہے؟'' روشی نے پوچھا۔
''نہیں اور اب وہ ہماری ممی نہیں ہیں۔'' شانی نے کافی کٹیلے لہجے میں کہا تھا اور روشی اس کی آواز سن کر کس قدر مسرور تھی۔ کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔

✦❋✦

میر ذکاء نے اسے ایبٹ آباد جانے کا سندیسہ سنا کر خوش گوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ خوش تھی اور اس کی ساری نندیں اداس۔

''ازبک ہاؤس'' ویسا ہی تھا' جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ ہاں وہ خود بدل چکی تھی۔ اب وہ خواب بھی دیکھنے لگی تھی۔ سنہری' خوشنما خواب۔ اپنے ہونے والے بچے کے متعلق۔ شانی اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔
''کتنی موٹی اور خوب صورت ہو رہی ہو روشی!''
''کہاں اتنی عجیب تو لگتی ہوں۔'' وہ شرمائی شرمائی تھی۔ اثمر اور اشان کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ کتنے بڑے ہو گئے تھے۔ احمد صاحب نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس کا حال احوال پوچھا۔
وہ علیزے کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ وہ واقعی ڈولن جیسی تھی۔ سیاہ رنگت' چپٹی سی ناک' سفید بے بی بیڈ پر لیٹی وہ اور بھی کالی لگ رہی تھی' مگر جب وہ روشی کو دیکھ کر مسکرائی تو روشی کو اس پر ٹوٹ پر پیار آ گیا۔ اس نے بے اختیار علیزے کو گود میں اٹھا کر گدگدایا۔
احمد صاحب نے علیزے کو کبھی ایک نظر دیکھا تک نہیں تھا۔ روشی اور شانی کا احوال تو وہ پوچھ ہی لیتے تھے۔ جب وہ دونوں چھوٹی تھیں تب پاپا انہیں بلا کر پیار بھی کر لیتے تھے۔ باہر سے آتے تو ان کے لیے ڈھیروں کھلونے لاتے۔ کبھی کبھی سکول بھی چلے جاتے۔
مگر علیزے بے چاری کیسی بدقسمت تھی' جسے باپ نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ جو اسے دنیا میں لانے کا سبب بنے تھے' اب ایسے ہی بے خبر تھے گویا کوئی علیزے ان کی بیٹی تھی ہی نہیں۔ وہ گورنس کے رحم و کرم پر تھی۔ البتہ گل بخت بچی کی نگرانی کرتی تھی۔ اس کی دیکھ بھال کی طرف طرف دھیان دیتی۔ وہ بلاشبہ اچھی لڑکی تھی اور احمد صاحب بیویوں کے معاملے میں کافی خوش قسمت تھے۔
دادی' روشی کی آمد سن کر گوٹھ سے آ گئی تھیں۔ وہ اس کے صدقے واری جا رہی تھیں۔ وہ اسے اولادِ نرینہ کی دعائیں دے رہی تھیں۔
''دادی! ایک بات پوچھوں؟''
دادی رات کو اس کے پاس سونے کی غرض سے آ گئی تھیں۔ دادی کا خیال تھا روشی کو اس حالت میں تنہا نہیں رہنا چاہیے۔
''پوچھ اجازت کیوں لیتی ہے؟'' وہ ان دنوں کچھ زیادہ ہی روشی پر مہربان تھیں۔

''دادی! بہجت بیگم میری سگی نانی ہیں؟''

''تو اور کیا۔'' دادی چمک کر بولیں۔

''کہیں اس نے تیرے خلاف محاذ تو نہیں کھول لیا۔ اگر ایسی بات ہے تو بتانا مجھے۔ کھال ادھیڑ دوں گی بڑھیا کی۔'' دادی اپنے بھاری سراپے کے ساتھ جلاد ہی معلوم ہوتی تھیں۔

''دادی! آپ نے میری شادی ذکاء خان سے کیوں کی تھی؟''

''کیا تو خوش نہیں ہے؟'' دادی الٹا فکرمندی سے بولیں۔

''ایسی بات نہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔'' اس نے جھنجھلا کر انہیں یقین دلانا چاہا۔ ''میرے سوال کا جواب دیں۔''

''تیری ماں مشیرہ کو میں بہو بنانا نہیں چاہتی تھی۔ ہر ماں کی طرح میرا بھی دل کرتا تھا کہ بہو چندے آفتاب ہو۔ جس طرح میں مشیرہ کو ناپسند کرتی تھی اسی طرح بہجت بھی بیٹی سے خار کھاتی تھی۔ کوئی ماں اپنی اولاد سے اور بھی اکلوتی بیٹی سے ایسا سلوک نہیں کرسکتی تھی، مگر بہجت اسے بہت مارا کرتی تھی۔ ہر وقت سے بدصورتی کے طعنے دیتی۔ مشیرہ سے کہتی کہ وہ تو باپ کی دہلیز پر بوڑھی ہو جائے گی، مگر تجھے کوئی بیاہنے نہیں آئے گا۔ ایسے حالات دیکھ کر مشیرہ نفسیاتی مریضہ بنتی جا رہی تھی۔

پھر ایک دن بہجت نے مشیرہ کو بہت مارا۔ صرف اس وجہ سے کہ اس کا بھانجا کسی طوائف کو بیاہ لایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مشیرہ کو اپنے بھانجے کے پلے باندھ دے گی۔ اسی رات مشیرہ اپنی ملازمہ کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ وہ سیدھی اپنے تایا کے گھر یعنی ہمارے پاس آئی تھی۔ بہجت بیگم کو خبر ہوئی تو اس نے اس بات کو انا اور اپنی ضد بنا لیا۔ اس نے بیٹی کی شکل نہ دیکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔ بدنامی جو ہوئی وہ تو الگ بات تھی۔ تمہارے دادا نے زبردستی احمد کا نکاح پڑھا دیا تھا۔ پھر تم دونوں ہو گئیں۔ ایک رات مشیرہ سوئی تو پھر اٹھ ہی نہ سکی۔ بہجت بیگم نے ہم پر الزام لگا دیا کہ اس کی بیٹی کو قتل کیا گیا ہے۔''

دادی کے انکشاف نے اسے سن کر دیا تھا۔ یہ کیسے رشتے تھے کیسے لوگ تھے؟

''مگر ذکاء خان تو کہتا ہے کہ مما کو پاپا نے قتل کیا ہے۔''

''غلط کہتا ہے اور یہ سارا خناس بھی بہجت نے اس کے دماغ میں بھرا ہوگا۔ بڑی چالباز عورت ہے۔ خرانٹ اور مکار وہ عورت نہیں پتھر ہے۔ تب ہی تو نفسیاتی مریضہ بن چکی ہے۔''

دادی نے تنفر سے کہا۔

''آپ نے ایسے لوگوں میں میری شادی کیوں کی؟''

وہ شکوہ کناں ہوئی۔

''یہ فیصلہ قبیلے والوں کا تھا۔''

''کیا مطلب ......؟''

وہ چونک اٹھی۔

''مشیرہ کے مرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس وقت ذکاء کے دادا کی بڑی بات تھی۔ مشیرہ کے بھاگ آنے کے بعد درانی قبیلے والوں کے ساتھ سب کی ہمدردیاں تھیں۔ سو یہ فیصلہ ہوا کہ احمد خان نے ان کی بیٹی کو ورغلایا ہے سو اسے بدلے میں بیٹی ضرور دینی ہوگی۔''

''ہوں۔'' روشی نے ہنکارا بھرا۔ ''تب ہی تو اس کی حیثیت وہاں کھوٹے سکے جتنی تھی۔''

ولیمہ کی دوسری شب اگرچہ میر ذکاء نے اپنے گزشتہ رویے کی روشی سے معذرت کی تھی۔ شاید وہ اس کے حسن جہاں سوز اور معصومیت کے سامنے سرنگوں ہوگیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی پھوپھی کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ روشی نے پوچھا تو وہ لاپروائی سے بولا تھا۔

''انیس سال پہلے جو کچھ ہوا اس سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ پھر جس نے جو بویا وہ ہی کاٹا ہے۔ اس قصے پر گرد پڑ چکی ہے اور محض بوگس کہانی ہے۔ یہ سب جھوٹی داستانیں ہیں۔ بی جاناں غلط کہتی ہیں۔''

اپنے دھیان میں مگن اس نے اعتراف کرلیا تھا کہ بہجت بیگم نے ہی اسے پرانے قصے سنا سنا کر آگ بگولا کیا تھا۔

✦✻✦

اسی شام روشی کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی تھی۔ وہ اپنی پہلی بیٹی کو دیکھ کر آنسو نہیں بہانا چاہتی تھی' مگر نہ جانے کیوں اس کا دل کسی گہری کھائی میں گر رہا تھا۔ گل بخت بہت خوش تھی اور اس کے لیے اولاد نرینہ کی دعائیں مانگتی' دادی بھی خوش تھیں۔

''بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں۔ دل چھوٹا مت کرو۔ اگلی بار سہی۔'' دادی کے دلاسوں سے وہ بہل گئی تھی۔ گل بخت نے ڈھیروں مٹھائی تقسیم کی تھی۔ خیرات کی تھی اور گاؤں سے مہر افزوں' میر ذکاء کے ساتھ آئی تھیں۔ روشی نے دیکھا' ان کی آنکھیں نم تھیں اور انہوں نے گلابی کمبل میں لپٹی بچی کو سینے سے لگا کر کہا۔

''مولا! ایک اور بدقسمت بیٹی کو ان پہاڑی لوگوں کے گھر میں بھیج دیا ہے۔''

ذکاء خان کچھ دیر کے لیے رکا تھا' پھر چلا گیا۔ البتہ مما اس کے پاس رک گئی تھیں۔ وہ روشی سے خنیا اور ماوئی کی طرح پیار کرتی تھیں۔ جب وہ اپنی بیٹی کے ہمراہ گاؤں جا رہی تھی تب بہت اداس تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی بیٹی حبہ بھی خنیا اور ماوئی کے برابر کھڑی ہونے والی ہے۔

✦✻✦

ذکاء خان نے حبہ کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا' نہ غم تھا۔ وہ ان دنوں بس روشی کے وجود میں کھویا ہوا تھا۔ وہ ماں بننے کے بعد اور بھی خوب صورت ہوگئی تھی۔ کئی مرتبہ روشی نے ذکاء خان سے خلوت کے لمحات میں پوچھا تھا۔

''آپ کو مجھ سے کتنی محبت ہے؟''

''محبت۔'' ذکاء خان نے گویا ہنسی اڑائی تھی۔

''محبت کیا ہوتی ہے؟'' وہ الٹا اس سے پوچھ رہا تھا اور روشی کے سینے میں ایک چھناکے سے کچھ ٹوٹ گیا۔

''اور زری خان کہتا تھا۔ اس آدمی کے سامنے جھکنا مت۔ وہ اسے کیا بتاتی عورت' معتبر مرد کی محبت اور اعتماد سے ہوتی ہے۔

زرعی خان اسے اپنے بھائی کی سرگرمیوں کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔

ذکاء خان کی خواب گاہ اب بھی الگ تھی۔ حسب ضرورت اسے بلوایا جاتا تھا۔ یہاں پر مردوں اور عورتوں کے الگ الگ بیڈ رومز کا رواج تھا۔ جب بھی وہ میر ذکاء خان کے کمرے کی طرف جانے لگتی تو گویا پاؤں من من بھر کے ہو جاتے تھے۔

حبہ ابھی صرف دو ماہ کی تھی جب وہ پھر سے حاملہ ہوگئی۔ مما بہت خوش تھیں۔ چاروں ممانیوں نے بھی مبارکباد دی تھی۔ وہ ان کی مبارک بادیں وصول کرتی جھینپ رہی تھی۔

''بھلا ابھی سے مبارک باد کا یہ سلسلہ کیوں؟'' وہ حیران تھی۔ مما نے اس کی حیرت دور کی۔

''ہمارے خاندان میں زیادہ عورتیں بانجھ ہیں۔ صاحب اولاد ہونا بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ تم دعا کیا کرو اللہ صحت مند اولاد سے نوازے۔ عورت بال بچوں کے ساتھ بھری بھری اور آباد رہتی ہے۔''

''چاہے اندر سے ٹوٹی پھوٹی اور ریزہ ریزہ کیوں نہ ہو۔'' زری خان نے اسے بتایا تھا رات کو میر ذکاء پھر سے کسی چاہنے والی کے ہمراہ تھا۔

روشی اس سے نفرت کرنا چاہتی تھی' مگر دل کے کسی گوشے میں اس سے محبت بھی تھی۔

✦✻✦

جیلی اپنے گیارہ ماہ کے بچے کو اٹھائے تیز تیز چل رہی تھی۔ موسم کے تیور بہت خطرناک تھے اور وہ بارش برسنے سے پہلے پہلے اپنے فلیٹ میں پہنچنا چاہتی تھی۔

اس کا بچہ ایک معمولی سے کلینک میں پیدا ہوا تھا۔ ممی نے بچے کو فیمان کا نام دیا تھا۔ اب وہ ان دونوں کے لیے فیمی تھا۔

جیلی ان دنوں پھر سے فارغ تھی اور کام کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ آج وہ بچے کو ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے لائی تھی۔ فیمی شاید دانت نکال رہا تھا۔ وہ بہت چڑچڑا اور بدمزاج ہو رہا تھا۔

روڈ کراس کرتے ہوئے یکدم اس کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ دور تک پھسلتی چلی گئی۔ اسی اثنا میں ایک گاڑی کے بونٹ سے اس کا سر ٹکرایا تھا۔ فیمی اچھل کر فٹ پاتھ پر جا گرا اور جیلی کا ذہن تاریکی میں گم ہو گیا تھا۔

ولی اس افتاد پر بوکھلا کر گاڑی سے باہر نکلا تھا۔ وہ ان دنوں جس ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اس سے کسی بھی حادثے کی توقع کی جاسکتی تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے جیلی اور اس کے بچے کو گاڑی میں اٹھا کر ڈالا اور دوسرے ہی پل تیز رفتاری سے گاڑی اڑاتا اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ اس کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر تھا سو وہ بآسانی جیلی اور بچے کو اٹھا کر اندر لے آیا تھا۔

جیلی کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا' جبکہ بچے نے پورے راستے حلق پھاڑ پھاڑ کر چلانے اور رونے کا فریضہ بخوبی نبھایا تھا۔ ولی نے پہلے بچے کا بغور جائزہ لیا تھا کہ شاید اسے چوٹ لگی ہو' مگر بچہ خوف کی وجہ سے رو رہا تھا۔ جیلی کے بینڈیج کے دوران بھی بچہ مسلسل روتا رہا تھا۔ کچھ سوچ کر ولی قریبی سٹور سے فیڈر خرید لایا تھا۔ پھر اس نے جلدی سے دودھ ڈال کر فیڈر بچے کے منہ میں ٹھونسا ہی تھا کہ بچہ پُرسکون ہو کر دودھ پینے لگا۔ گویا وہ تکلیف سے نہیں بلکہ بھوک کی وجہ سے بلبلا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد بچہ گہری نیند سو گیا تھا۔

پھر اس نے ڈاکٹر کو فون کیا تھا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر جیلی کو انجکشن لگانے کے بعد دوائیوں کا نسخہ لکھ کر دے گیا تھا۔
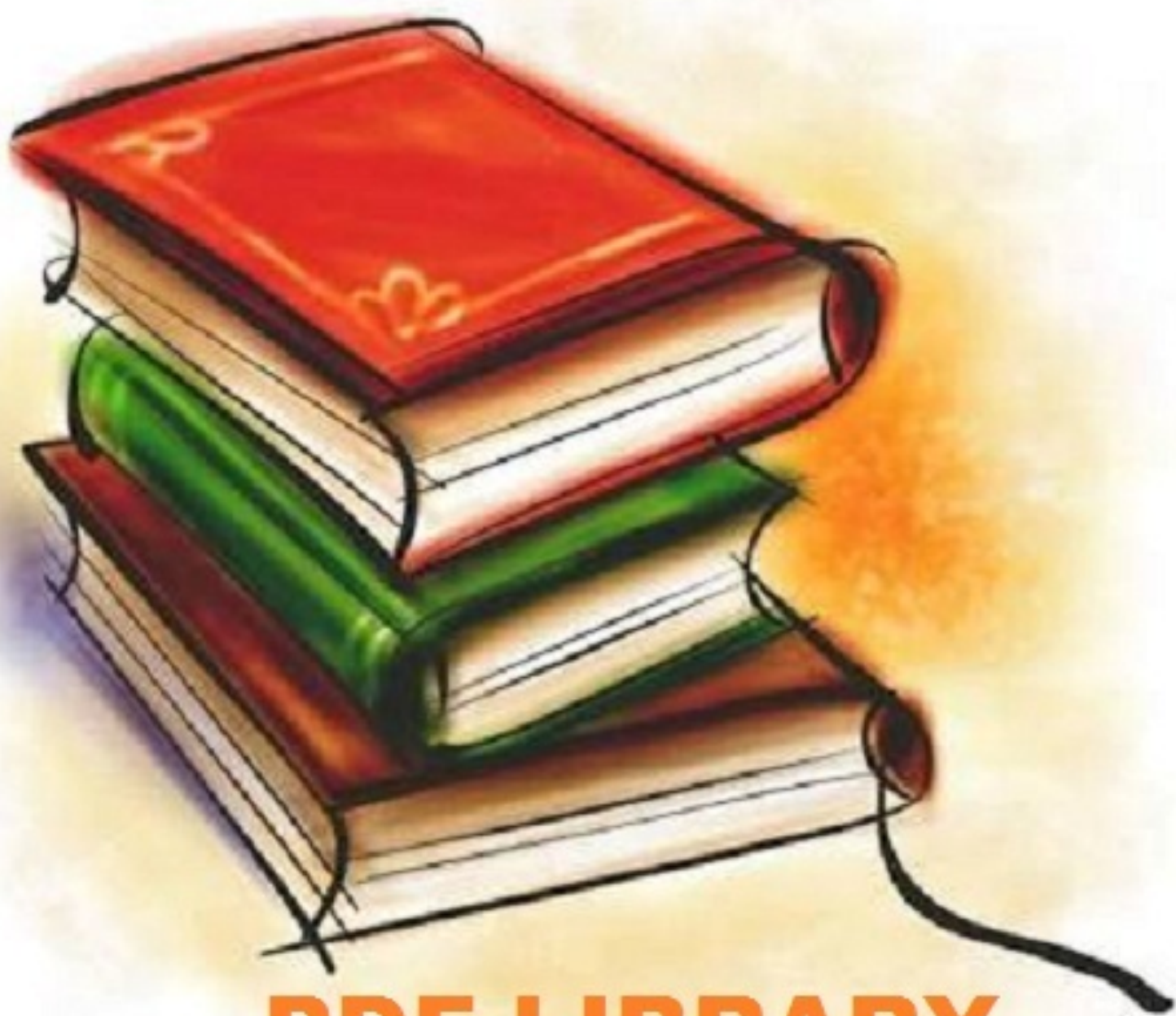
جیلی ہوش میں آنے کے بعد ولی کو سامنے پا کر ششدر رہ گئی تھی۔ ولی نے مختصراً اسے اس حادثے کے متعلق بتایا تھا۔

پھر وہ اسے اپنی گاڑی میں گھر تک چھوڑ کر آیا۔ راستے میں ایک سٹور سے اس نے بہت سے جوس کے ڈبے' دودھ' بسکٹ' جیم' جیلی اور ہنی کے جار خریدے' بچے کی ضرورت کی دیگر چیزیں بھی تھیں اور جیلی کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔

راستے میں ولی نے جیلی سے پوچھا۔

''جاب مل گئی ہے تمہیں؟'' وہ محض اپنا دھیان بٹانا چاہتا تھا۔

''نہیں۔''

''کیا کرتی ہو اب؟'' وہ سر جھٹکتے ہوئے کہنے لگا۔ گویا کسی تکلیف دہ سوچ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

''فارغ ہوں۔'' جیلی مختصر بولی۔

''بچے کا خرچ کہاں سے پورا کرتی ہو؟''

''میں نے اپنے علاقے میں سویپر کی جاب کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' وہ اپنا ارادہ ظاہر کر رہی تھی۔

''اتنا غلیظ کام......''

''تو کیا کروں؟ کہاں سے اخراجات پورے کروں؟ ممی کی دوائیں' بچے کے لیے دودھ اور فلیٹ کا کرایہ۔'' جیلی گویا پھٹ پڑی۔

''اس سے بہتر کوئی کام نہیں؟''

''کسی گورنر کے گھر میں میڈ کی جاب مل سکتی ہے' مگر اس کے لیے بھی سفارش کی ضرورت ہوگی۔'' وہ تلخی سے کہنے لگی۔

''گورنر تو نہیں میں ایک معمولی سا آرکیٹیکٹ ہوں۔ تم میرے ہاں کام کرسکتی ہو' مگر ٹائمنگ میری مرضی کے مطابق ہوگی۔ تم چاہو تو بچے کو ساتھ لے کر آسکتی ہو۔''

وہ اپنے فلیٹ کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی' جب ولی نے اپنی بات مکمل کر کے بغیر جواب سنے پلٹ کر گاڑی سٹارٹ کرلی تھی' جبکہ جیلی کو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ وہ خوشی سے چلاتے ہوئے ممی' ممی پکارتی اندر داخل ہوئی۔ فیمی کو اس نے فرش پر اتار دیا تھا اور خود ماں کے قریب چلی آئی۔

''کیا ہوا ہے؟ کیوں چلا رہی ہو؟'' ممی کی نیند ڈسٹرب ہوچکی تھی۔

''ممی! مجھے کام مل گیا۔'' وہ خوشی سے چہکی۔

''یہ کوئی نئی بات نہیں۔ دوسرے دن پھر سے فارغ بیٹھی ہوگی۔'' ممی نے گویا مذاق اڑایا۔

''اب ایسا نہیں ہوگا۔''

''کیوں یو این میں کام مل گیا ہے۔'' ممی کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''ممی کی نظریں اب بڑے بڑے لفافوں پر تھیں۔

''یہ کہاں سے لائی ہو؟'' ممی کا تجسس عروج پر تھا۔

''ولی نے لے کر دیا ہے۔''

''او...... ولی نے۔'' ممی کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔

''جیلی! کہاں کھو گئی ہو؟ کیا اس پاکستانی کو سوچ رہی ہو؟ ویسے ایک بات کہوں' یہ پاکی سارے بڑے ہی کھلے دل اور کھلے ہاتھ کے ہیں۔ وہ پہلے والا بھی بڑے کھلے دل کا مالک تھا اور اب یہ ولی...... ممی اب بسکٹ کا

پیکٹ کھول کر مزے سے کھانے لگی۔
''یہ سب سے مختلف ہے۔'' وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔
''اچھا ہے' واقعی اچھا ہے۔ تم اس کے بارے میں ضرور سوچو۔'' ممی سر دھن رہی تھی۔ جیلی ماں کی بات کو سمجھتی جلتی کلستی اٹھ گئی۔

✦❃✦

دوسرے دن وہ ولی کے بتائے وقت کے مطابق آ گئی تھی۔ فیمی کو اس نے ممی کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ ولی نے اسے کام بتا دیا جو کہ جیلی کے لیے قطعاً مشکل نہیں تھا۔ جیلی نے محسوس کیا تھا ولی بہت الجھا الجھا اور اداس ہے۔ اس کی آنکھیں رتجگوں کے سرخی لیے ہوتی تھیں۔ تو کیا اس کا محسن رات بھر روتا ہے؟
جیلی اس کی شکستگی اور انجانا سا درد اپنے دل میں محسوس کرنے لگی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اس کا کام ختم ہو جاتا تھا اور وہ ولی کی موجودگی میں ہی گھبرا جاتی تھی۔ ولی اس سے زیادہ مخاطب نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے آپ میں گم رہتا تھا۔ ایک دن کچھ ڈرتے ڈرتے جیلی نے پوچھ ہی لیا۔
''تم کب جاؤ گے اپنے وطن؟''
''شاید کبھی نہیں۔'' ولی نے چونک کر جواب دیا تھا۔ اس کے لہجے میں کون سے دکھ بول رہے تھے' جیلی سمجھ نہیں پائی تھی۔
''کبھی بھی نہیں؟'' جیلی نے نہ جانے کون سی یقین دہانی چاہی تھی۔
''ہاں' کبھی نہیں تم فکر مت کرو۔'' وہ شاید مسکرایا تھا۔ کیسی زخمی سی مسکراہٹ تھی۔ جیلی کے دل کو کچھ ہونے لگا۔
اسے یہاں آئے ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ اپنے کام سے مطمئن تھی۔ یہاں کسی کی حریص نظروں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ ساری فکریں بھلائے پہلی مرتبہ دلی سکون محسوس کر رہی تھی اور ان ہی دنوں ولی کا بھائی صمیم پاکستان سے آ گیا تھا۔ وہ بھی ولی کی طرح تھا۔ بے حد خاموش اور کسی الجھن میں مبتلا۔ وہ سارا سارا دن اپنی مقامی زبان میں ولی کو نہ جانے کیا کیا سمجھاتا رہتا تھا۔
صمیم پورے تین ہفتے رہا تھا۔ اس دوران جیلی کو دگنا کام کرنا پڑتا تھا۔ اب وہ ولی کے لیے کھانا بھی بناتی تھی۔ وہ بہت اچھی کوکنگ کرتی تھی۔ ولی کو اس کی کوکنگ پسند تھی اور اس کا بھائی صمیم بھی کھانے کی تعریف کرتا تھا اور اکثر اس کے نام کے حوالے سے چھیڑتا۔
''تمہارا نام لیتے ہوئے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔' ولی کے گھورنے پر بھی وہ باز نہیں آتا تھا۔
''کیوں......؟''
''یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسٹرابیری' چیری یا بنانا جیلی کا نام لیا گیا ہے اور اب میں اسے ٹرائفل کے ساتھ

کھانے والا ہوں۔''

صمیم مزے سے کہتا تو جلی ہنس پڑتی۔ وہ بہت فرینڈلی نیچر کا تھا۔ اس لیے اس نے جلد ہی جیلی کے ساتھ دوستی گانٹھ لی۔ ولی آفس چلا جاتا تھا اور جانے سے پہلے ڈھیروں آفس ورک صامی کے حوالے کر جاتا۔ اس کے جانے کے بعد صامی جلتا کلستا فائلوں میں سر کھپانے لگتا۔

ان ہی دنوں جیلی کو موسمی بخار نے گھیر لیا تھا۔ وہ بغیر بتائے تین دن کام پر نہیں آ سکی تھی۔ چوتھے دن وہ شرمندہ شرمندہ سی ولی کے سامنے تھی۔

''تم اتنے دن کہاں غائب رہی ہو؟''

''مجھے فیور تھا۔''

''اب ٹھیک ہو؟''

''پہلے سے بہتر ہوں۔'' وہ لاؤنج میں بکھرا پھیلا واسمیٹنے لگی۔

''تمہارا بچہ بھی ٹھیک ہے؟''

''ہوں۔''

''کس کے پاس چھوڑ آتی ہو؟''

''ممی کے پاس۔''

ولی کے مسلسل سوالوں پر وہ حیران ہو رہی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ اس سے اتنی طویل گفتگو کر رہا تھا۔

''تم اسے ساتھ لے آیا کرو۔'' وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ وہ فطرتاً نرم مزاج تھا۔

''وہ اب چلنے لگا ہے۔ ہر چیز کو چھیڑنے کی کوشش کرتا ہے۔''

''یہ تجسس کی عمر ہے۔ وہ سیکھنے اور سمجھنے کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اسے باہر لے کر آیا کرو۔ ایک جگہ قید رکھو گی تو بچے پر جمود طاری ہو جائے گا۔ وہ ہنگامے اور شور سے گھبرائے گا۔ اسے تفریح کے لیے پارک لے جایا کرو تاکہ اپنے ہم عمر بچوں کو دیکھ کر اسے زندگی کا احساس ہو۔'' وہ کتنی پُرامید گفتگو کرتا تھا۔ کتنا نرم اس کا لہجہ تھا۔ کتنی خوب صورت آواز تھی۔

✦❋✦

''تم اسے کھلی چھوٹ دے کر کہاں چلی گئی ہو بھرجائی!'' زری خان کی آواز میں افسردگی تھی۔ وہ اندر ہی اندر کھلتا جا رہا تھا اور روشی جانتی تھی کہ اسے کون کون سے صدمے لاحق تھے۔ کس کس کا دکھ اسے اندر سے کھوکھلا رہا تھا۔ باپ کی لاپروائی، ماں کی بے بسی، بہنوں کے غم اور اب اس بھرجائی کی زندگی کے اندھیرے۔

اسی شام روشی نے اپنے دوسرے بچے کو جنم دیا تھا۔ مما کی، دادی اور اس کی اپنی پچھلے پہر میں مانگی گئی دعائیں قبولیت کا درجہ پا گئی تھیں۔ اس کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ سرخ و سفید گول گوتھنا سا بچہ حبہ کی طرح دکھائی دیتا

تھا۔ صحت مند اور خوب صورت۔

گاؤں سے گاڑی بھر کر آئی تھی۔ اتنے ڈھیر سارے فروٹس' مٹھائی کے ٹوکروں سمیت۔ مما' ساری ممانیاں' گل زیبا' گل مالا' گیتی بھی ضد کر کے آ گئی تھی۔ حبہ اپنی دادی کی گود میں چڑھی تھی۔ بچہ باری باری سب کی گود میں منتقل ہو رہا تھا۔

روشی کو گیتی نے بتایا تھا کہ ذکاء خان بہت خوش ہے۔ بیٹے کی خوشی میں تین دن تک فائرنگ ہوتی رہی تھی۔ دعوتیں ہو رہی تھیں۔ گیسٹ ہاؤس مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔

احمد صاحب بھی بہت خوش تھے۔ انہوں نے بچے کی شاپنگ کے لئے روشی کو خطیر رقم کا چیک دیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو اس گھٹے گھٹے ماحول میں ہر آسائش فراہم کرنا چاہتی تھی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتی تھی۔ یہ چھوٹے چھوٹے خواب زندگی میں کچھ نئے پن کا احساس دلا رہے تھے۔ نئے جذبے اور امنگ پیدا ہو رہی تھی۔ اس کی زندگی جو جمود کا شکار ہوتی جا رہی تھی اب یہ جمود ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ بچوں کے لیے جینا چاہتی تھی۔

پاپا کو نہ جانے کیسے اس کی خواہشات کی خبر ہو گئی تھی۔ انہوں نے بچوں کے لیے گاڑی بھر کر سامان بھجوا دیا تھا اور روشی نے سارا سامان اپنے کمرے میں سیٹ کر لیا تھا۔

مگر وہ اپنے اس سجے سجائے کمرے میں ایک رات بھی نہیں سو پائی تھی۔ بچوں کو آیا کے حوالے کر کے اسے روزانہ ہی میر ذکاء کی بات سننے جانا پڑتا تھا۔ بات کا تو صرف بہانہ ہوا کرتا تھا۔ اسے میر ذکاء کا دل بہلانے کے لیے ہی تو لایا گیا تھا ورنہ روشانے خان کا یہاں آنے کا مقصد ہی کیا تھا؟ اور پھر کچھ ہی مہینوں بعد وہ میر ذکاء حیات خان کے تیسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

✦❀✦

زری خان نہ جانے کہاں گیا تھا؟ اس نے بھتیجے کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو ایک اور بچہ روشی کی گود میں تھا۔ وہ حنان کو بغیر دیکھے بولا۔

''تم بھی ان عورتوں جیسی ہوتی جا رہی ہو۔ میں سوچ رہا تھا تم کوئی انقلاب لاؤ گی' مگر تم بھی ......'' وہ لب بھینچے خاموش رہ گیا۔

''کیسا انقلاب لا سکتی ہوں۔ میرے اختیار کی حدیں کیا ہیں؟'' وہ سلگ کر بولی۔

''کیا کرے گا یہ سردار میر ذکا؟ طلاق وہ تمہیں کبھی نہیں دے گا ورنہ سرداری سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور یہ جاہ جلال' یہ رعب دبدبہ ...... یہ حشمت اور عزت چھن جائے' یہ سردار صاحب کو گوارا نہیں۔ ہمارے ہاں خاندانی عورت کو کبھی طلاق نہیں دی جاتی۔ پھر تمہیں کیا خوف ہے؟''

آج نہ جانے کیوں وہ اس قدر تپ رہا تھا۔

''یہاں کے زنداں سے نکل کر جاؤں گی کہاں؟ اور میرے یہ بچے؟ سب سے بڑی بات تمہاری مما' بابا

جان کو کیوں نہیں چھوڑ کر گئیں۔ کیا میں نہیں جانتی اس عورت کے دل پر کیسے کیسے عذاب اترے ہیں۔ مختلف ادوار میں تم چاہتے ہو قبیلے والوں کی ملامت میرے باپ کی جھولی میں آ پڑے اور میرا آن بان والا باپ جو غرور سے سر تانے چلتا ہے اس کے کندھے جھک جائیں۔'' وہ سسک اٹھی۔

''ان زنجیروں کو توڑ کیوں نہیں دیتیں۔ کسی ایک کو تو پہلا قدم اٹھانا چاہیے۔''

''بغاوت ...... تو کیا بغاوت کروں۔ میری ماں کے گھر سے بھاگ جانے کو ابھی تک معاف نہیں کیا گیا۔ کیا وہ کسی مرد کے ساتھ بھاگی تھی؟ وہ تو اپنی سگی ماں کے ظلم وستم کی آخری حد دیکھ کر زندگی بچانے کی غرض سے اپنے سگے تایا کے گھر پناہ لینے گئی تھی اور اس پر اور کسی نے نہیں اس کے سگے رشتوں نے الزام اور بہتان لگائے تھے۔ تو کیا روشانے خان کو معاف کر دیا جائے گا؟'' وہ اذیت سے لب کچل کر بولی۔

''میرا باپ جس کی معاشرے میں عزت ہے وہ مطلقہ بیٹی کا باپ کہلائے گا۔''

''اگر ایسی باتیں سوچو گی تو فیصلہ نہیں کر پاؤ گی۔''

''اور میں کب کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ تھک کر بولی اور زری خان نہ جانے کیوں بے حد غصے میں چلا گیا تھا۔

''گل زیبا' گل مالا' گیتی اور گل افشاں جن کی عمر عزیز کے قیمتی سال ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسل رہے ہیں اور تمہاری پیاری بہنیں جو اچھے کپڑوں اور اچھی چیزوں کے لیے ترستی ہیں' جنہیں بی جاناں ہار سنگھار تو دور کی بات مہندی تک لگانے نہیں دیتیں۔ جنہیں روشی کا گھر اور شہر دیکھنے کا شوق ہے' جنہوں نے آج تک کسی گاڑی میں سفر نہیں کیا۔ جنہیں اپنی زمینوں تک جانے کی اجازت نہیں۔ میں حبہ کے لیے اور تمہاری ان معصوم بہنوں کے لیے زندگی کے دروازے اور بند کر دوں؟ میرا ایک بھی انتہائی قدم ان سرداروں کی سوئی وحشیانہ حس کو بیدار کر دے گا اور جس کا سارا عذاب تمہاری بہنوں اور میری بیٹی کے دل پر اترے گا۔

اور یہ صرف میر ذکاء' درانی کی بات نہیں۔ میرا اپنا باپ بھی تو اسی کیٹگری میں آتا ہے۔'' وہ ڈولن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس میں کون سی ایسی خوبی تھی جسے دیکھ کر احمد صاحب اسیر ہوئے تھے اور جو گل بخت میں نہیں تھی۔ بلاشبہ وہ ذہین بہت تھی' شاید اس کی ذہانت نے پاپا کو اسیر کیا تھا۔

روشی کو ڈولن کے آنے اور واپس چلے جانے پر کوئی افسوس نہیں تھا' مگر اب وہ ایک عورت اور ماں ہونے کے ناتے ڈولن کے درد کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ جو ایک اور روشانے کو ازبک ہاؤس چھوڑ کر چلی گئی تھی اگر وہ علیزے کو ساتھ لے جاتی تو علیزے شاید روشی اور شانی کی طرح زندان میں قید نہ ہوتی۔ منان اور حنان کے بعد ماہی اور ماہ نور ٹوئنز پیدا ہوئی تھیں۔ روشی کو اب خسارے گننے کی بھی فرصت نہیں رہی تھی۔

✦✻✦

بی جاناں چھہتر سال سب پر حکومت کرنے کے بعد اب خاموش ہو چکی تھیں۔ فالج کے اٹیک نے ان کی

تمام ہمتوں کو گویا چوس لیا تھا۔ سات بچوں کے ساتھ روشانے خود کو سوچتی اور حیران ہو جاتی۔ کیا یہ وہ ہی روشانے تھی کتابوں کی دیوانی' سپورٹس کی شوقین' پرندوں اور جانوروں کے متعلق دھواں دھار بولنے والی۔

اور ولی بھائی' صامی بھائی اتنے سالوں میں کہاں تھے؟ شانی بتاتی تھی کہ ولی بھائی نے اس کی شادی کے بعد سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

''کیا وہ سچ مچ میرے اسیر تھے؟'' وہ حیران ہو کر سوچتی۔

میر ذکاء کے وہی شب و روز تھے۔

آج سات یا آٹھ مہینے بعد میر ذکاء کی طرف سے بلاوا آیا تھا۔ وہ بچوں کو سلا رہی تھی۔ چاروں بچے میٹرس پر سوئے تھے جبکہ بچیاں تینوں اس کے برابر بیڈ پر سوئی تھیں۔

بچوں کو اچھی طرح کمبل اوڑھا کر باہر نکل آئی۔ اس کا رخ بی جاناں کے کمرے کی طرف تھا۔ اب وہ بے دھڑک بی جاناں کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ گھنٹوں شانی سے فون پر انگریزی میں باتیں کرتی۔ بے بسی اور غصے کی وجہ سے بی جاناں یقیناً پیچ و تاب کھاتی ہوں گی' مگر روشی کو اب کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔

بی جاناں ہمیشہ کی طرح جاگ رہی تھیں۔ ساری ساری رات تکلیف کی وجہ سے جاگنا بھی کسی سزا سے کم نہیں تھا۔ ایک نرس ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اب وہ صرف اپنے کمرے تک محدود ہو چکی تھیں اور ان کی گدی عشق النساء نے سنبھال لی تھی۔ بیٹیوں کے نہ بیاہے جانے کا سارا غصہ ان لوگوں پر اتارا جاتا تھا جو کہ قطعاً بے قصور تھے۔

وہ ان ہی سوچوں میں الجھی الجھی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ آج اسے ذکاء خان کے ساتھ فیصلہ کن بات کرنی تھی۔ سارے علاقے کے مسائل حل کرنے والوں کے اپنے گھر میں مسئلوں اور پریشانیوں کے انبار لگے تھے اور انہیں کوئی ہوش نہیں تھا۔

''اس کا فیصلہ جرگہ کرے گا۔ دیکھتے ہیں وہ خبیث کا پتر کہاں تک بھاگتا ہے۔ میں نے اتوار کا دن مقرر کر لیا ہے۔ تم سب کو لے کر وہیں آ جانا۔'' الوداعی کلمات کہے بغیر فون آف کر کے غصے کے ساتھ اچھال دیا گیا تھا۔

''اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟'' اب نہ جانے کس کس کا غصہ اس پر اترنے والا تھا۔

''بچیوں کو فیڈ کروا رہی تھی۔'' روشی نے تحمل سے کہا۔ ''بہت دنوں بعد آئے ہیں۔''

وہ زیادہ گیسٹ ہاؤس میں قیام کرتا تھا۔ سننے میں تو یہ ہی آیا تھا اور اتنے سالوں میں روشی بھی یہ ہی معمول دیکھ رہی تھی' اب وہ گیسٹ ہاؤس کے بہانے نہ جانے کہاں کہاں جاتا تھا۔ روشی کو کوئی خبر نہیں تھی۔

''کارخانے میں آگ لگ گئی تھی۔ شنگھلا پور کی زمینوں پر مزارعوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا۔ دو خاندانوں کے تین' تین بندے قتل ہو چکے تھے۔ اس مسئلے کو نمٹاتے دو مہینوں سے خوار ہو رہا ہوں جرگہ بلوایا

گیا۔ پھر فیصلہ ہوا۔ واپس آنے لگا تو ہنگو سے آتے دو اپنے ٹرک الٹنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ کینو کے دو ٹرک لوڈ تھے۔ اتنا نقصان اوپر سے ڈرائیور بھی ہلاک ہوگیا تھا۔ اس کے گھر والوں کے لیے انتظام کرتے مزید تین' چار ہفتے رکنا پڑا۔''

نہ جانے کس رو میں وہ اپنی مصروفیت کی تفصیل بتانے لگا تھا۔

''دوسروں کے معاملے نپٹاتے رہیے گا۔کبھی اپنے گھر کی طرف بھی دھیان دے لیجئے۔''

''بات صاف صاف کیا کرو۔گھمانے پھرانے کی ضرورت نہیں۔'' وہ ناگواری سے بولا۔

''میں پہلے ہی سخت تھکا ہوا ہوں۔فضول بک بک نہ کرو۔ ادھر آ کر سر دباؤ۔ درد سے پھٹ رہا ہے۔'' وہ تحکم سے بولا تھا۔ روشی تھکے تھکے قدم اٹھاتی بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

''بولو' کیا کہنا چاہتی ہو۔'' وہ خاموشی سے اس کا سر دبا رہی تھی' اس لیے میر ذکاء اس کی طویل خاموشی سے اکتا گیا۔

''آپ نے مجھے کیوں بلوایا ہے؟''

''بیوی کو کیوں بلوایا جاتا ہے؟'' وہ الٹا کچھ نرمی سے پوچھنے لگا۔

''شکر ہے آپ بیوی تو سمجھتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں یاسیت تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی۔'' وہ برا مان گیا۔ پھر اسی طرح ناراض لہجے میں بولا۔ ''بچے ٹھیک ہیں؟ منان اور ماہی کا بخار اتر گیا؟'' وہ اتنا بھی بے خبر نہیں تھا' جتنا روشی سمجھتی تھی۔

''آپ نے کبھی ان کو پیار کیا ہے؟ انہیں دنیا میں لانے کا سبب بنے ہیں تو کیا کبھی ان بچوں کی ضروریات' خواہشات کی طرف دھیان دیا ہے۔'' وہ آج سالوں کا غبار نکال دینا چاہتی تھی۔

''کیا چاہتی ہو؟ کھل کر بتاؤ۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔''الگ گھر کا خیال بھی دل میں مت لانا۔'' ساتھ ہی وارننگ بھی دے دی گئی تھی۔

''فی الحال تو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ بچوں کی سکول جانے کی عمر ہے۔کیا سوچا ہے آپ نے ان کے بارے میں۔'' وہ بات بدل کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''اس دراز میں سے پراسپکٹس نکال کر لاؤ۔ اسلام آباد اور مری کے سکولوں کے متعلق تفصیل درج ہے۔'' ذکاء خان نے اسے مژدہ جاں فزا سنایا تھا۔

''کانونٹ یا کیڈٹ سکول میں سے ایک سلیکٹ کرلو۔''

''کانونٹ بہتر رہے گا۔حبہ اور منان کے لیے۔'' وہ وفور مسرت سے کپکپاتی آواز میں بولی۔

''حبہ کے لیے نہیں صرف منان کے لیے۔'' میر ذکاء کے لہجے میں پتھروں جیسی سختی تھی۔

''مگر کیوں؟'' روشی کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔''حبہ اور منان میں کیا فرق ہے؟ صرف

یہ ہی کہ حبہ بیٹی ہے۔''
''بحث کی ضرورت نہیں منان کا ایڈمیشن کل ہی ہو جائے گا۔ اب بتی بجھا دو۔'' وہ فیصلہ کر چکا تھا۔
''اگر حبہ نہیں پڑھ سکے گی تو پھر ماہی اور ماہ نور بھی ان پڑھ رہیں گی۔'' وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگنے لگی۔
''ہر کوئی تمہارے باپ جیسا بے غیرت نہیں ہوتا۔ لڑکیوں کو جس نے کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ گھوڑے دوڑانا' آوارہ گھومنا' کالجوں میں بھیجنا اور بیوی کے بھائیوں کے ساتھ ٹھٹھے لگوانا۔''
''ذکاء خان ذرا آپے میں رہ کر بات کریں۔ میرے باپ سے آپ کا خون کا رشتہ ہے۔''
روشانے کے روم روم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ اتنی توہین' اس قدر ذلت' وہ بھڑ بھڑ جلنے لگی۔ ''اور آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں یہ۔''
''یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔ اتنے عرصے میں تمہاری ماتمی صورت' تمہارا رویہ چیخ چیخ کر بتاتا رہا ہے۔'' وہ تنفر سے بولا۔
''آپ سے ایسی ہی سطحی بات کی امید تھی مجھے۔ بہرحال میں اس فضول جھگڑے کی نذر بیٹی کا مستقبل نہیں کر سکتی۔ کل حبہ کا بھی ایڈمیشن ہو گا۔''
''کبھی نہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں۔''
''کیوں ممکن نہیں۔'' وہ چیخی۔
''ہمارے ہاں عورتوں کو پڑھانے کا رواج نہیں۔''
''یہ رسمیں' یہ رواج آپ نے خود بنائے ہیں۔ ان رسومات کو صرف عورت پر ہی لاگو کیا جاتا ہے۔ اسے قید کر کے' بنیادی ضروریات سے محروم کر کے' اس کی خواہشات کو دبا کر' کوئی ایسا رواج مردوں کے لیے بھی بنا دینا تھا۔''
''کون سی ایسی خواہشات ہیں جو پوری نہیں کی گئیں؟'' وہ گہری کاٹ دار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
''بہنیں ہیں وہ ہماری۔''
وہ جز بز سا ہو گیا۔
''ان بہنوں کے کوئی حقوق نہیں۔''
''تو کیا کروں میں۔'' میر کو سخت تاؤ آیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا دو جھانپڑ لگا کر اس کی بولتی بند کر دے۔
''ان کی شادیاں کر دیں۔'' روشی بڑے اطمینان سے بولی۔
''شادی۔'' وہ حیران ہوا۔ ''اب کیا ممکن ہے؟''
''کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ آج سے سترہ سال پہلے گل زیبا کے لیے ڈاکٹر مسز کبیر الدین اپنے بھائی کا

رشتہ لائی تھیں۔ آپ لوگوں نے کس بنا پر ڈاکٹر زکریا کو ریجیکٹ کیا تھا۔"

"وہ غیر خاندان سے تھا۔"

وہ تلخی سے بولا۔

"تو پھر کسی خاندانی سے کیوں نہیں کیا۔ جائیداد کی خاطر' کہیں انہیں زمینوں میں سے حصہ نہ دینا پڑ جائے۔"

"جسٹ شٹ اپ روشانے!" وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔"تائی کو اپنی بیٹیوں کے معیار کے مطابق جو آدمی چاہیے تھا وہ اس دنیا میں ملنا مشکل ہے اور تمہیں دوسروں کے غم میں گھلنے کی ضرورت نہیں۔ تائی اپنی مرضی سے بیٹیوں کو نہیں بیاہ رہی تھیں۔ بھانجوں کو زمینوں کا وارث بنانا تھا' ان ہی کے انتظار میں لڑکیوں کو بوڑھا کر دیا ہے اور وہ طائفوں کو گھر میں بسا چکے تھے۔"

"بہر حال' حبہ کا ایڈمیشن ہو جانا چاہیے۔"

وہ اسے موضوع سے ہٹتے دیکھ کر دوہائی کی غرض سے بولی۔

"جاؤ' کام کروا اپنا۔"

میر ذکاء کا بھی موڈ بگڑ چکا تھا۔

"آپ کا مزاج بہتر کرنے سے بھی بڑا کوئی کام ہے۔" اب وہ ہنس رہی تھی اور ہنستے ہوئے وہ بہت اچھی لگتی تھی اور شاید ان ہی ہتھیاروں سے اسے رام کرنا چاہتی تھی۔

اور صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اسے بچوں کے پاس بھاگنے کی جلدی نہیں تھی۔ اس نے بہت اطمینان سے غسل کیا تھا۔ اپنا سب سے اچھی ریشمی سوٹ زیب تن کیا۔ ہاف سلیو کی وجہ سے وہ اس سوٹ کو یہاں پہننے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی' مگر آج گویا اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ آج وہ بہت دل لگا کر تیار ہو رہی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر نیچرل سی لپ اسٹک لگا کر لمبے ریشمی بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بہترین پرفیوم خود پر اسپرے کر کے اس نے دوپٹہ اچھی طرح اوڑھا اور بچوں کی آیا کو ناشتے کی ہدایت دے کر ذکاء خان کا ناشتہ ٹرالی میں لگا کر ادھر آ گئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق ذکاء خان چونک گیا تھا۔

"یہ خاص اہتمام کس سلسلے کی کڑی ہے؟"

"آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟"

"جو تم چاہتی ہو' ایسا ممکن نہیں۔"

"تو ایک خاتون ٹیوٹر کا بندوبست کر دیں' جو حبہ کو گھر میں آ کر پڑھا جایا کرے۔" وہ رات سے ہی سوچ چکی تھی۔ جانتی تھی کہ حبہ کو سکول بھیجنا کوئی اتنا آسان نہیں۔

"سوچوں گا۔"

''پلیز مان جایئے نا۔''

وہ اصرار سے بولی۔ انداز میں بڑی محبوبیت تھی۔

''خدمت کرو روشانے!''

وہ ناشتے کی طرف متوجہ تھا۔

''آپ کو اپنی سب سے محبوب چیز کا واسطہ۔''

روشی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بیٹی کے بہتر مستقبل کے لیے بھیک مانگی تھی۔ آج روشانے خان پر یہ بھی وقت آنا تھا۔

''جہنم میں جاؤ تم اور تمہاری بیٹی۔''

وہ ٹرالی کو زوردار ٹھوکر مارتا رتن فن کرتا چلا گیا تھا۔ روشی اپنی کم مائیگی کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ صرف مٹی کا ڈھیر ہے۔

منان کا ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ وہ زخام کے پاس بورڈنگ چلا گیا۔ زخام اب گھر آنے لگا تھا اور اسے دیکھ کر مما کھل اٹھتی تھیں۔

اور پھر ایک حیرت انگیز واقعہ یہ ہوا کہ چند دن بعد ایک سانولی سلونی دبلی پتلی سی نک سک سے سجی عورت آ گئی۔ وہ حبہ کی ٹیوٹر تھی۔ حبہ کو پڑھانے آئی تھی۔ جس نے سنا گویا دنگ رہ گیا۔ اورنگ زیب خان تک بھی خبر پہنچ چکی تھی اور وہ بھی سخت مشتعل تھے۔ عشق النساء نے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا البتہ چھوٹی ممانی نے مبارکباد دی تھی۔

''مہر افزوں! شکرانے پڑھو۔ ہمارے مردوں کی سوچ بدل رہی ہے۔''

روشانے اس پہلی کامیابی پر مسرور تھی۔ یہ پہلا قدم مبارک ثابت ہوا تھا۔ حبہ کی ٹیوٹر مس ٹینا سے روشی نے بات کر لی تھی اور پزمان اور پری دخت کے لیے بھی اس نے کورس کی کتابیں منگوا لی تھیں۔ اور پنا بھی پڑھنے کی خواہش مند تھی۔ ان تینوں کو مس ٹینا کے پاس بٹھانے کا روشی نے یہ جواز پیش کیا تھا کہ حبہ گھبراتی ہے۔ پری، پزمان اور پنا تینوں کو مس ٹینا سے پڑھتے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے اور فی الحال راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا، شاید اس لیے کہ میر ذکاء کے حکم کے مطابق مس ٹینا کی آمد ہوئی تھی۔

✦❋✦

اور پھر مخالفت اس وجود کی طرف سے ہوئی تھی جس کی طرف سے کم از کم روشی کو امید نہیں تھی۔

زری خان نے ایک طوفان اٹھا دیا تھا۔ وہ جو انقلاب کی باتیں کرتا تھا، جاہلوں کی طرح چلا تا رہ گیا۔

''تیری بیٹی کو سرخاب کے پر لگے ہیں۔ یہ پڑھے گی؟ کبھی نہیں، میں اسے پڑھنے نہیں دوں گا۔'' زری خان غضب ناک ہو رہا تھا۔

''تمیز سے بات کرو زری خان! حبہ، میر ذکاء کی بیٹی ہے۔'' ذکاء خان تحمل سے بولا۔

''اس عورت سے کہہ دو، آج کے بعد یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔''

''بچی کو پڑھانے وہ عورت یہاں آتی رہے گی۔ تم اس معاملے میں مت بولو۔''

''ٹھیک ہے پھر ایک ڈیل کر لو۔ تم نے سرداری کے اصول توڑے ہیں اس وجہ سے تم اب ہماری اسٹیٹ

کے اہل نہیں رہے۔ خاموشی سے راستے سے ہٹ جاؤ۔'' زری خان سنجیدگی سے بولا۔
''میری بچی اس عورت مس ٹینا سے اب نہیں پڑھے گی۔'' ذکاء خان نے گویا سرتسلیم خم کرلیا تھا۔ روشی کا دل یکدم کرچی کرچی ہوا تھا۔
''تم نے سرداری پر بیٹی کو قربان کر دیا میر ذکاء خان! تم نے اچھا نہیں کیا۔'' وہ زیرلب بڑبڑاتی ہوئی سسکنے لگی تھی' جب میر ذکاء کی شعلوں کی لپک لیے آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔
''حبہ اب سکول جائے گی۔ باقاعدہ تعلیم حاصل کرے گی' میں دیکھتا ہوں تم کیا کرتے ہو۔''
''ذکاء خان! باز آ جاؤ' ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔''
''یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔'' میر ذکاء تن فن کرتا باہر نکل گیا۔
''دیکھ لو بھرجائی! کس قدر انا پرست اور ضدی انسان ہے یہ۔ کس طرح منوایا ہے میں نے اس سے...... اب حبہ کو سکول بھیجنا۔ ہاں پری اور پنا کو سکول بھیجنے کی غلطی نہ کرنا۔ ان کے متعلق فیصلوں کا اختیار بابا جان کے پاس ہے۔''
زری خان مسکرا رہا تھا اور روشانے کا دل اس کی عظمت کو سراہ رہا تھا۔ وہ زری خان کی احسان مند تھی۔ اس کی بیٹی اچھے سکول میں جانے لگی تھی۔ حنان' ریان اور سبحان کے ایڈمیشن بھی ہو گئے تھے۔ پنا اور پری کو ابھی تک مس ٹینا پڑھانے آتی تھیں۔

✦❋✦

ان ہی دنوں بابا جان نے خنیا اور ماویٰ کے رشتے طے کر دیئے۔ شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔
روشی نے دیکھا ان دنوں مما کے آنسو ہر وقت آنکھوں میں ٹھہرے رہتے تھے۔ وہ بہت رنجیدہ تھیں۔ ایک دن روشی کے پوچھنے پر کہنے لگیں۔
''بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں اور ان کے درد مار ڈالتے ہیں۔'' وہ اتنا تو جانتی تھی مما بہت پریشان ہیں۔ شاید خنیا اور ماویٰ کی متوقع جدائی کے خیال سے' مگر ان کی غم اور دکھ کی وجہ جان کر روشی کا دل دہل گیا تھا۔ یہاں تو قدم قدم پر عذاب تھے۔
نکاح ہو گیا۔ چھوارے بٹ گئے۔ مبارک' سلامت کا شور اٹھا۔ آج اس کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ ازبک ہاؤس سے دادی' پاپا' گل بخت اور شانی آئے تھے۔ گل بخت اور شانی کے اصرار پر اس نے سرخ شیفون کی ساڑھی زیب تن کی تھی۔ یہ ساڑھی شانی اس کے لیے بطور خاص خرید کر لائی تھی اور اس نے تمام خوف بالائے طاق رکھ کر ساڑھی پہن لی تھی۔ آج وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ آئینہ گواہ تھا۔ اس کی نندیں فدا ہو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ دلہن بنی ماویٰ اور خنیا بھی بار بار بھرجائی کو سراہ رہی تھیں۔ مہرافزوں نے اس کی نظر اتاری تھی اور عشق النساء اور گل زیبا نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا تھا۔ ان کی آنکھوں میں شعلوں کی سی لپک تھی۔

اور ولیمہ سے اگلے دن روشی کے سر پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ پورچ میں ایک لمبی اور بے حد چمکتی گاڑی رکی تھی۔ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو گاڑی میں سے ایک بھاری تن توش والا مرد برآمد ہوا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ مگر بڑھی توند چہرے پر عجیب سی داڑھی اور مقامی لباس کی وجہ سے وہ بہت اجڈ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی شکل بھی عام سی تھی اور وہ ماوئی جیسی معصوم' حسین اور نازک اندام سی گڑیا کا شوہر تھا۔ روشی اس کی سوجی سوجی آنکھوں کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

خنیا کا شوہر اس سے عمر میں اتنا بڑا نہیں تھا۔ مگر اس کی یہ دوسری شادی تھی۔ یہ شادی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے کی گئی تھی۔ خان دلاور بھی خنیا کے پاسنگ نہیں تھا۔ دونوں ان پڑھ تھے۔ دونوں ہی وسیع وعریض جائیداد کے تنہا وارث تھے۔

بابا جان نے ان میں آخر دیکھا ہی کیا تھا؟

کیا ان کی اتنی خوب صورت بیٹیاں اس قدر ارزاں تھیں کہ ایک بوجھ کی طرح انہیں اتار دیا گیا تھا؟ کیا کل حبہ بھی اپنی پھوپھیوں کی جگہ پر کھڑی ہوگی؟

اس نے مما سے بات کی تو انہوں نے کہا تھا۔

''تو کیا اچھے رشتوں کے انتظار میں انہیں دہلیز پر بٹھا کے بوڑھا کر دیتے۔ انہوں نے بہتر فیصلہ کیا ہے ورنہ گل زیبا اور گل مالا کا انجام دیکھ رہی ہونا۔ بھابی صاحبہ کا خیال تھا کہ ان کی بیٹیاں اس قدر حسین ہیں تو لڑکے بھی ان کی ٹکر کے ہونے چاہئیں اور پھر اسی انتظار میں انہوں نے گل زیبا کے بالوں میں سفیدی اتار دی۔ اس لیے مجھے خان صاحب کے فیصلے پر سر جھکانا پڑا۔''

''مما! خاندان کے علاوہ بھی تو رشتے ہو سکتے ہیں۔''

''پگلی! آئندہ یہ بات زبان پر مت لانا' ورنہ جان نکال دیں گے یہ لوگ۔ جاؤ اٹھو' پریشان مت ہو' بچوں کو دیکھو' انہوں نے کھانا پتا نہیں کھایا ہے یا نہیں؟'' روشی مرے مرے قدم اٹھاتی کوریڈور سے باہر نکلی تو گنجور نے کہا۔

''بی بی! میر صاحب بلا رہے ہیں۔''

''اف' اب میر صاحب کی بات بھی سنو۔'' وہ اس قدر تھکی ہوئی تھی اور اس میں میر صاحب کی بات سننے کا حوصلہ نہیں تھا' مگر حکم کی بجا آوری بھی ضروری تھی۔ وہ ماہ نور کو گود میں اٹھا کر سیدھی ذکاء خان کے کمرے میں چلی آئی۔

''اسے کیوں لائی ہو؟'' اس نے بچی کو دیکھ کر نا گواری سے پوچھا۔

''آپ کے پاس سونے کی ضد کر رہی تھی۔'' روشی نے جلدی سے بات بنائی۔ حالانکہ اس کے بچے ضدی نہیں تھے۔ ویسے بھی ماہ نور تو سو چکی تھی۔ روشی نے احتیاط سے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

''کیسی بات؟'' وہ چونکی۔

''تمہیں شانی کے متعلق ایک بات بتانا ہے پہلے ماہ نور کو کمرے میں چھوڑ کر آؤ۔ دیکھو' روشنی کی وجہ سے اس کی نیند ڈسٹرب ہو رہی ہے۔''

''او کے۔'' دوسرے ہی لمحے وہ احتیاط سے ماہ نور کو اٹھا کر کمرے میں چھوڑ کر واپس آ گئی۔

''بتایئے بھی۔'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''پہلے یہ بتاؤ تم نے ساڑھی کیوں پہنی تھی؟''

''کیوں؟ کیا اچھی نہیں لگی۔ سب نے تو تعریف کی تھی۔ خنیا کی نند کہہ رہی تھی میں سات بچوں کی ماں تو لگتی ہی نہیں۔'' روشی نے قدرے تفاخر سے کہا۔

''عورتیں تعریف کی بھوکی کیوں ہوتی ہیں؟'' ذکاء خان نے تاسف سے کہا۔

''جب اپنے مرد نہ سراہیں تو تشنگی تو رہتی ہے۔'' اس کا انداز بھی جتانے والا تھا۔

''اپنے مرد کے لیے بھی کبھی اتنا سجنے سنورنے میں وقت برباد کیا ہے؟'' ذکاء کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔

''آپ نے کبھی نظر بھر کر دیکھا ہے؟'' وہ کہنا چاہتی تھی' مگر یہ انا بیچ میں آ گئی۔

''کام کی بات کریں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''مجھے دیکھ کر تو تمہیں نیند کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔'' وہ غصے سے بولا۔

''میں تھک چکی ہوں خان! سارا دن آپ کے بچے گھن چکر بنائے رکھتے ہیں۔''

''شکر ہے میرے بچے کہا ہے تم نے' ورنہ بچوں پر تو یوں قبضہ جمائے ہوئے ہو کہ شاید میں کہیں تم سے چھین نہ لوں۔''

''آپ کا بھلا کیا بھروسہ۔''

''بس اتنا سمجھتی ہو مجھے؟'' اس کے لہجے میں تاسف تھا۔ ''نہیں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تم نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔''

''ایسی بات نہیں۔'' وہ جز بز سی ہو گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں شادی کے آٹھ سال بعد بھی اجنبی تھے۔

''آپ شانی کے متعلق کوئی بات کہنا چاہ رہے تھے۔'' روشی نے اسے یاد دلانا چاہا۔

''شانی کا رشتہ تمہارے پاپا کی ایکس وائف کے بھائی ولی خاقان نے اپنے چھوٹے بھائی صمیم خاقان کے لئے مانگا ہے۔ میں نے بھی اپنے دوست سبطین خان کا پرپوزل پیش کر رکھا ہے۔ اپنے پاپا سے کہنا' صامی

کا پرپوزل ایکسیپٹ کرنے کی ضرورت نہیں' ورنہ......'' اس کے لہجے میں عجیب سی دھمکی پوشیدہ تھی اور روشی تو گویا ساکت رہ گئی۔

''صامی بھائی جیسا نفیس' اتنا اعلیٰ خوبیوں کا مالک شانی کا طلب گار تھا۔ اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہوسکتی ہے اور میں کیا پاگل ہوں جو پاپا کو مجبور کروں گی۔ میری بہن ایک اچھے ماحول میں جائے یہ ہی تو میری آرزو تھی' تمنا تھی۔ آپ کا دوست آپ جیسا ہی ہوگا۔'' اس کا دل خدا کے حضور سجدہ ریز تھا اور وہ اپنی بہن کی خوشیوں کی بقا اور سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔

✦❋✦

بہت سی کامیابیاں سمیٹتے ہوئے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے جب بہت سے ماہ و سال وقت کے تھال میں گرتے چلے گئے تھے تو تب کہیں ولی حاقان کو جیلینا سے ایک ایسا سوال پوچھنے کا خیال آیا تھا' جس نے جیلی کے زخموں سے کھرنڈ اتار کر اسے پھر سے لہولہان کر دیا۔

اتنے سال گزر گئے تھے اسے ولی حاقان کے فلیٹ میں مستقل رہتے ہوئے۔ اس دوران کتنے ہی موسم آئے' ممی گئیں' فیمی اس کے قد کے برابر آ گیا تھا۔ اس کی شخصیت میں ولی حاقان کی ذات کی گہری چھاپ تھی۔ اسی کی طرح دھیما بولتا' آہستہ روی سے چلتا' ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا۔ فیمی نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتا تھا۔ وہ ولی حاقان کی اولاد نہیں تھا' مگر ولی حاقان نے اسے اولاد سے بڑھ کر چاہا تھا' توجہ دی تھی' محبت دی تھی۔

بہت سال پہلے ایک مرد نے بہت کم سنی میں اس کے دل پر حکومت کی تھی۔ آج بھی جیلی اس ہرجائی کے عشق میں گرفتار تھی۔ آج بھی وہ اس کی یادوں میں اول روز کی طرح زندہ تھا۔ آج بھی وہ اسے پہروں سوچا کرتی تھی۔

وہ بے وفا آدمی جو کسی کی نفرت میں اس کے قریب آیا تھا۔ اس نے جیلی سے نکاح کیا تو صرف اپنے کسی رقیب کو زک پہنچانے کے لیے۔ جیلی آج تک اس ڈرامے کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس نکاح کا مقصد کیا تھا؟ اور اس نے جیلی کو ہی کیوں استعمال کیا؟ اور اس آخری وصل کی رات نہ جانے کس سے وہ فون پر مخاطب تھا۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ فتح اور کامیابی کے احساس سے اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

''ممی! جہاں سے آپ کو نکالا گیا تھا اس اسٹیٹ پر صرف میری حکومت ہوگی' دیکھیے گا میں کرتا کیا ہوں۔''

جیلی ششدر تھی اور وہ اس کی تصویریں اور نکاح نامہ لے کر چلا گیا تھا' کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے۔

''آخر اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟'' وہ سوچتی اور روتی رہ گئی تھی اور آج اتنے سالوں بعد اس کے محسن نے یہ سوال کیا تھا۔ اسے تو بہت سال پہلے جیلی سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔

''تمہارا شوہر کون تھا جیلی؟'' ولی حاقان پوچھ رہا تھا۔

''اس کا تعلق ہری پوری سے تھا اور اس نے مجھے اپنا نام ذکاء خان بتایا تھا'' ولی کے سر پر آسمان گر پڑا تھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو جیلی!'' وہ حق دق سارہ گیا۔

''یہ ہی سچ ہے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

''ذکاء خان ...... ہری پور۔'' ولی کا دماغ چکرانے لگا۔

''تو کیا یہ روشانے کا ذکاء خان ہے۔'' اس کا دل کہیں دور گہری گھائی میں گر رہا تھا۔

''تمہارے پاس ذکاء خان کی کوئی تصویر ہے؟''

''نہیں۔''

''مگر کیوں؟''

''وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ البتہ میری تصویریں اس کے پاس تھیں۔''

''وہ تمہیں کہاں ملا تھا؟''

''یہیں برلن میں۔''

''اور تم نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔''

''وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ اس کے پاس پیسہ تھا۔ وہ مضبوط شخصیت کا مالک تھا۔ ممی اس کی دولت پر ریجھ گئیں۔'' جیلی نے آزردگی سے بتایا۔

''تم نے اس کا پیچھا کیوں نہیں کیا؟ تمہیں پاکستان جانا چاہیے تھا۔ تمہیں اس کے خاندان کے پاس جانا چاہیے تھا۔''

''میں بزدل ہوں' بہت بزدل۔ اتنی ہمت نہیں تھی مجھ میں اور نہ ہی میرے پاس روپیہ تھا۔'' وہ اذیت سے لب کچلنے لگی۔

''اب تم کیا چاہتی ہو؟ کیا زندگی یوں ہی گزار دو گی؟''

''میں کیا چاہوں گی۔'' وہ اپنی بزدلی کے ہاتھوں مجبور تھی۔

''کیا میں ذکاء خان سے ملوں۔ اس سے بات کروں۔ اگر وہ نہ مانا تو تمہاری طرف سے اس پر کیس دائر کر دوں گا۔ ایسے شریف لوگوں کے ساتھ یہ ہی کچھ کرنا چاہیے۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''تم ...... تم پاکستان جاؤ گے؟'' جیلی حیران پریشان سی پوچھ رہی تھی۔

''ہاں ......'' ولی کے لہجے میں چٹانوں کی سی مضبوطی تھی۔

✦❋✦

سبطین خان درانی قبیلے سے تھا۔ اس کا باپ بھی اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ سیاست میں بھی ان کا ایک نام تھا

اور ادھر شانی کو بھی یہ ہی غم کھا رہا تھا کہ اس کا باپ روشانے کی طرح اسے بھی کسی قبیلے میں ہی کھپا دے گا۔
شام کو بغیر بتائے خنیا اور دلاور خان بھی آ گئے تھے اور مما کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انہوں نے تنہائی میں بیٹی کو ڈپٹا۔
''تمہیں بتا کر آنا چاہیے تھا۔ کم از کم میں دلاور خان کے لیے شہر سے انگریزی کھانے منگوا لیتی۔''
دلاور خان سی فوڈ کا شوقین تھا۔ ایک دنیا اس نے دیکھ رکھی تھی۔ نہ جانے کس کس ملک کی خاک چھانی تھی۔ اس نے اگرچہ رسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی، مگر وہ کسی تعلیم یافتہ انسان سے کم نہیں لگتا تھا۔ اس کی گفتگو میں ٹھہراؤ تھا۔ سنجیدگی تھی اور موڈ میں ہوتا تو اس جیسا حاضر جواب کوئی نہیں تھا۔
دلاور خان نے خنیا کو ایبٹ آباد میں کوٹھی لے کر دی تھی۔ اس کی پہلی بیوی گاؤں میں ہوتی تھی۔ خنیا کی ساس اس کی تنہائی کے خیال سے شہر میں آتی جاتی رہتی تھی۔
البتہ ماوئ کے حالات خنیا سے بہت مختلف تھے۔ روشی کے خیال میں ماوئ کو روایتی سا ماحول ملا تھا، مگر اس کا یہ خیال اس وقت غلط ثابت ہوا جب ماوئ کی بیماری کی وجہ سے بالکل اچانک اسے اور میر ذکاء کو گاؤں جانا پڑا تھا۔
انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ ماوئ کس وجہ سے بیمار ہے۔ پچھلے پانچ مہینوں سے وہ یہاں نہیں آئی تھی۔
روشی تو اس کچی دیواروں والے مکان کو دیکھ کر ہی ساکت رہ گئی۔ مہمان خانہ جس قدر عالیشان تھا رہائشی حصہ اسی قدر پسماندگی کا شکار۔ حتیٰ کہ بجلی کی سہولت بھی نہیں تھی۔ تین چار نوکرانیاں ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں۔ تین کمرے تھے، ایک برآمدے اور باورچی خانہ۔ ایک طرف باتھ روم بھی موجود، مگر اس قدر غلیظ کہ ابکائی آنے لگتی۔
پلنگ پر لیٹی ماوئ کو دیکھ کر روشی کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ برسوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔ ماوئ کا مس کیرج ہو گیا تھا اور انہیں کسی نے بھی بتانا گوارا نہیں کیا۔
''یہ سب کیسے ہوا ہے؟'' روشی تو ابھی تک شاک میں تھی۔
''بارش ہو رہی تھی۔ کچے صحن میں سے چیزیں سمیٹتے ہوئے پیر پھسل گیا تھا۔'' وہ بھرجائی کو اپنے گھر میں اچانک دیکھ کر کتنی مسرور ہوئی تھی اور اداس بھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اپنی بھرجائی اور بھایا کی خاطر مدارات کیسے کرے گی۔ باورچی خانے میں صرف دالیں اور چاول کا ڈبہ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ دودھ بھی نہیں۔
''تم سچ کہہ رہی ہو؟'' روشی کو قطعاً یقین نہ آیا۔
''سچ کہہ رہی ہوں بھرجائی!'' ماوئ کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ کیسی بے بسی تھی، یہ کیسے دکھ تھے جو صرف اسے تنہا سہنے تھے۔ زبان بندی کا حکم تھا۔ پھر کیسے لبوں سے شکوہ صدا بن کر ابھرتا۔

روشی نے ایک خادمہ کو مردان خانے بھیج کر میر ذکاء کو اندر بلایا۔ میر ذکاء کے اندر آتے ہی خان حشمت نہ جانے کس کونے سے برآمد ہوا تھا۔ پھر اس کی ماں اور بہنیں بھی نکل آئیں۔ میر حشمت تابعداری سے سر جھکائے کھڑا تھا اور اس کی ماں اور بہنیں گویا بچھ بچھ جا رہی تھیں۔ آناً فاناً فروٹ' دودھ' جوس اور مٹھائیاں آ گئیں۔ باورچی خانے سے اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھنے لگیں۔

میر ذکاء نے ایک کٹیلی نفرت بھری نظر حشمت خان کی طرف پھینکی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ روشی نے محسوس کیا تھا میر ذکاء کو بھی حشمت خان ناپسند ہے۔ روشی اسے ماوئ کے کمرے میں لے آئی تھی۔ کمرے میں بے تحاشا گھٹن اور حبس تھا۔ ذکاء خان کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے روشی سے کہا۔

''میں صحن میں بیٹھتا ہوں۔تم ماوئ کو لے کر وہیں آ جاؤ۔''

''خان! ماوئ بیمار ہے۔ یہ چل پھر نہیں سکتی۔'' روشی کو بتانا پڑا۔

''تم ماوئ کو تیار کر دو۔ اسے ہسپتال لے چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے اس کا بخار بگڑ گیا ہے۔''

یقیناً ذکاء خان کو یہی بتایا گیا تھا۔ ماوئ کی ساس نندیں بھی موجود تھیں۔ وہ ماوئ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ اس خوف سے کہ وہ اپنے میکے والوں کو کچھ بتا نہ دے۔ روشی کچھ سوچتی رہی تھی' پھر انگریزی میں بولی۔ ''ماوئ کو بخار نہیں' اس کا مس کیرج ہوا ہے۔ اسے کسی گائناکالوجسٹ کی ضرورت ہے۔''

''ہوں ماوئ کو مسز کبیر الدین کے کلینک لے چلتے ہیں۔'' کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

ماوئ کی ساس اسے ڈاکٹر کے ہاں لے جانے سے روکنا چاہتی تھی۔ اگر میر ذکاء ساتھ نہ ہوتا تو انہوں نے ماوئ کو شہر نہیں بھیجنا تھا۔ وہ اپنے علاقے کی مڈوائف کی تعریف کر رہی تھی جسے سننا بھی روشی نے گوارا نہیں کیا۔

حشمت خان ابھی تک مؤدب بنا بیٹھا تھا۔ روشی کو وہ اوّل درجے کا فراڈیا اور ایکٹر دکھائی دے رہا تھا۔

''میر سائیں! میں ماوئ کو ہسپتال لے جاتا ہوں۔'' وہ بڑے ادب سے کہہ رہا تھا۔

''اتنے دنوں سے بیمار ہے ماوئ پہلے کیوں نہیں خیال آیا اسے ڈاکٹر کو دکھانے کا۔'' روشی کا لہجہ کٹیلا تھا۔

''اٹھو ماوئ!'' روشی نے زبردستی ماوئ کو چادر اوڑھا دی تھی۔ پھر اسے سہارا دے کر گاڑی تک لائی۔

''خان! بہن کو ایک طرف سے پکڑو۔'' روشی اسے سوچوں میں گم دیکھ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ وہ کچھ جھجک کر دور کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں ......'' وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا قریب آ ہی گیا تھا۔ پھر اس نے سہارا دے کر ماوئ کو گاڑی میں بٹھایا۔ ماوئ خود حیران تھی اور اب شرمندہ ہو رہی تھی۔

''بہنوں' بیٹیوں اور بیویوں کو ہمیشہ سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' اس کا لہجہ بہت کچھ جتلا رہا تھا۔ میر ذکاء خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

مسز کبیر الدین نے ماوئ کو ایڈمٹ کر لیا تھا۔ وہ بہت تجربہ کار اور بزرگ ڈاکٹر تھیں۔ انہوں نے ماوئ کا

معائنہ کر کے بتایا۔

''اس کا مس کیرج پھسلنے کی وجہ سے نہیں' تشدد کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''نن ...... نہیں۔'' ماوئ گھبرا کر ہکلانے لگی تھی۔ روشی کے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی۔ اس نے میر ذکاء کو جوش کے عالم میں بتایا۔

''حشمت خان نے ماوئ کو مارا ہے۔ آپ اس سے باز پرس کیوں نہیں کرتے۔''

''کیا باز پرس کروں؟ یہ کہ اس نے اپنی بیوی کو کیوں مارا ہے؟ ہمارے ہاں رواج نہیں بیٹیوں کے گھروں میں مداخلت کرنے کا۔''

''اپنے ان نام نہاد رواجوں پر بیٹیوں کو قربان کر کے کون سا وقار بلند کر رہے ہیں۔ عورت کی زندگی سے زیادہ قیمتی یہ رسم و رواج ہیں۔'' وہ یکدم مشتعل ہوگئی۔

''بکومت ......'' وہ دبی آواز میں غرایا تھا۔

ماوئ کو ہفتے بعد ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ واپسی پر میر ذکاء نے ڈرائیور سے کہا۔

''عدی کوٹ چلو۔''

''ہم عدی کوٹ نہیں' ہری پور جائیں گے۔'' روشی کا انداز اٹل تھا۔

''ہری پور کیوں؟''

''ابھی ماوئ کو بیڈ ریسٹ کی ضرورت ہے' جبکہ وہاں تو نہ آرام ہو سکتا ہے' نہ مناسب خوراک مل سکتی ہے اسے۔''

''مگر حشمت خان ......'' وہ کچھ سوچ کر لب بھینچ کر خاموش ہوگیا۔

''بھاڑ میں گیا حشمت خان۔'' روشی نے جل بھن کر زیر لب کہا۔

''بھرجائی! مجھے عدی کوٹ جانے دو۔'' ماوئ دھیرے سے منمنائی۔

''کیوں جانے دوں؟ پھر سے اس کی درندگی کا شکار ہونا چاہتی ہو۔ تم لوگوں کی خاموشی نے ان مردوں کو شیر کر رکھا ہے۔ تم نے ہاتھ کیوں نہیں روکا اس کا۔'' وہ غصے سے دبی آواز میں اسے جھڑکنے لگی۔

''بھرجائی! تم نہیں سمجھو گی۔'' ماوئ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گاڑی ہری پور کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ یعنی میر ذکاء نے اس کی بات مان لی تھی۔

''اماں کو اس کی بیماری کے متعلق نہ بتانا۔'' گاڑی سے نکلنے کے بعد میر نے روشی سے تاکیداً کہا۔

''میں کیوں مما کو پریشان کروں گی۔ اتنی تو سمجھ ہے مجھ میں۔'' وہ ماوئ کو سہارا دے کر اندر بڑھ گئی تھی۔

✦✻✦

ان ہی دنوں روشی کو شانی اور صامی خاقان کے رشتہ طے ہو جانے کی خبر ملی تھی۔ میر ذکاء ملک سے باہر تھا

لہٰذا اس خوش خبری پر روشی اطمینان سے خوشی کا اظہار کرسکتی تھی۔

پاپا نے سبطین خان کے پرپوزل پر صمیم کو فوقیت کیوں دی تھی؟ یہ گتھی بھی جلد ہی سلجھ گئی۔ پاپا اور مائلہ کی ضد اور انا کی جنگ میں شانی کا مستقبل سنور گیا تھا۔ پاپا اور مائلہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے شوق میں شانی کی نیا پار لگا گئے تھے۔ سننے میں آیا تھا۔ مائلہ نے اس رشتے کی شدید مخالفت کی تھی جبکہ ولی کی ذاتی کوششوں کی بنا پر یہ رشتہ طے ہوا تھا۔

صمیم کا پرپوزل ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ اس کے والد وردگ خاندان سے تھے۔ پسند کی شادی کے جرم میں انہیں جائیداد سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ قبیلے والوں نے ان سے تمام تعلقات توڑ لیے تھے۔ خاندان' جائیداد اور نسب کے بغیر گمنام ہو کر رہ گئے تھے۔

اسے یقین تھا کہ میر ذکاء نے سبطین خان کے پرپوزل کو نہ منظور کیے جانے پر بے انتہا غصہ کرنا تھا۔ وہ اسے انا کا مسئلہ بھی بنا سکتا تھا۔

مگر خلاف توقع جب اسی شام میر ذکاء واپس گھر آیا اور رات کو اسے بلوایا گیا تو روشی سہمے سہمے دل کے ساتھ میر ذکاء کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ مگر اس نے روشی سے کسی اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔

✦❋✦

اور پھر ان ہی دنوں ایسی آندھی چلی تھی سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔

گل افشاں گھر کے ملازم گلریز خان کے ساتھ کوٹھری میں سے برآمد کی گئی تھی۔ شرمندگی کے مارے عشق النساء گوشہ نشین ہو کر رہ گئی تھیں۔ گل مالا اور گل زیبا کو گہری چپ نے آن دبوچا تھا۔ بی جاناں بول نہیں سکتی تھیں' مگر سن تو سکتی تھیں۔ اس قیامت کی خبر کو سن کر وہ وحشیانہ انداز میں رونے لگیں۔ اپنا سر تکیے پر پٹختی رہ گئیں۔

''مم ...... می ...... شیرہ ...... میری ...... بیٹی۔'' شاید بیٹی کو یاد کیا جا رہا تھا۔ اس بیٹی کو جسے وہ بہت سال پہلے اپنے تئیں رو چکی تھیں۔ ہار چکی تھیں۔ آج کیسے زندہ ہو کر سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''بتاؤ نا اماں! تم ماں ہو میری۔ تم کیسی ماں ہو؟ ماؤں کے دل پتھر تو نہیں ہوتے۔ کیسا ناز تھا تمہیں پوتیوں کے حسن پر اور کتنی نفرت تھی میرے وجود سے۔ اپنی کوکھ سے پیدا کی بیٹی کی بدصورتی سے نفرت تھی نا تمہیں۔ دیکھو تو آج تمہاری حسین وجمیل پوتی نے تمہاری اجلی ردا کو کیسا داغدار کیا ہے۔ مجھ پر جھوٹے بہتان باندھے تھے نا تم نے۔ لوگوں سے کہتی تھیں تم کہ مشریہ گل کو تایا زاد احمد خان بھگا کر لے گیا اب دیکھو تو ...... گل افشاں نے کیا کیا ہے؟ اب بولتی کیوں نہیں ہو؟ لوگوں کو چیخ چیخ کر بتاؤ تمہاری پوتی کسی گندی دلدل میں جا گری ہے۔''

بی جاناں کو لگ رہا تھا کہ مشیرہ کے سامنے کھڑی ہے وہ اس سے غائبانہ معافی مانگتی رہ گئیں۔

جرگہ بلوا لیا گیا تھا' مگر میر ذکاء نے جرگے والوں کو اٹھوا دیا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ اور فیصلہ کرنا چاہتا

تھا، مگر رات کے پچھلے پہر گل افشاں اور گلریز خان بھاگ گئے تھے اور انہیں گل زیبا نے یہاں سے نکلوایا تھا۔
وہ دونوں کہاں گئے تھے تاحال کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔
گل افشاں تو چلی گئی تھی، مگر پیچھے رہ جانے والوں کی زندگیوں میں اب کوئی روزن نہیں رہا تھا۔ کوئی دریچہ اب خانوں کی بیٹیوں کے لیے نہیں کھل سکتا تھا۔
مشیرہ گل ماں کے ظلم و ستم سے بھاگ کر تایا کے پاس پناہ لینے چلی گئی تھی۔
اور گل افشاں ان روایتوں کی زنجیروں اور ان پتھروں کی دیواروں کی گھٹن سے گھبرا کر بھاگ گئی تھی۔
اب روشی کو یقین تھا کہ کوئی بھی انقلاب اس گھر کی دیواروں کو ہلا نہیں سکے گا۔ گل افشاں کی بے صبری نے آنے والی نئی نسل کی راہ میں اندھیرے ہی اندھیرے رقم کر دیئے تھے۔
مس ٹینا کی چھٹی کروا دی گئی۔ حبہ کو سکول سے اٹھوا لیا گیا۔ اب وہ گیارہ سال کی ہو رہی تھی۔ ان کے خیال میں وہ جوان ہو چکی تھی سو حبہ کو گھر میں قید کر دیا گیا۔ اس کا ننھا سا ذہن اس افتاد کو قبول نہیں کر سکا تھا۔ پڑھائی کا اسے جنون تھا۔ کتابوں سے اسے عشق تھا اور صحیح معنوں میں حبہ نے ماں اور باپ سے ذہانت وراثت میں پائی تھی۔
اس نے رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ بھوک ہڑتال کر دی اور کمرہ بند کر کے سارا دن سسکتی رہتی۔
تیسرے دن میر ذکاء تک خبر پہنچ چکی تھی سو ان ماں بیٹی دونوں کو طلب کر لیا گیا۔
''اگر میں پڑھوں گی نہیں تو مر جاؤں گی۔'' باپ کے پوچھنے پر وہ گویا پھٹ پڑی۔
''تو شوق سے مر جاؤ۔'' میر ذکاء نے سفا کی کی انتہا کر دی تھی۔ وہ بیٹی سے نظر چرا کر بات کر رہا تھا۔ وہ جو گیارہ سال کی عمر میں بہت بڑی بڑی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کے بال کمر سے بھی نیچے تک تھے اور وہ روشی کی طرح بلا کی حسین تھی اور پہلی مرتبہ میر ذکاء کو بیٹی کے حسن سے خوف محسوس ہوا۔
''روشانے! اسے سمجھا دو......''
''مما مجھے کچھ نہیں سمجھا سکتیں۔ اگر آپ نے مجھے سکول نہ بھیجا تو میں خود کو ختم کر لوں گی یا پھر خود بھی کہیں گم ہو جاؤں گی۔ آپ مجھے ڈھونڈتے رہیے گا۔ گل افشاں پھوپھو کی طرح......''
''بکواس بند کرو......'' میر ذکاء نے حبہ کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ دے مارا۔
''یہ تربیت کی ہے تم نے اس کی۔'' وہ روشی پر الٹ پڑا۔
''یہ عمل کا ردعمل ہے اور کچھ بھی نہیں۔ آپ بچی کی نفسیات سمجھنے کی کوشش کریں۔ ورنہ ناقابل تلافی نقصان اٹھائیں گے میر صاحب! آپ لوگ ان ''حادثوں'' سے بھی سبق نہیں سیکھتے انہیں ''قید تنہائی'' کے عذاب سے دوچار کر دیتے ہیں۔ یہ پھول یہ آپ کے گلشن کی کلیاں مرجھا کر رہ گئی ہیں اور جب یہ کوئی چور دروازہ کھولنے کی کوشش کرتی ہیں تو پھر آپ جیسے انا پرست انہیں زندگی کے بوجھ سے آزاد کر دیتے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں

حبہ بھی گل افشاں کی جگہ پر کھڑی ہو جائے؟"
وہ اس کا گریبان پکڑ کر چیخ اٹھی تھی۔ میر ذکاء نے حبہ کو کمرے سے باہر نکل جانے کا اشارہ کیا تھا تو وہ روتی ہوئی بھاگ گئی تھی۔
روشی رو رو کر بے حال ہو گئی تھی۔
"بارہ سال ہو گئے ہیں۔ ان بارہ سالوں میں تم سے کیا مانگا ہے میں نے۔ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو تو سہی۔"
"کیا مجھے ان سے محبت نہیں ہے۔ احساس نہیں ان کا؟ سکول سے ہی اٹھوایا ہے نا تم سمجھاؤ گی تو سمجھ جائے گی۔ ویسے بھی دو تین سال تک میں اس کی شادی کر دوں گا۔"
اس نے گویا بات ختم کر دی تھی، مگر بات ختم کہاں ہوئی تھی۔ دوسری صبح انوکھے رنگ لیے طلوع ہوئی۔ حبہ صبح صبح نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ روشی نے ملازمہ کو اس کے پیچھے دوڑایا۔ حبہ اونچے نیچے راستوں پر اندھا دھند بھاگتے ہوئے کسی گہری کھائی میں گر گئی تھی۔ آناً فاناً مردان خانے میں اطلاع پہنچ گئی تھی۔ حبہ کو کھائی سے نکال لیا گیا تھا۔ مگر اس کا پورا وجود زخمی تھا۔
دو گھنٹے بعد حبہ گھر آ چکی تھی اور سفید پٹیوں میں جکڑی بیڈ پر نیم دراز تھی۔ روشی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا اور وہ غم سے بوجھل دل لیے اس کی روئی روئی آواز سن رہی تھی۔
"مما! مجھے کیوں بچایا ہے؟ جب حبہ پڑھے گی نہیں تو پھر زندہ رہ کر کیا کرے گی۔"
"حبہ! میری بیٹی! ابھی کچھ مت بولو۔ کچھ مت سوچو یہ جنگ اپنی ماں کو لڑنے دو۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے بے ساختہ حبہ کی پیشانی چوم کر کہا تھا۔
"مما! پاپا ہم سے پیار نہیں کرتے نا؟"
"حبہ!" وہ لرز کر رہ گئی تھی۔ "ایسا نہیں سوچتے بیٹا!" وہ باپ سے بدگمان ہو رہی تھی اور روشی کبھی بھی ایسا نہیں چاہتی تھی۔
"مما!" حبہ کراہی۔
"پلیز حبہ! خاموش ہو جاؤ بولنا تمہارے لیے بہتر نہیں۔" وہ فرمانبردار بیٹی تھی، ماں کی بات مان کر خاموش ہو گئی۔

✦❋✦

"جوہی! کیا کر رہی ہو؟" وہ جو بالکونی سے دور بہت دور کھڑے خان کے دوست کو خان سے باتیں کرتا بغور دیکھ رہی تھی روشی کی آواز سن کر پوری جان سے کانپ کر رہ گئی۔

"بھرجائی! تم ......" روشی بہت کم اس حصے کی طرف آتی تھی اور بالکونی میں تو فرصت سے کھڑے ہونے کا وقت ہی کہاں ملتا تھا اسے۔

روشی، ذکاء خان کے دوست سبطین خان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

"جوہی! اسے جانتی ہو؟"

"نن ......نہیں، پھر بھرجائی! وہ ہکلانے لگی۔

انہوں نے ہنکارا بھرا اور پھر نیچے چلی آئیں۔

✦❋✦

دن کتنے بوجھل اور اداس تھے۔ ان ہی دنوں شانی کی شادی کا بلاوا آ گیا۔ وہ بچوں سمیت "ازبک ہاؤس" چلی آئی۔ پاپا نے شانی کی شادی بہت دھوم دھام سے کی تھی۔ شانی دلہن بن کر بہت خوب صورت لگ رہی تھی اور صامی بھی بہت وجیہ اور خوش باش دکھائی دے رہا تھا۔ ان دونوں کو خوش اور مطمئن دیکھ کر روشی خود کو بہت پُرسکون محسوس کر رہی تھی۔

شانی کی شادی میں ہی روشی نے اتنے بے شمار سالوں بعد ولی بھائی کو دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ گریس فل دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے لبوں پر آج بھی مسکراہٹ تھی اور وہ روشی سے بے حد تپاک سے ملے تھے۔

پھر صامی اور وہ ہنی مون منانے ورلڈ ٹور پر نکل گئے تھے۔ پاپا نے کم از کم ایک بیٹی کے لیے بہترین فیصلہ کیا تھا۔ چاہے انا اور کسی سے ضد کی جنگ میں ہی سہی۔

روشی نے کئی مرتبہ محسوس کیا تھا کہ ولی بھائی اسے دیکھتے ہوئے نہ جانے کن سوچوں کے بھنور میں الجھ جاتے ہیں۔

ادھر ولی بھی ایک اذیت ناک کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ اس اداس اداس پیاری سی روشی کو کیسے اتنی بڑی

حقیقت بتانے کا حوصلہ لاتا۔ وہ کیسے ان دکھوں کے انبار اور پریشانیوں کے بوجھ تلے دبی روشی کے غموں میں اضافہ کرتا۔ وہ کیسے روشانے ذکاء خان کو بتاتا کہ اس کا شوہر برلن میں ایک اور عورت کا شوہر بھی رہ چکا ہے۔ وہ ایک بچے کا باپ بھی ہے۔

ولی نے بہت کوششوں کے بعد اس تلخ حقیقت کو جان لیا تھا کہ ہری پوری کا سردار میر ذکاء خان جو روشانے کا شوہر ہے وہ ہی جیلینا کا بھی شوہر ہے۔

اسی شام لینڈ کروزر پر میر ذکاء اپنے بچوں اور بیوی کو لینے آیا تھا۔ اس نے شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔ ولی نے دیکھا جیسی بے زاری اور نفرت کی لہریں دباتا وہ میر ذکاء خان سے بمشکل مصافحہ کر رہا تھا کم و بیش ایسی ہی ناگواری کی واضح جھلک ولی کو میر کے چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔

ولی کو اپنی نفرت کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی' مگر اسے میر ذکاء کی آنکھوں میں ابھرتی سرخی اور لپکتے شعلوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کس وجہ سے اس سے کبیدہ خاطر ہو رہا ہے۔

ولی کا جی چاہ رہا تھا ابھی دو پل میں اس گھمنڈی انسان کے گھمنڈ کو ریزہ ریزہ کر دے' مگر اس نے اپنی اس شدید خواہش کو دبا لیا تھا۔ صرف اور صرف روشانے کی خاطر...... ہاں روشانے خان کی خاطر ولی خاقان' جیلینا سے کیے گئے عہد سے پھر گیا تھا۔

صرف اس لئے کہ وہ جو روشنی روشانے کی آنکھوں میں اچانک میر ذکاء کو دیکھ کر پھوٹ پڑی تھی اس روشنی کی چمک ولی خاقان کو بہت عزیز تھی۔ عزیز تر تھی۔ یہ روشنی' یہ اجالا سا جو روشانے کے چہرے پر کچھ لمحوں کے لیے بکھرا تھا اسی اجالے اور تابناکی نے اسی ایک لمحے میں ولی کے دل پر نہ جانے کیسے کیسے انکشاف کیے تھے۔

''روشانے خان' میر ذکاء کی محبت میں مبتلا ہے۔''

ولی نے صرف ایک پل میں گویا روشی کے چہرے کا حرف حرف پڑھ لیا تھا۔ یہ ایسا انکشاف تھا جس سے روشانے اور میر ذکاء دونوں ہی ناواقف تھے اور یہ کیسی عجیب بات تھی کہ ولی خاقان اس ''بھید'' کو جان چکا تھا' جو اتنے برسوں میں میر ذکاء نہیں جان پایا تھا۔

''میں روشی کو کسی عذاب مسلسل سے دوچار نہیں کر سکتا جیلی! میں روشی کو اس کے شوہر کی اصلیت نہیں بتا سکتا۔ میں تمہارے بچے کا حق میر ذکاء سے نہیں لے سکتا۔ اگر ایسا کروں تو روشی کے دل پر عذاب اتر آئیں گے۔ وہ اپنے شوہر کی بے وفائی کا دکھ شاید برداشت نہ کر سکے۔ مجھے معاف کر دینا جیلی میں بدعہد ہوں۔''

وہ تلخ سوچوں کے زیر اثر تھا۔ روشی جا چکی تھی۔ اسے جانا ہی تھا۔ وہ تو صرف ولی خاقان ہی ایک موڑ پر ایک مرکز پر ٹھہر چکا تھا اور کسی راستے کی تلاش میں اجنبی دیس کے چوراہوں پر بھٹک رہا تھا۔

✦❃✦

''ہری پوری میں کیسا سانحہ وقوع پذیر ہو گیا تھا۔ شانی بے حد پریشانی کے عالم میں کہہ رہی تھی۔''

''میر ذکاء خان کو چوری اور عروس نامی رائیس زادی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس قدر اثر ورسوخ کے باوجود بات دبنے کے بجائے اخباروں کی زینت بن گئی ہے۔''
ولی نے صامی کے ہاتھ سے اخبار پکڑ کر کھولا۔''سردار میر ذکاء خان اپنی سرداری کی آڑ میں چوری جیسے جرم میں ملوث تھے۔ پورے علاقے میں امن وامان کی صورت حال تشویش ناک تھی۔ آئے دن ڈکیتی' چوری کی وارداتیں عام ہو رہی تھیں۔ ان کا اصطبل اعلیٰ نسل کے قیمتی گھوڑوں سے بھرا ہوا ہے' جو کہ ان کے خادم خاص مختلف اوقات میں نہ جانے کس کس علاقے سے چوری کر کے لائے تھے۔ علاوہ ازیں اپنی دوست کے ساتھ کوئٹہ سے واپسی پر ڈرائیونگ کے دوران کسی جھگڑے کی بنا پر شدید اشتعال کے عالم میں انہوں نے عروس نامی عورت پر گولی چلا دی تھی۔ تفصیل کچھ یوں ہے۔'' ولی اضطراب کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔
''یہ اخبار والے مبالغہ آمیزی کی حد کر دیتے ہیں۔ چاہے ذکاء بھائی میں بے شمار برائیاں موجود ہیں' مگر یہ چوری کا الزام سراسر جھوٹا ہے۔'' شانی نے سر جھٹک کر آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
''مگر غور طلب بات تو یہ ہے کہ ان کے علاقے میں موجود تھانے میں کون ایسا سورما ہے جس نے ایف آئی آر درج کروائی ہے۔'' صامی پُرسوچ انداز میں بولا۔
''کسی میں اتنی جرأت نہیں۔ یہ کوئی گھر کا بھیدی معلوم ہوتا ہے یا پھر کوئی قریبی دوست جو کہ دوستی کی آڑ میں دشمنی دکھا گیا ہے۔''
''تمہارا کیا خیال ہے!'' ولی بھائی نے شانی کو مخاطب کیا تو وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔
''ذکاء بھائی کے یقیناً دوست تو بے شمار ہوں گے' البتہ سبطین خان ان کا بہت قریبی دوست ہے' کیونکہ اگر وہ اتنا خاص نہ ہوتا تو اسے ذکاء بھائی کبھی بھی ازبک ہاؤس لے کر نہ آیا کرتے۔''
''سبطین خان! یہ کوہاٹ کا رہنے والا ہے نا۔'' ولی کچھ سوچ کر حیرانی سے بولا۔
''ہوں شاید۔'' شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔''آپ سبطین خان کو جانتے ہیں؟''
''ہاں ...... بہت اچھی طرح جس کمپنی سے میں پہلے منسلک تھا وہیں سے مجھے ایک بہت بڑے پراجیکٹ کی آفر ملی ہے۔ پہلے میں نے اس آفر پر غور کرنا مناسب نہیں کیا تھا' کیونکہ پراجیکٹ کا تعلق ہری پوری کے علاقے سے تھا۔ وہاں ایک فروٹ فارم کی بلڈنگ بنائی جانی تھی اور اس فروٹ فارم کو میر ذکاء اور سبطین خان بنوانا چاہ رہے تھے۔ مگر اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے پاکستان میں رہنے کے عرصے میں مصروف رہنا چاہیے۔''
''تو ولی بھائی! کیا آپ ہری پوری جائیں گے۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ آپ وہاں جا کر دیکھیے کہ روشی کس مشکل دور سے گزر رہی ہے اور اب جو یہ ایک اور قیامت منتظر ہے۔ نہ جانے روشی کیسے ان حالات کا سامنا کر پائے گی۔'' شانی ایک مرتبہ پھر رونے لگی تھی۔''نہ جانے میری اتنی پیاری بہن کے نصیب میں کیسے

کیسے امتحان لکھے گئے ہیں۔''

''تم کیوں اس قدر فکر مند ہو رہی ہو۔ بس روشی کے لیے دعا کرو۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کی لڑکی ہے۔''

''ہوں ...... اگر روشی اتنی مضبوط نہ ہوتی تو اب تک ٹوٹ پھوٹ کر مٹی میں مل جاتی۔'' شانی نے رنجیدگی سے کہا۔

ولی حاقان کا دل اور بھی بوجھل ہو گیا تھا۔

✦❋✦

میر ذکاء خان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس خبر نے پورے علاقے پر مہیب سناٹا طاری کر دیا تھا۔ ابھی تک ایف آئی آر درج کروانے والے گمنام آدمی کے نام کے علاوہ کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اورنگ زیب خان غصے اور اہانت کے احساس کے زیر اثر بھڑ بھڑ جل رہے تھے۔

زنان خانے میں گویا صف ماتم بچھی تھی۔

ذکاء خان کی گرفتاری کی خبر نے روشی کو بیک وقت غم اور نفرت کے احساس سے روشناس کروایا تھا۔ وہ دونوں ہی بھیانک جرائم کے الزام میں سلاخوں کے پیچھے تھا۔

اور روشانے خان نے اس کی گرفتاری کے اوّل روز ہی ذکاء خان کی پھانسی کی خبر سننے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔ وہ کسی بے رحم انسان کے لئے اللہ سے رحم کی دعا نہیں مانگے گی۔

وہ اپنی سوچ کو مضبوطی بخش رہی تھی۔

اورنگ زیب خان کے ایڑی چوٹی کے زور کے باوجود ضمانت تک نہیں ہو رہی تھی۔ ان کا خاندانی وقار مٹی میں مل گیا تھا۔

اسے پشاور جیل میں رکھا گیا تھا' کیونکہ عروس کے وارثوں کا تعلق پشاور سے تھا اور انہوں نے وہیں مقدمہ درج کروایا تھا۔ عروس کے خاندان والے کسی صلح' کسی معافی کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اور پھر اسی چوٹ نے اورنگ زیب خان کو خدا کے حضور سر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ گڑگڑا رہے تھے' رو رہے تھے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کر رہے تھے۔

قبیلے کی سرداری کا مسئلہ ہنوز برقرار تھا۔ اصولاً زردس خان کے سر پر دستار رکھنی چاہیے تھی۔ مگر اورنگ زیب خان نے زری خان کو اس سعادت سے محروم کر کے زخام خان کا نام لے لیا تھا۔

زخام خان بہت قابل اور ذہین تھا۔ مگر اس نے سردار بننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے تمام انتظامات مکمل تھے۔

حیرانی کی بات یہ تھی زخام خان کو ناپسند کرنے والی بی جاناں اور دیگر خواتین بھی زری خان کے بجائے زخام خان کو سردار بنانا چاہتی تھیں۔ کوئی بھی زری خان کو پسند نہیں کرتا تھا۔

سب کے نزدیک وہ سرکش، خودغرض اور نافرمان تھا، جبکہ روشی حیران تھی وہ ان لوگوں کی پرکھ پر حیران تھی۔

ذکاء خان کی گرفتاری کے بعد حبہ پھر سے سکول جانے لگی تھی۔ ماہی اور ماہ نور دونوں ابھی بہت چھوٹی تھیں۔ ولی بھائی کی آمد کے ساتھ اس کے بہت سے مسائل حل ہو گئے تھے۔

✦❋✦

ابھی تھوڑی دیر پہلے ملازم نے اسے ایک خط لا کر دیا تھا۔

''میر سائیں کا خط ہے۔''

''اللہ خیر۔'' روشی نے دھڑکتے دل کے ساتھ خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

''غنچہ دہن، سمیں بدن اے جان من! بڑا اونچا اڑنے لگی ہو۔ کیا مجھ پر فاتحہ پڑھ لی ہے کہ لوٹ کر نہیں آؤں گا، یہ جیل ہے اور جیل سے آزادی ناممکن نہیں۔ تم ذرا سنبھل کر رہو اور یہ تمہاری ایکس ممی کا بھائی ہری پور میں گھاس چرنے آیا ہے اور میرے گھر کے معاملات اس کے ساتھ ڈسکس ہونے لگے ہیں۔ مہمان خانے میں رہ کر وہ ڈھول جھونک رہا ہے سب کی آنکھوں میں۔'' سبطین خان کے تو میں نے ہوش ٹھکانے لگا دیئے ہیں۔ آیا تھا ملاقات کے لیے۔ ہمیں کسی ولی خاقان سے فروٹ فارم والا پروجیکٹ مکمل نہیں کروانا۔ وہ واپس کیوں نہیں گیا۔ حبہ دوبارہ سکول جانے لگی ہے۔ تم ہٹ دھرم، ضدی اور ڈھیٹ ہو۔ میں تمہارے سارے بل نکال دوں گا۔ ذرا باہر تو آ لینے دو۔''

''یہ مخبر ہے کون؟ جو اسے ساری خبریں پہنچا رہا ہے۔''

ولی خاقان ایک ہفتہ پہلے ہی تو آیا تھا۔ مما نے ان کا استقبال بہت اچھا کیا تھا۔ انہیں روشی کا رشتہ دار سمجھ کر خوش آمدید کہا گیا تھا۔ وہ اتنا نفیس مزاج، اعلیٰ اخلاق کا مالک تھا کہ مہر افروز نے کئی مرتبہ حسرت سے اسے دیکھا تھا۔ شاید ان کے دل میں یہ خواہش اٹھ آئی تھی کہ یہ شان دار سا بندہ ان کا داماد ہوتا۔

✦❋✦

روشی کو ولی بھائی سے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ بغیر کہے ہی واپس جا رہے تھے۔ جانے سے ایک دن پہلے انہوں نے روشی سے کہا۔

''روشانے! تمہیں ان حالات کا سامنا بہت بہادری سے کرنا ہوگا۔ ذکاء خان کو باہر آتے نہ جانے کتنے سال لگ جائیں۔ بہرحال اس پر بہت مضبوط کیس ہے۔ مقابل پارٹی بھی کم نہیں۔ تم اپنے بچوں پر بھرپور توجہ دو۔ ان کی بہترین تربیت کرو۔ انہیں اس جاگیرداری نظام کا حصہ نہ بننے دینا۔ انہیں کامیاب انسان بنانا۔ میں نے ان چند دنوں میں یہاں کے پورے سسٹم کا جائزہ لے لیا ہے۔ یہ کیسی دیمک ہے جو یہاں کی نسلوں کو چاٹ رہی ہے۔ عورت جو ہر روپ میں قابل احترام ہستی ہے۔ ان لوگوں نے اپنی بہنوں، بیٹیوں کے لیے ایک

ایک قبر کھود رکھی ہے، جس میں وہ گھٹ گھٹ کر مر رہی ہیں۔ میں خود بھی آزادی نما فحاشی کے حق میں نہیں ہوں، مگر اس طرح ایک عورت کو ایک بچی کو بنیادی حقوق سے محروم رکھنا کہاں کا انصاف ہے۔

دیکھو روشی! ہمارے درمیان نہ کل کچھ تھا' نہ آج کچھ ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میری آمد کے ساتھ ذکاء کی تایا زاد بہنوں نے کچھ داستانیں بنا لی ہیں۔ کوئی بھی طوفان روشانے کی ہستی کو تہس نہس کر دے اس سے پہلے مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

اور ہاں روشانے شانی کی شادی میں تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک۔ بہر حال مصروفیت میں شادی کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ اب سوچ رہا ہوں۔ کسی کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے تمہارا تعاون چاہیے اور روشی! میں تم سے ایک عہد لے رہا ہوں۔ اس عہد کا پاس رکھنا۔ کسی اور کو گل زیبا اور گل مالا بننے مت دینا۔ گل افشاں کی طرح کسی اور کے دامن میں ذلت اکٹھی نہ ہو۔ کوئی اور گل افشاں گھر کے ملازم کے ساتھ نہ بھاگے۔"

وہ اتنا درد بھرا دل رکھنے والا ولی خاقان اسی شام واپس لوٹ گیا تھا اور ایک عہد کی ڈور اس نے روشی کے ہاتھ میں تھما دی تھی اور روشی نے دل سے اس عہد کی پاس داری کا عہد کیا تھا۔

وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی' جب ملازمہ نے روشی کو چند چیزیں تھماتے ہوئے کہا۔

"یہ مہمان سائیں یہاں بھول کر چلے گئے ہیں۔ ان کی ایک قمیص بھی ادھر رہ گئی ہے۔ وہ بہت جلدی میں تھے اور انہوں نے شفاہی (ملازمہ) سے سامان بیگ میں رکھنے کے لیے کہا تھا' مگر شفاہی نے شاید دھیان نہیں دیا۔"

"ہاں ٹھیک ہے میں ان کی چیزیں ایبٹ آباد شانی کو بھجوا دوں گی۔" روشی نے لاپروائی سے شاپر پلنگ پر رکھ دیا۔ پھر مہر افزوں کے پکارنے پر باہر نکل گئی۔

واپس آئی تو ماہی اور ماہ نور دونوں شاپر کے ساتھ الجھ رہی تھیں۔ ایک مردانہ قمیص' ہیئر برش اور پرفیوم کی بوتل قالین پر پڑی تھی۔ اب وہ دونوں اس چھوٹے سے سیاہ رنگ کے مردانہ پرس کو ایک دوسرے سے چھین جھپٹ رہی تھیں۔ پرس کی شاید زپ بھی ان دونوں نے کھول لی تھی' تبھی تو ولی کے کئی کاغذات بھی قالین پر بکھرے دکھائی دے رہے تھے۔

روشی نہیں ڈپٹتے ہوئے چیزیں سمیٹنے لگی۔ کاغذات میں سے ایک تصویر نکل کر نیچے گر گئی۔ روشی نے تصویر اٹھا کر دیکھا۔ کسی انگریز لڑکی کی تصویر تھی۔

"او...... تو یہ ولی بھائی کی پسند ہے۔"

نہ جانے کیوں ایک پل کے لیے دل میں کسک سی ہوئی تھی' مگر دوسرے ہی پل وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔ "کیا میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ اتنا پیارا شخص میرے جوگ میں تمام عمر تنہا رہے۔ زندگی کے سفر میں ایک

ساتھی کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ یہ لڑکی بہت خوش قسمت ہے' جسے آپ کا ساتھ ملے گا۔''

وہ تصویر پرس میں رکھنے لگی تو تصویر کی پشت پر لکھے نام کو دیکھ کر زمان و مکان اسی کی نظروں میں گھومنے لگے تھے۔

''جیلینا ذکاء خان۔'' روشی نے پاگلوں کی طرح ان کاغذات کو کھول کر دیکھا۔ اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ کاغذات میں نکاح نامہ بھی موجود تھا۔ نکاح نامے پر تفصیلات اور پتا ہری پور کے اسی سردار کے گھر کا تھا۔ روشی کو لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ میر ذکاء سے نفرت کے دعوے کرنے والی اس کی ایک اور منکوحہ کا نام دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

وہ تو آج تک یہ ہی سمجھتی رہی تھی کہ میر ذکاء باہر جتنی بھی عورتوں سے ملتا ہے کوئی بھی ان میں سے اس کی برابر نہیں کر سکتی' مگر ایک فرنگن اسے اپنے برابر میں کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ آج روشی کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ باہر کی ان تمام عورتوں سے بھی بدتر ہے جن سے ذکاء خان کے روابط تھے۔

وہ کیسے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھری تھی کہ خود کو سمیٹنا محال تھا۔ تمام رات روتے تڑپتے گزر گئی تھی۔ زخام باہر جا چکا تھا۔ زردس خان کو قبیلے کا سردار بنا دیا گیا تھا اور اس کے سردار بنتے ہی زندگی نے ایک اور بھیانک رخ دیکھ لیا۔

زردس خان نے گل افشاں اور گلریز خان کو ڈھونڈ کر قتل کروا دیا تھا۔ پھر اس نے منان' حنان' سبحان اور ریان کو کانونٹ سے اٹھوا کر علاقے کے گورنمنٹ سکول میں داخل کروا دیا۔ حبہ کے سکول جانے پر پھر سے پابندی لگ گئی۔ اس کے آٹھویں کے امتحان ہونے والے تھے۔

روشی غم و غصے سے پاگل ہوگئی تھی اور اسی اشتعال کے عالم میں وہ زردس خان کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ گویا روشانے کا ہی منتظر تھا۔

''غصہ مت کرو بھرجائی! سکون سے بات سنو میری۔'' وہ بہت تحمل سے مٹھاس بھرے انداز میں اسے سمجھانے لگا تھا۔

''میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں' مگر اپنے بچوں کا مستقبل داؤ پر نہیں لگا سکتی۔'' وہ گویا پھٹ پڑی۔

''بھرجائی! تحمل سے بات سنو۔ حالات بہتر نہیں ہیں۔ عروس کے گھر والے ہمارے خون کے پیاسے ہیں اور میر ذکاء کے بچوں کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ حبہ کو قطعاً سکول مت بھیجنا ورنہ ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑے گا ہمیں۔'' وہ رسانیت سے گویا ہوا۔

''اونہہ' اتنے ہی وہ لوگ غیرت مند ہیں تو معصوم بچوں کے بجائے میر ذکاء کے گریبان پر ہاتھ رکھیں بزدلوں کی طرح کے کھیل مجھے کسی خوف میں مبتلا نہیں کر سکتے۔ میرے بچے ضرور پڑھیں گے۔'' اس کا انداز اٹل تھا۔

''ٹھیک ہے بھرجائی! میں تو اپنے بھائی کی بچی کھچی عزت و ناموس بچانے کی غرض سے کہہ رہا تھا۔ جیل جا کر اس نے ہمارے حسب نسب کو مٹی میں رول دیا ہے' اب اگر کوئی نقصان ہو گیا تو شرم سے کہیں منہ چھپانے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔''

وہ اتنے آرام سے مان جائے گا روشی کو قطعاً امید نہ تھی مگر اب......

روشی مطمئن ہو گئی تھی۔ حبہ پھر سے سکول جانے لگی تھی۔ اس کے آٹھویں کے فائنل امتحان ہو گئے تو روشی نے سکون کا سانس لیا۔

ماوی کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی تھی۔ خنیا بھی تین بیٹیوں کی ماں بن چکی تھی۔

✦❋✦

روشی نے ولی خاقان کا سامان واپس بھجوایا تو اس کی کال آ گئی۔ بہت عرصے بعد وہ ان کی آواز سن رہی تھی۔

''روشی! تم نے میرے سامان کو کھول کر دیکھ لیا ہے نا۔'' وہ بڑے وثوق سے کہہ رہا تھا۔

''نہیں ولی بھائی!'' اس نے بڑے اطمینان سے جھوٹ بولا۔

''مجھے یقین ہے روشی کہ تم نے اس حقیقت کو جان لیا ہے جو میں تم سے چھپانا چاہتا تھا۔'' وہ اپنی افسردگی چھپا نہیں پایا تھا۔

''میں نے کچھ نہیں جانا۔ سب کچھ جان کر بھی۔'' اس کی آواز میں بہت مضبوطی تھی اور ولی خان اس پہاڑوں جیسی بلند روشانے کے حوصلوں کو سراہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''روشی! اگر اب بات کھل چکی ہے تو مجھ پر اور جیلینا پر ایک احسان کر دو۔''

''کیسا احسان؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''اپنے عزت مآب شوہر سے جیلی کو قانوناً طلاق دلوا دو۔ میرا مطلب ہے کہ ذکاء خان سے کہو جیلی کو طلاق تحریراً دے۔''

''طلاق ......تو کیا جیلی طلاق لینا چاہتی ہے؟''

''ہاں' وہ کسی منافق اور دوغلے انسان کے نام پر زندگی کیوں گزارے۔ اس کے باوجود کہ جیلی کا ایک بیٹا بھی ہے۔''

''بیٹا......تو کیا ذکاء خان کی اور اولاد بھی موجود ہے۔'' روشی کا دل کسی پاتال میں گر رہا تھا۔

''پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ جیلی سے جھوٹ بول دوں گا کہ مجھے ذکاء خان کا اتا پتا نہیں مل سکا' مگر میں اس معصوم کو مزید دھوکے میں نہیں رکھ سکا۔ میں اسے سب کچھ بتا چکا ہوں اور بحیثیت مسلمان کے جیلی طلاق کے بعد میرے ساتھ نکاح پر رضا مند ہے۔ مجھے یہ معاملہ تمہارے علم میں لانا پڑا تھا۔ میں جیلی کی تصویر اور نکاح

نامہ جان بوجھ کر وہاں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے تمہیں دکھ دیا ہے روشی! مجھے معاف کر دینا' کیونکہ اس کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔'' وہ شرمندگی سے کہہ رہا تھا۔

''احسان تو آپ نے مجھ پر کیا ہے ولی بھائی! ورنہ میں تمام عمر خوش فہمی میں ہی مبتلا رہتی۔ بہرحال آپ جانتے تو ہیں ذکاء خان جیل میں ہے اور عنقریب شاید ضمانت ہو جائے۔''

''او کے روشی! اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا' اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' لائن منقطع ہو چکی تھی اور روشی کسی شمع کی مانند لحہ بہ لحہ پگھلنے لگی تھی۔

✦❋✦

چند دن بعد حبہ کا رزلٹ حسب معمول شاندار آیا تھا۔ وہ اب پھر سے سکول جانے لگی تھی۔ ایک دن صبح صبح سبطین خان آ گیا۔ اس نے روشی سے تنہائی میں ملنے کی بات کی۔ مما نے زنان خانے کا ڈرائنگ روم کھلوا دیا تھا۔ سبطین خان' میر ذکاء کا پیغام لایا تھا۔ روشی بڑی سی چادر میں خود لپیٹے اندر آئی تو سبطین خان احتراماً کھڑا ہو گیا۔

''السلام علیکم بھرجائی!''

''وعلیکم السلام۔'' وہ نشست پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''بھرجائی! یہ میرو کا خط ہے۔'' اس نے جیب میں سے ایک سفید لفافہ نکال کر روشی کی طرف بڑھا دیا۔

''آپ یہیں پڑھ لیں اور مجھے جواب دیں۔''

''میں کاغذ قلم منگوا لوں۔''

''نہیں آپ نے جو کچھ کہنا ہے مجھے بتا دیں۔ میں فون پر ذکاء سے بات کر لوں گا۔''

روشی نے اثبات میں سر ہلا کر جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اس دفعہ کی تحریر پہلے سے مختلف تھی۔

''روشانے! ان تاریخوں میں حبہ کو سکول میں مت بھیجنا۔ کچھ دنوں کے لیے اسے گھر بٹھا لو۔ اسے میری درخواست سمجھ لینا ضدی عورت! میرا دشمن عنقریب بہت گہرا وار کرنے والا ہے۔ بچوں کا خیال رکھنا۔ اپنا خیال تو تم بہت اچھی طرح رکھتی ہو۔ کہنے کی ضرورت نہیں' آخر لوگوں سے تعریفیں جو وصول کرنی ہوتی ہیں۔ لوگوں کی ستائش بہت عزیز ہے تمہیں کہ سات بچوں کی ماں تو نہیں لگتی روشانے۔ ماہی اور ماہ نور کو پیار دینا۔ چھوٹی دنوں جیل میں بہت یاد آتی ہیں۔ سبطین خان کو جواب دے دو۔''

''ٹھیک ہے آپ خان کو بتا دیں' حبہ سکول نہیں جائے گی۔''

''شکریہ بھرجائی! اب چلتا ہوں۔''

''آپ کچھ دیر رُک سکتے ہیں۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔'' کچھ سوچ کر روشی آہستگی سے بولی۔

''کیوں نہیں، آپ کہیے۔''
''خان پر جو الزام ہیں کیا وہ سچ ہیں؟''
''کمال ہے بھرجائی! آپ بھی مشکوک ہیں۔'' وہ بڑے تاسف کے عالم میں بولا۔ ''مجھے آپ سے اس سوال کی امید نہیں تھی۔''
''اگر یہ الزام سچ نہیں ہیں تو خان ان کی تردید کیوں نہیں کرتا۔ وہ تو یوں لگتا ہے اقبال جرم کیے بیٹھا ہے۔'' روشی جز بز سی بولی۔
''ایک دن سچائی سب پر واضح ہو جائے گی۔ آپ بھی کچھ انتظار کیجیے۔''
''یہ عروس کا کیا معاملہ ہے؟''
''سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔ اس دفعہ معاملہ جرگے کے پاس نہیں قانون کے ہاتھ میں ہے اور یہ بھی ذکاء خان کے دشمن کی ایک چال ہے' کیونکہ جرگہ والوں کی جرأت نہیں تھی کہ سردار پر انگلی اٹھاتے۔''
''اگرچہ سردار کتنا ہی بے انصاف اور جابر کیوں نہ ہوتا۔'' وہ کٹیلے لہجے میں بولی۔
''میر ذکاء خان کی خوش نصیبی پر ہر لحاظ سے رشک آتا ہے' مگر یوں لگتا ہے وہ آپ کا اعتماد جیتنے میں ناکام رہا ہے۔'' سبطین خان مبہم سا مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔
''بچوں کا خیال رکھیے گا بھرجائی! میر کو بچوں کی بہت فکر تھی۔ چلتا ہوں اللہ حافظ۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔
''اونہہ! ناکام تو تب ہوتا جب اعتماد جیتنے کی کوشش کرتا۔ اسے اور عورتوں کی قربتوں سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی جو میری طرف متوجہ ہوتا۔'' وہ سلگتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

✦❋✦

دو ہفتے گھر میں رہنے کے بعد حبہ سکول جانے لگی تھی اور اسی دوپہر وہ سنگین حادثہ پیش آ گیا تھا جو میر ذکاء کو جیل میں بھی پریشان کر رہا تھا۔ حبہ کو سکول سے واپسی پر دو باڈی گارڈز کی موجودگی کے باوجود اغوا کر لیا گیا تھا۔ اس خبر نے پورے زنان خانے میں کہرام مچا دیا۔
روشی اپنی بیٹی کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ رو رہی تھی' گڑگڑا رہی تھی۔
اور ادھر میر ذکاء کا جیل سے فون آ گیا۔
''ہٹ دھرم عورت! اگر میری بیٹی شام سے پہلے گھر نہ آئی تو پوری بستی کو آگ لگا دوں گا۔''
روشی فون سن کر لہرا کر زمین پر آ گری۔ گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ زخام کو بھی اطلاع مل گئی تھی اور سہ پہر کو وہ بھی لوٹ آیا تھا۔ زردس خان اپنا سارا رسوخ استعمال کر چکا تھا۔ میر اورنگ زیب تو پورے قد سے ڈھے چکے تھے۔ مزید ذلت اٹھانے کا ان میں حوصلہ نہیں تھا۔ تب ہی صدمے سے نڈھال روشی کو گنجور نے آ کر

کہا۔

''بی جاناں آپ کو بلا رہی ہیں۔'' روشی تھکے تھکے قدم اٹھاتی بی بی جاناں کے کمرے میں آ گئی۔

روشی میکانکی انداز میں چلتی ہوئی ان کے قریب بیٹھ گئی۔ بی جاناں بول نہیں سکتی تھیں' مگر اشارے سے اسے کچھ سمجھا رہی تھی۔ شاید تسلی دینا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا لرزتا کانپتا ہاتھ روشی کے سر پر رکھ دیا تھا۔ بارہ سالوں میں پہلی مرتبہ اپنی سگی نانی کی طرف سے یہ تسلی نما شفقت روشی کے حصے میں آئی تھی۔ بی جاناں غوں غاں کرتی نہ جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے اپنی ملازمہ خاص گنجور کو بلایا اور گنجور ان کی آنکھوں کے اشارے سمجھ کر سر ہلا رہی تھی۔ بی جاناں نے پھر سے روشی کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''ہم نے سوچا تھا احمد خان کی بیٹی دو دن بھی یہاں ٹک نہ پائے گی' مگر تم نے ہمارے اندازوں کو غلط ثابت کر دیا۔ ہم تمہارے معترف ہیں' اور مان گئے ہیں کہ احمد خان کی بیٹی قول کا پاس اور دستار کا بھرم رکھنا جانتی ہے۔ تم پر ایک امتحان آیا ہے بیٹی! اللہ تمہیں کامیاب کرے گا۔ وہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ جھکنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' گنجور بتا رہی تھی۔

ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ روشی ان کی پائنتی سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی اور پھر مغرب سے کچھ پہلے انہوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لی تھیں۔

اسی وقت حبہ بھی گھر آ گئی۔ زخام کے بازو کے گھیرے میں خوف زدہ سی حبہ کو روشی نے جھپٹ کر سینے میں بھینچ لیا تھا۔

''زری خان حبہ کو لے کر آیا ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

✦❃✦

زری خان کی ہر طرف دھوم تھی۔ اس نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنی اسٹیٹ کے انتظام سنبھال لیے تھے۔ گل افشاں اور گلریز خان کو قتل کروانے کے بعد پورے علاقے میں ویسے بھی اسے پسندیدگی کی سند مل گئی تھی۔ اب علاقے میں امن و امان کی صورت حال نظر آ رہی تھی۔ چوری' ڈکیتی جیسی وارداتیں اور آئے دن کے جھگڑے اور قتل و غارت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

ایک دن زری خان نے روشی سے کہا۔

''میں ان تمام فرسودہ رسومات کا خاتمہ کر دوں گا بھر جائی! تم دیکھ لینا۔''

اور روشی واقعی حیران تھی۔ زری خان نے نچلے طبقے کے مزارعوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو زرعی زمین میں سے کچھ حصہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے بستی کے کئی غریب گھرانوں کی کفالت کا بیڑہ اٹھا لیا۔ گھر میں ملازمین کی فوج میں کمی ہو گئی تھی۔ زری خان بے جا اسراف کے حق میں نہیں تھا۔ نوکروں پر اٹھائے جانے والے اخراجات سے ایک عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ یہ ایک مدرسہ کی عمارت تھی جہاں بچیوں کو دینی اور دنیاوی تعلیم

سے آراستہ کیا جانا تھا۔

ان سب کوششوں کے باوجود زری خان اپنے پیاروں کے دلوں میں اپنے لیے محبت کی جوت نہیں جگا سکا تھا۔مما اور بابا جان اب بھی اسے دیکھ کر منہ موڑ لیتے تھے۔ بابا جان اب مستقل گھر میں قیام کرتے تھے۔ ان کی صحت پہلے سے کافی بہتر تھی۔مگر وہ ابھی مکمل طور پر صحت مند نہیں تھے۔مہر افزوں ساری دنیا بھلائے شوہر کی خدمت میں جتی تھیں۔

زخام نے ایبٹ آباد میں ایک گھر خرید لیا تھا۔کانونٹ سے منان' ریان' سبحان اور حنان کو اٹھوالیا گیا تھا۔ اب وہ اپنے چاچو کے پاس رہتے تھے۔حبہ کو بھی زخام اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ خود انہیں سکول سے لے کر آتا تھا اور خود چھوڑ کر آتا اور بچوں کی کامیابیوں سے روشی کی سانسیں جڑی تھیں۔

✦❋✦

ابھی تک کیس کی سماعت شروع نہیں ہو سکی تھی اور سبطین خان کا خیال تھا کہ کسی اثر و رسوخ والے آدمی نے سماعت روک رکھی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ مقابل پارٹی فیصلہ سننے کے حق میں نہیں ہے اور جان بوجھ کر طول دے رہی ہے' حالانکہ تین سو دو کے مقدمات کے فیصلے جلد کیے جاتے تھے۔

ان ہی دنوں روشی نے میر ذکاء کو خط لکھا۔

''ذکاء خان! سمجھ میں نہیں آتا کہ ابتدا دعائیہ کلمات سے کروں' تمہارے لیے دعا لکھوں یا بددعا۔ اگر تم میرے سہاگ نہ ہوتے یا میرے بچوں کے باپ نہ ہوتے تو میں کبھی بھی تمہارے پلٹنے کی دعا نہ کرتی۔ اب یہ دعائیں جو میں تمہارے لوٹ آنے کے لیے کرتی ہوں' وہ صرف میری مجبوری ہے' خواہش یا چاہ نہیں۔ بہرحال تم میرے بچوں کے باپ ہو اور میرے بچے تمہارے آنے کے انتظار میں دن گن گن کر گزار رہے ہیں۔ یہ مت سمجھنا تمہارے فراق میں پاگل ہو کر خط لکھ رہی ہوں۔ بات تو فقط اتنی ہے کہ اس لفافے میں موجود ایک عدد طلاق نامہ ہے۔ اس پر دستخط کر دو۔ خط میں موجود ایک تصویر بھی ہے اگر بھول گئے ہو تو تصویر دیکھ کر تمہاری یادداشت لوٹ آئے گی تیرہ سالوں سے ایک معصوم لڑکی کو تین لفظوں میں باندھ رکھا ہے۔ واپس آتے ہوئے اسے آزاد کیوں نہیں کیا تھا؟ عجیب انگریز عورت ہے جو انتظار لاحاصل میں عمر ضائع کر رہی ہے۔ خوش قسمت ہو تم۔ باوفا عورتوں کی رفاقت نصیب ہوئی ہے تمہیں۔''

روشی نے دو' چار لفظ گھسیٹ کر خط پیام بر کو دے دیا تھا۔ دوپہر تک وہ جواب لے کر بھی آ گیا۔ روشی نے لفافہ چاک کر کے خط کو کھول کر بے صبری سے پڑھنا شروع کیا۔

''ڈیڑھ سال بعد اگر خط لکھ ہی دیا تو اتنے پتھر مارنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ویسے بھی آج کل میرے ستارے گردش میں ہیں۔ سیدھا کام بھی الٹا ہی ہوتا ہے اور یہ کس حسینہ کی تصویر بھیجی ہے۔ خدا کی قسم! دل باغ باغ ہو گیا ہے دیکھ کر۔ کمال کا شاہکار ہے۔ اس سفید کبوتری کی تصویر اور یہ طلاق نامہ' یار! بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ میں تو پہلے ہی دشمنوں کی سازش کے جال میں پھنسا ہوا ہوں اور پوری یکسوئی کے ساتھ ان الجھی گتھیوں کو سلجھانا چاہ رہا تھا۔ مگر تم اب نیا کھاتہ کھول بیٹھی ہو۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے میری جدائی میں واقعی تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ میری جان کے عذاب' میری

زندگی کے ناسور میری آنکھ کے خواب' صبح نوخیز کے مہتاب! آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ اپنے دماغ میں تو کوئی بات نہیں سمائی۔تم ہی کچھ سمجھا دو۔ یہ سفید کبوتری آخر ہے کون؟''

''اونہہ! عنقریب بہت اچھے طریقے سے سمجھا دوں گی کہ یہ سفید کبوتری کون ہے؟''

روشی نے غصے کے عالم میں خط کو پرزے پرزے کر کے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ اب وہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے ولی بھائی کو فون کیا۔

''آپ کا کیا خیال تھا کہ ذکاء خان اتنی آسانی سے تسلیم کرنے والا ہے۔ وہ صاف مکر چکا ہے کہ وہ کسی جیلینا کو جانتا تک نہیں۔''

''اب کیا ہوگا؟'' ولی لحہ بھر کو خاموش ہی رہ گیا۔

''جو میں چاہوں گی وہ ہی ہوگا۔'' روشی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب......؟''

''آپ جیلینا کو لے کر پاکستان آجایئے۔''

''مگر روشی!'' ولی تذبذب کا شکار تھا۔

''میں جیلینا کو اپنے برابر جگہ دینے کو تیار ہوں۔''

''روشی!'' ولی حاقان دم بخود ہی تو رہ گیا تھا۔

✦❋✦

زری خان نے جوہی کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ جس نے سنا ششدر رہ گیا۔ رئیس غضنفر علی کو زنان خانے کی خواتین نہیں جانتی تھیں۔ بابا جان اپنے چیک اپ کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے۔ آناً فاناً اس رشتے کو طے کر دینے کی آخر کیا وجہ تھی؟ روشی' مما کے آنسو دیکھ کر زری خان سے جواب طلبی کے لیے پہنچ گئی۔

''بھرجائی! بابا جان کی غیر موجودگی میں جوہی کی شادی ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ وہ اعتراض کریں گے۔ جوہی کی شادی کبھی نہیں ہونے دیں گے۔''

''مگر کیوں؟''

''وہ اپنی بیٹیوں کے لیے کسی قابل اور شریف انسان کو پسند کر ہی نہیں سکتے۔'' وہ کٹیلے لہجے میں بولا۔

''مگر بابا جان ایسا کیوں کرتے ہیں؟''

''گہرائی میں جا کر کیا کریں گی۔ بس آپ جوہی کی شادی کی تیاری کریں۔'' زری خان رنجیدگی سے کہتا باہر نکل گیا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' مما نے سنا تو غصے سے بلبلا اٹھیں۔

''مما! غضنفر علی ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ مجھے زری خان نے تصویر بھی دکھائی ہے۔''

''اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ تمہیں زری خان نے بتا دیا ہے۔ وہ کس قدر عیاش آدمی ہے یہ تمہیں اس نے نہیں بتایا ہوگا۔'' مما نے تلخی سے کہا۔

''مما!'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی جب مما نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ''دلاور خان اور حشمت خان ان پڑھ ضرور ہیں' مگر بے کردار یا بددیانت نہیں۔ ماوئی کو بہت سی مشکلات کا سامنا تھا' کیونکہ شوہر اس کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ وہ کانوں کا کچا تھا۔ ماں' بہنوں کی باتوں میں آ کر ماوئی کو کڑوی کسیلی سنا دیتا تھا' مگر وہ شریف اور پاک باز تھا۔ ابھی وقت کی طنابیں حشمت خان کی ماں کے ہاتھ میں ہیں۔ کبھی وقت بدلے گا۔ ماوئی پر بھی ساون کی رُت برسے گی۔ کیا یہ کم ہے کہ حشمت خان پوری برادری کی مخالفت مول لے کر بچیوں کو بڑھا رہا تھا' مگر زندگی نے وفا نہیں کی۔'' وہ بیٹیوں کے حالات سے اتنی بھی بے خبر نہیں تھیں۔ اسی پل گنجور کمرے میں داخل ہوئی۔

''سبطین خان آئے ہیں۔ آپ سے بات کریں گے۔'' وہ مہر افزوں سے کہہ رہی تھی۔

نہ جانے مہر افزوں اور سبطین خان کی آپس میں کیا بات ہوئی تھی۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''نہ جانے کب میرا بچہ آزاد ہوگا۔''

✦❋✦

احمد صاحب نے ذکاء خان کی گرفتاری کی کچھ زیادہ ہی ٹینشن لے لی تھی۔ گل بخت کا فون آیا تھا اور وہ بتا رہی تھی وہ بیمار ہیں۔ انہیں بلڈ پریشر کا مسئلہ تو اکثر ہی رہنے لگا تھا۔ روشی سنتے ساتھ ہی بے چین ہوگئی۔ فوراً مما سے اجازت لے کر از بک ہاؤس آ گئی۔

احمد صاحب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ ان کی صحت قابل رشک ہوا کرتی تھی۔ مگر اس وقت وہ برسوں کے بیمار دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی صدمے کو اپنے اوپر سوار نہیں کیا تھا۔ مگر اس وقت وہ اپنی بیٹیوں کے لیے رنجیدہ تھے۔ شانی کی طرف سے اگر ذہنی سکون تھا تو روشی کی پریشانی انہیں بے چین رکھتی تھی اور گل بخت بتا رہی تھی کہ پاپا' علیزے کی وجہ سے بہت فکر مند ہیں۔ لوگ ان کی بیٹی علیزے کو محض بدصورتی کی وجہ سے ٹھکرا چکے تھے۔

علیزے' حبہ سے کچھ ہی بڑی تھی۔ حبہ میٹرک کے پرچے دے چکی تھی۔ ان دنوں زخام انہیں نادرن ایریاز کی سیر کروانے لے گیا تھا۔ بچے کس قدر خوش تھے' مسرور تھے' گویا کسی قفس سے آزادی ملی تھی انہیں۔ وہ اپنے براڈ مائنڈڈ چاچو سے عشق کرتے تھے۔ جو ظاہری طور پر اپنے بھائیوں سے مختلف تھا ہی' مگر اس کی سوچ اور اس کا دل بھی بہت مختلف تھا۔

روشی نے بہت عرصے بعد علیزے کو دیکھا تھا۔ وہ بڑی ہو چکی تھی۔ اس کا قد حبہ سے کچھ لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ان میں ڈولفن کی طرح ذہانت چمکتی تھی۔ وہ روشی سے بہت تپاک سے ملی۔

''بجو! آپ تو کبھی آئی نہیں ہیں۔ شانی آپی تو ہر روز آتی تھیں۔ اب ناروے چلی گئی ہیں۔ میں ان کے

جانے سے اور بھی اکیلی ہو گئی ہوں۔"

"تم ٹھیک تو ہو گڑیا!" روشی نے اسے پیار سے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اسے علیزے حبہ کی طرح عزیز تھی۔

"آپ کی یہ کالی سی گڑیا ٹھیک ہے۔"

"یوں نہیں بولتے میری جان!" روشی پوری جان سے کانپ کر رہ گئی تھی۔ علیزے کے لب و لہجے میں احساس کمتری بول رہا تھا۔

"سب یہ ہی کہتے ہیں۔ کبھی ممی کے ساتھ مارکیٹ چلی جاؤں تو لوگ حیرانی سے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں۔ ایک دن موٹی سی حمیرا آنٹی نے پوچھ لیا تھا یہ آپ کی میڈ ہے۔" وہ لاپروائی سے کہہ رہی تھی۔ "بجو! میں پاپا جیسی ہوتی تو اچھا تھا نا' دادی تو کہتی ہیں مجھے کوئی بیاہنے بھی نہیں آئے گا۔" اتنی سی عمر میں اسے کیسے کیسے غم اور فکریں چاٹ رہی تھیں۔

"دادی بھی نا...... حد کرتی ہیں۔" روشی تلملا اٹھی۔

"ایسا مت سوچا کرو' تمہیں کیا خبر کہ بعض حسین چہرے کیسے کریہہ اور بدنما ہوتے ہیں۔ خدا کی بنائی کوئی بھی چیز بدصورت نہیں ہو سکتی۔ علیزے خوب صورت ہے' بہت ہی خوب صورت ہے۔"

"آئندہ ایسا نہیں کہوں گی۔" وہ فرماں برداری سے بولی۔

"ہوں...... گڈ گرل۔" اس نے علیزے کی پیشانی چوم لی تھی۔ اثمر اور اشنان کالج سے آ گئے تھے۔ نکلتے قد کے نوعمر نوجوان کے روپ میں۔ ان کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ اپنے اونچے مضبوط بھائیوں کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی تھی۔

"کیا وقت اتنی جلدی بیت گیا ہے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے یہ میرے کندھوں پر جھولا کرتے تھے۔ آج مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لیے کھڑے ہیں۔"

"بجو! تم کہاں غائب ہو جاتی ہو۔ گھڑی دو گھڑی کو صورت دکھا کر۔" اشنان کی محبت بھرے شکوے' اثمر کی ناراضی۔

"تم دونوں نے تو ہری پوری کی سڑکیں گھسا دی ہیں۔"

"سچ آپی! ہم تو روز ہی آ جاتے' مگر یہ علیزے کہیں جانے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور اسے گھر میں تنہا بور ہونے کے لیے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ورنہ یہ سوسائیڈ بھی کر سکتی ہے۔"

اثمر نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ابھی وہ کچھ دن اور اپنی بہن اور بھائیوں کے درمیان رہنا چاہتی تھی' مگر مہر افروز کی فون کال نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔ وہ ماہی اور ماہ نور کو لے کر فوراً ہی ہری پور روانہ ہو گئی۔

ادھر جوہی کی شادی کا فنکشن عروج پر تھا۔ اس نے بمشکل مما کو سمجھایا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں

جبکہ جوہی پتھر کے بُت کی طرح ساکت تھی۔

"یہ سب زری خان کا کیا دھرا ہے۔ مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" وہ صدمے کی شدت سے پھٹی پھٹی آواز میں بولیں۔

"کم از کم بابا جان کو تو آنے دیا ہوتا۔ کیا ان کی غیر موجودگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔" وہ زری خان کو دیکھ کر پھٹ پڑی۔

"بابا جان نے آ کر کیا کرنا تھا۔ وہ ویسے بھی اس رشتے کے حق میں نہیں تھے۔ اب اس بحث کو چھوڑو۔ جوہی کو نکاح کے لیے تیار کرو۔ میں مولوی کو لے کر آتا ہوں۔ ویسے بھرجائی! آج غضب ڈھا رہی ہو۔ کاش! ذکاء خان باہر ہوتا۔" وہ ایک شرارتی مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر باہر نکل گیا تھا۔

"جوہی!" روشی، جوہی کو گرتے دیکھ کر سرعت سے اس کی طرف لپکی۔ "آنکھیں کھولو جوہی! کیوں پریشان ہو رہی ہو، میں ہوں نا۔"

"تم کچھ بھی نہ کر سکو گی بھرجائی! تم زری خان کو جانتی جو نہیں ہو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اسی پل گنجور خوشی سے چلاتی ہوئی اندر آئی۔ "مبارکاں ہوں بی بی صاحب! میر سائیں آ گئے ہیں۔"

"کون بھایا؟" پنا نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر پوچھا۔

"ہاں جی۔"

"میر ذکاء آ گیا ہے۔" روشی گویا خود سے مخاطب ہوئی۔ "اب کیا یہ شادی رُک جائے گی، مگر کیوں؟ میر ذکاء سے کسی رحم دلی کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اور کیا وہ اپنی بہن کو بچا پائے گا؟ اور وہ اپنی بہن کو بچائے گا ہی کیوں؟ بہنوں اور بیٹیوں کی اہمیت ان کے نزدیک بے جان مورتیوں سے بڑھ کر نہیں ہے۔

باہر سے عجیب و غریب شور کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ روشانے بھی پنا کے پیچھے باہر نکل آئی۔ میر ذکاء اور زری خان ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ ایک دم ہی بھانت بھانت کی آوازوں کا شور تھم گیا۔

"زری خان! تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس خطے سے کہیں دور بہت دور نکل جاؤ۔ کبھی مجھے دوبارہ دکھائی نہ دینے کے لیے اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ جو زہر تو نے میرے اندر اتارا ہے اس زہر کو میں تیرے اندر اتار دوں۔ اگرچہ میری ماں کی ماتا میرے راستے کی دیوار ہے، مگر تمہارے جرم اتنے بھاری اور غلیظ ہیں کہ ان کی غلاظت اور سڑانڈ سے تعفن اور وباء پھوٹنے کا خدشہ ہے۔ بولو کیا چاہتے ہو؟" ذکاء خان کی آنکھوں میں غیض و غضب کے رنگ سرخی بن کر چھلک رہے تھے۔

"یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔ تمہاری حیثیت اس علاقے میں کسی ہارے ہوئے جواری کی سی ہے۔ میں ایک سیکنڈ میں تمہارا کام تمام کروا سکتا ہوں۔" زری خان بھی پھنکارا تھا۔

"تجھے عزت، محبت اور خلوص راس نہیں آیا۔ اس میں تیرا قصور نہیں تُو نے جنم ہی ایسی دو نمبر عورت کے بطن

سے لیا ہے اور اس خون کی تاثیر میں بے وفائی ازل سے گردش کر رہی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ مہر افزوں کا دودھ بھی تمہارے اندر نفرتوں کی آگ کو کم نہیں کر سکا۔"

"بکواس بند کرو۔" زری خان چلا اٹھا۔

"تم مائلہ حاقان کی اولاد ہو۔ اسی کی طرح بے ضمیر اور بے غیرت۔" ذکاء خان کے انکشاف نے روشانے سمیت ہر ذی نفس کو پتھرا دیا تھا۔ زنان خانے کی عورتیں حیران تھیں۔

"تجھے ہماری اسٹیٹ پر حکومت کرنا تھی نا' تجھے سرداری چاہیے تھی۔ تو نے اس علاقے کا سردار بننے کے لیے کیسی گھٹیا چالیں چلی ہیں۔ تو آرام سے کہہ دیتا زری خان! یہ سرداری' یہ شان و شوکت تجھ سے زیادہ عزیز نہیں ہیں مجھے۔ تیری نفرت کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہیں۔ ہماری محبت اس نفرت کو کبھی بھی ختم نہیں کر سکی۔ تو نے اس جاہ جلال کی خاطر کیسے کیسے منصوبے بنائے ہیں۔ سوچوں تو شرم آنے لگتی ہے۔ مجھے آج سے بہت برس پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا جب تُو نے مجھ پر ایک انگریز عورت سے نکاح کا جھوٹا الزام لگایا تھا۔ بابا جان کے پاس ابھی تک وہ نکاح نامہ موجود ہے۔ تُو مجھے ہر طرح سے بابا جان کی نظر سے گرانا چاہتا تھا۔ مگر ہوا کیا؟ اپنے مقام سے تُو خود گر گیا۔ اس الزام کے باوجود بابا جان نے میرے سر پر دستار رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگرچہ اس فیصلے کو عملی جامہ بہت عرصے بعد پہنایا گیا۔

پھر تم نے گل افشاں اور گلریز خان کو ورغلایا۔ ان کا نکاح کیا۔ انہیں یہاں سے بھگا دیا۔ صرف اور میری غیر ذمہ داری ثابت کرنے کے لیے۔ اس لیے کہ لوگ جان جائیں میں قبیلے کا سردار بننے کا اہل نہیں ہوں اور انہوں نے مجھے سردار بنا کر ایک غلط فیصلہ کیا ہے۔ اسی دوران مجھ پر قتل کا مقدمہ چل پڑا۔ مجھ پر چوری کا الزام لگایا گیا اور میں اپنے نادیدہ دشمن کو ڈھونڈتا رہ گیا۔ مجھے اک پل کے لیے بھی خیال نہیں گزرا تھا کہ میرا دشمن میری رگ جاں سے قریب تر ہے۔

غضنفر علی کے ساتھ منصوبہ بنا کر عروس کو قتل کر دیا گیا۔ غضنفر علی' عروس کا سابقہ منگیتر ہے اور وہ اس سے جائیداد ہتھیانے کے چکر میں تھا۔ عروس مجھ سے مدد چاہ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ پناہ لینے کی غرض سے ہمارے گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھی۔ اسے قتل کروا کر میری جیپ میں رکھ دیا گیا۔ تمام شواہد میرے حق میں نہیں تھے۔ میرا کوئی گواہ نہیں تھا۔ مجھے ہتھکڑی تو لگنا ہی تھی۔ تم نے تو اپنے باپ' دادا کی عزت و ناموس تک کا خیال نہیں رکھا۔

میرے جیل جانے کے بعد تمہاری دیرینہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ سردار بننے کے بعد تم نے گل افشاں اور گلریز خان کو مروا دیا۔ جرگے والوں نے تمہارے احساس ذمہ داری کو سراہا۔ علاقے میں تمہاری غیرت کے جھنڈے گڑنے لگے۔ پھر میری بیٹی کو اغوا کرتے ہوئے تمہیں ایک پل کو بھی شرم محسوس نہیں ہوئی تھی کہ تم اپنی سگی بھتیجی کو اغوا کر رہے تھے صرف اور صرف مجھے نیچا دکھانے کے لیے۔

روشانے کو بدگمان کرتے رہے۔ اس کی نظروں میں خود کو اچھا ثابت کرنے کے لیے انقلاب لانے کی تقریریں کرتے رہے۔ میرے خلاف نہ جانے کون کون سی داستانیں اسے سنا رکھی تھیں۔ میں عیاش ہوں' آوارہ ہوں' بے کردار ہوں' بددیانت ہوں اور ادھر میرے نام ولی خاقان کو لولیٹرز پوسٹ کر کے مجھے روشانے سے متنفر کرنے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔ آج مجھے بتادو زری خان کہ اس نفرت کی کوئی حد بھی ہے؟''

وہ دکھ اور صدمے کے زیر اثر تھک کر خاموش ہو گیا تھا اور روشانے خان کے دل کی دھڑکن رُک رُک کر چل رہی تھی۔ یہ سماعتیں کیا سن رہی تھیں؟ یہ کیسی حقیقتیں تھیں؟ یہ کیسے سچ تھے؟

''اس نفرت کی کوئی حد نہیں ہے۔ یہ نفرت مجھے بابا جان سے ہے۔ جنہوں نے میری ماں کو کم سنی میں ورغلا کر نکاح کر لیا تھا۔ پھر اپنی خاندانی بیوی کے لیے اسے چھوڑ دیا اور وہ صرف ضد اور انا کی خاطر بابا جان کے تایا زاد بھائی احمد خان سے شادی کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ یہ نفرت مجھے تم سے ہے۔ اس گھر کے ہر فرد سے ہے۔ یہ سب جنہوں نے مجھے دھتکارا۔ میری ماں کو گھر سے بھاگ آنے کے طعنے دیئے گئے۔ کیا وہ خود بھاگ کر آئی تھی؟'' وہ غیض وغضب سے چیخ پڑا۔

''زری خان! میرے بچے! تم کچھ نہیں جانتے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' مہر افزوں کے لبوں کا قفل ٹوٹ گیا تھا اور انہوں نے اس برسوں پرانے قصے پر جمی گرد کی تہوں کو صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''مائلہ اور اورنگ زیب کی شادی تمہارے دادا نے کروائی تھی۔ خاقان ان کا بھتیجا تھا۔ اورنگ زیب اس شادی سے خوش نہیں تھے۔ پھر میری گود میں ذکاء خان نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے بعد مائلہ نے تمہیں جنم دیا۔ مائلہ بہت بے باک لڑکی تھی۔ اسے فیشن بھاتے تھے اور وہ یہاں کے گھٹے گھٹے ماحول سے متنفر تھی۔ اس نے اپنی مرضی سے طلاق لے کر احمد خان کے دفتر میں نوکری کر لی۔ وہ تعلیم یافتہ تھی اور خود کو زنگ لگانا نہیں چاہتی تھی۔ اس وقت مائلہ بھی احمد خان کو اتنا نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اسے یہ پتا تھا کہ احمد خان اورنگ زیب کا تایا زاد بھائی ہے۔ آپس میں رنجشوں کی بنا پر ایک دوسرے سے تعلقات کشیدہ تھے۔

جب ہم نے روشانے کا رشتہ مانگا تھا' تب اسے پتا چلا کہ اورنگ زیب اور احمد خان کا کیا تعلق ہے ایک دوسرے کے ساتھ۔ پھر وہ احمد خان کے ساتھ بھی نہیں رہی تھی۔ تمہیں وہ ساتھ اس لیے نہیں لے کر گئی تھی کہ اسے اورنگ زیب سے اس پوری جائیداد میں سے برابر کا حصہ چاہیے تھا۔ تم صرف دو ماہ کے تھے جب وہ تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میں نے تمہیں ماں بن کر پالا ہے۔ اپنا دودھ پلایا ہے۔ تم سے باقی بچوں سے بڑھ کر محبت کی ہے۔ مگر شاید ہماری محبت میں ہی کھوٹ تھا۔''

مہر افزوں رونے لگی تھیں۔ زری خان دم بخود تھا۔ اسے اپنی ماں کی وہ باتیں یاد آ رہی تھیں جو اکثر وہ خطوط میں لکھا کرتی تھیں۔ اس کے باپ کے ظلم و جبر کے قصے' اپنی بے بسی' اپنے دکھ' خود ساختہ مظالم کی درد ناک داستانیں' یوں کے زری خان کا رواں رواں سلگ اٹھتا تھا۔ اسے خود سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔

''مجھے معاف کر دیں مما!'' ندامت کے بوجھ سے اس کا سر جھک گیا تھا۔

''کس کس سے معافی مانگو گے۔ گل افشاں اور گلریز کے قاتل! ذرا سر اٹھا کر دیکھو۔'' ذکاء خان کا لہجہ کٹیلا تھا۔ روشانے سمیت زنان خانے کی عورتیں حق دق کھڑی رہ گئی تھیں۔ ولی خاقان کے ساتھ ایک دبلی پتلی انگریز عورت سر پر اسکارف باندھے کھڑی تھی۔ اس کے برابر میں ایک نکلتے ہوئے قد کا لڑکا بھی کھڑا تھا۔

''بتاؤ جیلینا! ذکاء خان کون ہے ان میں سے؟'' ولی خاقان اس کا ہاتھ تھامے پوچھ رہا تھا۔

''وہ جس کی آنکھوں کا رنگ فیمی جیسا ہے۔ اس نے مجھے اپنا نام ذکاء خان بتایا تھا؟ یہ جھوٹا' بے ایمان' بے وفا ہے اور اس کے انتظار میں میں نے اپنی زندگی کے چودہ سال برباد کر دیئے۔'' وہ زردین خان کا گریبان پکڑے چلا رہی تھی۔ روشانے کو سانس لینا دشوار ہو گیا تھا۔

''میں نے تم کو واقعی دھوکہ دیا ہے۔ صرف اور صرف ذکاء خان کو جھکانے کے لیے۔ تم بھی میرے پلان کا حصہ تھیں۔ مجھے یہ اسٹیٹ چاہیے تھی' حکمرانی چاہیے تھی' جو کہ میر ذکاء کو بڑے ہونے کی وجہ سے ملنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس اسٹیٹ کو حاصل کرنے کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا اور اسے ہی دھتکار کر میں یہاں سے جا رہا ہوں۔''

''کہاں جا رہے ہو؟'' ولی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔

''کہیں بھی۔''

''اور میں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے تمہاری بیوی اور بچوں کی کفالت کا۔'' وہ غصے سے بولا۔

''پلیز ماما! اس وقت مجھے کچھ مت کہیے گا۔ پہلے سے شرمندگی کے تالاب میں ڈبکیاں لگانے والے کو اور کیا کہنا ہے۔''

''بہر حال جہاں بھی جاؤ اپنی بیوی اور بچے کو ساتھ لے کر جاؤ' بلکہ سیدھے اپنی ممی کے پاس چلے جاؤ وہ بہت بیمار ہیں۔''

''جب آپ آئے تھے تب ہی مجھے سب کچھ بتا دیتے۔'' وہ سب سے نظریں چراتا کہہ رہا تھا۔

''تب میں خود بھی انجان تھا اور مجھے مائلہ آپا نے کچھ دن پہلے ساری سچائی بتائی ہے' انہیں کینسر ہو گیا ہے اور مرنے سے پہلے وہ سچائی بتانا چاہتی تھیں۔''

''اماں! مجھے معاف کر دیں۔'' وہ ایک مرتبہ پھر مہر افزوں کے گھٹنوں پر جھک گیا تھا۔ مہر افزوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

''ادھر تمہاری بے قصور بیوی بھی کھڑی ہے۔ اس سے بھی معافی مانگ لو۔'' ولی نے اسے جیلی کی طرف دھکیلا تھا۔ ''میں اپنی ہی لگائی آگ میں اتنے سال جلتا رہا ہوں اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔'' وہ جیلی کو سینے سے بھینچے کہہ رہا تھا۔

روشانے خاموشی سے منظر سے ہٹ گئی تھی۔ میر ذکاء نے چونک کر روشانے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ماہی کو اٹھائے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

✦*✦

پورے ڈیڑھ سال بعد میر ذکاء کی طرف سے بلاوا آیا تھا۔

''میں بچیوں کو سلا رہی ہوں۔'' اس نے غصے کے عالم میں ملازمہ کو جواب دیا۔ کچھ دیر بعد ملازمہ پھر سے آ گئی تھی۔

''خان غصے ہو رہے ہیں۔ آپ ان کی بات سن لیں۔''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' وہ غصے سے پھنکاری۔ ملازمہ خوف زدہ سی باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد میر ذکاء خود ہی آ گیا تھا۔

''بڑا طنطنہ اور غرور ہے تم میں...... کیوں نہ ہو آخر بی جاناں کی نواسی ہو۔''

''میرے کمرے میں کیوں آئے ہیں؟''

''یہ میرا تمہارا کیا ہوا۔ تمہارے آنے سے پہلے یہ بھی میرا ہی کمرہ تھا۔'' وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا کہنا ہے؟''

''کہنا تو بہت کچھ ہے۔ اگر تم کچھ وقت دو تو۔''

''میرے پاس آپ کے لیے وقت نہیں ہے۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''کیا ابھی تک خفا ہو؟ میری طویل تقریر بھی بے اثر رہی ہے۔'' ذکاء خان نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔

''میں حیران ہوں کہ لوگوں نے چہروں پر کیسے کیسے نقاب چڑھا رکھے ہیں۔ ممی اور یہ زری خان میں اسے کیا سمجھتی تھی اور یہ کیا نکلا۔''

''تمہاری ایکس ممی اس کے اندر زہر بھرتی رہی ہیں۔''

''اور جو اس نے گل افشاں کے ساتھ کیا ہے۔''

''اس کے لیے اللہ تعالیٰ اسے خود سزا دے گا۔ قاتل کی معافی نہیں ہے۔''

''مجھے افسوس صرف اتنا ہے کہ کوئی بھی شخص اگر تمہیں میرے متعلق کچھ بھی بتائے تم فوراً یقین کر لو گی؟ کیا اتنے سالوں میں مجھے صرف اتنا ہی جان پائی ہو۔''

''آپ بھی تو مجھ پر شک کیا کرتے تھے۔'' روشی کو بھی اس کے طعنے تشنے یاد آ گئے۔

''وہ تو محض تمہیں تنگ کرنے کے لیے تھا۔ اگر میرے شکوک اتنے ہی مضبوط ہوتے یا مجھے شک میں مبتلا کرنے والے پر اتنا ہی یقین ہوتا تو ہمارے راستے کب کے جدا ہو جانے تھے۔'' وہ بڑے یقین سے کہہ رہا

تھا۔

''اور یہ عروس کا کیا قصہ تھا؟''

''میرا خیال ہے میں وضاحت کر چکا ہوں۔ وہ میری اچھی دوست تھی۔ اس کا سابقہ منگیتر گرفتار ہو چکا ہے۔''

''اور یہ زری خان اس سے جوہی کی شادی کر رہا تھا۔'' روشی نے تلخی سے کہا۔

''صرف سبطین خان سے عداوت کی بنا پر اس جذباتی آدمی نے یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا' کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ میں جوہی اور سبطین خان کا رشتہ طے کرنے والا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' روشی الجھی۔

''تم اپنی کوئی بات نہیں کر سکتی۔'' وہ جھلا اٹھا۔

''یہ اپنی باتوں کا نہیں' بچوں کے فیوچر کی پلاننگ کرنے کا وقت ہے۔ اپنا ٹائم آپ گنوا چکے ہیں۔ اپنی انا کے گنبد میں قید رہ کر۔'' وہ اس کی پیش قدمی پر پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

''فیملی پلاننگ پر تو سوچا نہیں اب فیوچر کی پلاننگ پر تو لازماً سوچنا پڑے گا۔'' وہ سوئی ہوئی ماہ نور کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولا۔

''میری زندگی میں صرف احمد خان ازبک کی بیٹی کے علاوہ کوئی نہیں۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔'' وہ زچ ہو کر کہہ رہا تھا۔ جانتا تھا کہ روشی بہت بدگمان رہی ہے۔

''خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے جائیں۔ بچیاں آپ کے جذباتی مکالمے سن کر اٹھ جائیں گی۔''

''چلا جاتا ہوں' مگر تمہیں مجھ سے بھی پہلے میرے کمرے میں جانا ہو گا۔''

''خان صاحب زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں۔'' روشی مصنوعی خفگی سے بولی۔

''شکر ہے میں تمہارا سہاگ ہوں اور تمہارے بچوں کا باپ ہوں ورنہ تم کبھی بھی میرے لوٹ آنے کی دعا نہ کرتیں۔'' وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ذکاء خان!'' روشی نے تنبیہاً اسے گھورا۔ وہ ہنستے ہوئے اسے آنے کا اشارہ کر کے پلٹ گیا تھا اور روشانے نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔ آج اتنے سالوں بعد محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صحرا میں چلتے چلتے کسی گلستان میں قدم رکھ چکی ہے۔

✦❋✦

''وقت نے تو بدلنا ہی تھا اور وقت واقعی بدل چکا تھا۔ جب ولی حاقان نے ماویٰ کا ہاتھ مانگا تو بابا جان اور عشق النساء نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ گل مالا اور گل زیبا نے ماویٰ کو رخصت کرتے ہوئے دعا دی تھی۔

ان کی آنکھوں میں حسرتیں اور مایوسیاں نہیں تھیں۔ وہ اپنی چاچیوں کی طرح باقی ماندہ زندگی کو عبادت کے لیے وقف کر چکی تھیں۔ ولی، ماوئی اور اس کی تینوں بچیوں کو لے کر برلن چلا گیا تھا۔

جوہی، سبطین خان کے سنگ رخصت ہو چکی تھی۔ پنا اور پزمان کی شادیاں مہر افزوں کے بھانجوں سے ہو گئیں۔ پری دخت کو گل بخت نے اثمر کے لیے مانگ لیا تھا۔

اور زخام نے اپنے لیے علیزے کو منتخب کر لیا۔ وہ کہتا تھا۔

''بھرجائی! حسن کو اتنے قریب سے ارزاں ہوتے دیکھا ہے کہ حسن سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے یقین ہے میں اور علیزے اچھی زندگی گزاریں گے۔''

زری خان اور جیلی بھی برلن چلے گئے تھے۔

جانے سے پہلے اس نے مدرسہ کا افتتاح کیا تھا اور اپنے حصے کی تمام جائیداد فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دی تھی۔

بابا جان پھر بھی خاموش رہے تھے۔ اب غلطیوں کے کفارے کا وقت تھا۔ سو شاید اسی لیے وہ خاموش تھے اور علم کا چراغ روشن ہونے والا تھا۔

نہ جانے کتنے زمانوں سے اس عمر رسیدہ درخت کے سارے چرمرے، زرد اور بے جان پتے آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ خزاں کسی اور نگر کا رخ کرتی ہمیشہ کے لیے یہاں سے رخصت ہو چکی تھی۔ نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ زندگی مسکرانے لگی تھی اور روشانے خان کی آنکھوں میں اب اس خواب کے طویل سفر سے واپسی کے بعد کوئی تھکن نہیں تھی۔ زرد پتوں کے شجر پر بہار کے سارے رنگ اتر آئے تھے۔

✦❋✦

دریچہ تو کھولیے

سنہری دھوپ نے اپنے پر سمیٹے تو ماہ کامل بھی تسبیح ہاتھ سے رکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ نیلا آکاش سیاہی مائل ہونے کے قریب قریب تھا۔ چڑیوں اور ابابیل کے غول پھدکتے جا رہے تھے۔ سب ہی کو اپنے اپنے آشیانے کی طرف بھاگنے کی جلدی تھی۔ وہ پنجرے میں موجود تیتر اور بٹیر کی جنگ دیکھنے کے بعد سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی تھی۔

آج فاتح کا انٹرویو تھا اور یہ انٹرویو اس کی زندگی کا سب سے مشکل ترین انٹرویو تھا۔ اس نے مقابلے کا امتحان دے رکھا تھا۔ اس کی پوزیشن آٹھویں تھی۔ اب سارا دارومدار انٹرویو پر تھا۔ اس انٹرویو میں کامیابی اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ اگر وہ ناکام ہو جاتا تو شاید مر جاتا۔

فاتح، ماہ کامل کا چچازاد بھی تھا اور منگیتر بھی۔ ابا نے باقاعدہ منگنی تو نہیں کی تھی، تاہم فاتح مطمئن تھا کہ ماہ کامل اسی کی ہے۔ اسی اطمینان کی وجہ سے وہ تعلیمی میدان میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ چھوٹا سا کچا پکا گھر راج اقبال کا تھا۔ مستری اقبال ذات پات کے لحاظ سے خاندانی جٹ تھا، مگر ان کے بزرگوں نے ان کے لیے کوئی اثاثے نہیں چھوڑے تھے، سو پیشے کے لحاظ سے وہ معمار تھا۔ غربت اس کے گھر کی بہت پرانی باسی تھی اور مستری اقبال کا کل سرمایہ اکلوتی بیٹی ماہ کامل اور بھتیجا فاتح تھا۔ فاتح کی تعلیم و تربیت کے لیے مستری اقبال نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔

یہ جیٹھ کی گیارہ تاریخ کی بات ہے۔ گرمی اپنے زوروں پر تھی، جب فاتح نے ماہ کامل سے کہا۔

''ماہے! میں نہر کی طرف جا رہا ہوں۔ دو، چار ڈبکیاں لگانے، یار دوست بھی ساتھ ہوں گے۔ واپسی پر کچھ دیر ہو جائے گی۔''

اس وقت وہ منڈیر پر کھڑی گھر سے کچھ فاصلے سے گزرتی نہر کی طرف دیکھ رہی تھی، جب ایک دم اس کی چیخ نکل گئی۔

''فاتح! جلدی اوپر آؤ، دیکھو تو، کسی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ایک ٹرک، کار سے ٹکرا گیا ہے اور کار نے اتنی

قلابازیاں کھائی ہیں سڑک کے دوسری طرف گری ہے۔ ہائے اللہ! یہ کیا غضب ہو گیا۔ نہ جانے کتنے لوگ تھے کار میں۔'' وہ مسلسل چیختی جا رہی تھی۔

''فاتح! اوپر آؤ۔''

''اوپر بلائے جا رہی ہے پاگل! میں وہاں جا کر دیکھتا ہوں۔'' فاتح اوپر آنے کے بجائے باہر کی طرف بھاگ گیا تھا اور پھر اس کی واپسی تین گھنٹے بعد ہوئی۔ زخموں سے چور چور وہ اجنبی بھی اس کے ساتھ تھا۔ گاؤں کے معالج نے کچھ تو ابتدائی طبی امداد دے دی تھی۔ تاہم زخمی کو شہر لے جانا ضروری تھا۔

ماہ کامل اس وقت دروازے کی چوکھٹ تھامے کھڑی تھی۔ ایک غیر ارادی سی اس کی طرف نظر اٹھی اور پھر پلٹنا بھول گئی۔ حالانکہ سامنے موجود زخم زخم سا وہ اجنبی کوئی یونانی شہزادہ بھی نہیں تھا۔ مگر پھر بھی ماہ کامل کا دل لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھ کر دھڑکنا بھول گیا۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا۔ ہر زخمی جان دار اس کے دل میں گویا گڑ کر رہ جاتا۔

اس اجنبی مہمان کو ہسپتال سے آ کر واپس اس گھر میں رہتے ہوئے دن' ہفتے اور مہینے گزر گئے تھے۔ اس کی مہمان نوازی کرتے اس کی خدمت کرتے' تیمار داری کرتے ہوئے عجیب سا سرور اور خوشی کا احساس دل میں بھرا رہتا تھا۔

''کیا یہ محبت تھی؟'' وہ خود بھی چونک چونک جاتی تھی۔ ٹھٹک ٹھٹک جاتی تھی۔ گھڑی گھڑی پریشان ہوتی' گھڑی گھڑی حیران ہوتی۔ بھلا محبت ایسے بھی ہو جاتی ہے؟

پھر ایک دن اپنی بے قراریوں اور بے چینیوں کو اس نے اجنبی کے سامنے عیاں کر دیا تھا اور وہ گویا اس کی بات سن کر ساکت و صامت رہ گیا۔ گویا پتھر کا مجسمہ ہو اور وہ اپنی ہمیشہ والی سادگی اور معصومیت سے کہہ رہی تھی۔

''مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے ارباب!'' وہ ماہ کامل تھی' یعنی پورا اور مکمل چاند' اس کے کھلم کھلا اظہار محبت نے ارباب کی سانسوں کو لمحہ بھر کے لیے روک دیا تھا۔

''بغیر جانے' بغیر پرکھے' بغیر سمجھے تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے؟'' اس کا لہجہ بلا کا تلخ تھا۔ پیار اور میزبانی کا خیال آڑے آ گیا تھا' ورنہ نہ جانے وہ کیا کچھ بول دیتا۔

''ہاں ......'' وہ پُریقین بھی تھی اور بااعتماد بھی۔

''تم جانتی ہو' میں کون ہوں؟'' وہ ایک دم گہرے' سلگتے لہجے میں بولا۔

''نہیں' مگر تم بتا دو کہ تم کون ہو؟'' ماہ کامل نے بغیر جھجکے سادگی سے پوچھ لیا۔ ارباب کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

✦❋✦

کمرے میں تکلیف دہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس وقت کمرے میں تین افراد موجود تھے۔

''تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟'' وہ گویا تول تول کر بول رہے تھے۔

''میں اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کر چکا ہوں۔''

مبرم نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بہت مضبوط اور ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

''تم جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا؟'' انہوں نے کاٹ دار انداز میں کہا۔

''بخوبی جانتا ہوں' پھر بھی مجھے آپ کا فیصلہ منظور نہیں۔'' مبرم نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''اویس اور گوشی مجھے بہت عزیز ہیں۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔''

''تمہاری معذرت کی ایسی کی تیسی۔'' وہ پھر سے بھڑک اٹھے۔''جمعہ کی شام کو تمہارا نکاح ہے' اچھی طرح سے سن لو۔''

''اور مجھے یہ نکاح نہیں کرنا' آپ بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔ مجھے گوشی سے شادی نہیں کرنا۔ میں شادی کروں گا تو صرف اسی کے ساتھ جس کے ساتھ میری بات طے تھی۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں تھا' جبکہ اماں گویا دل تھام کر رہ گئیں۔

''مبرم!'' باپ کے لہجے میں پھنکار نما دھار تھی۔

✦*✦

فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ اس نے ایک نظر موبائل کو دیکھا تھا' پھر اپنا بے بی پنک ٹاول اٹھا کر گردن اور چہرے سے پسینہ پونچھنے لگی۔ دائیں ہاتھ میں پکڑا ریکٹ اس نے بیڈ پر پھینک دیا تھا۔ بیل ایک دفعہ پھر سے بجنے لگی۔ وہ بے نیازی سے گیلے گردن سے چپکے بال سمیٹ کر کیچر میں جکڑنے کے بعد اپنے جاگرز اتار رہی تھی۔

موبائل کی طرف دیکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس قدر تسلسل سے بیل دینے والا مستقل مزاج کون ہے۔ پھر فون ایک دم بند ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد میسج کی ٹون سنائی دی۔

''تم میرا فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہی ہو؟ فرام مبرم۔''

میسج دوسرے نمبر سے سینڈ کیا گیا تھا۔ وہ اس کی چالاکی پر تاؤ کھا کر رہ گئی تھی۔

اس کے کمرے میں موجود تینوں فون ایک تسلسل سے بجنے لگے تھے۔ لینڈ لائن فون اور وائرلیس کو دانت کچکچا کر دیکھتے ہوئے اس نے سیل فون اٹھا لیا تھا۔ دوسری طرف سے گویا وہ پھٹ پڑا۔

''ٹینس گراؤنڈ سے تمہارے گھر تک کا فاصلہ اتنا تو نہیں ہے جو تم نے پچاسویں بیل پر کال ریسیور کی ہے۔'' اس کے اکھڑے اکھڑے لہجے کو سن کر وہ تلملا ہی تو گئی تھی۔

''دیکھئے مسٹر!'' وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اسے کافی سرعت سے ٹوک دیا گیا۔

''مبرم نیازی! میرا نام مشکل تو نہیں' پھر تمہیں یاد دلانا پڑتا ہے۔'' اس کا لہجہ پھر بھی طنزیہ اور کاٹ دار قسم کا تھا۔ بغیر طنز کیے تو وہ کوئی بھی بات کر ہی نہیں سکتا تھا۔

''کہو' کیا کہنا ہے؟'' وہ گویا سلگ کر رہ گئی۔

''صرف چند گنتی کے دن رہ گئے ہیں شادی ہونے میں' تمہاری طرف سے ابھی تک کوئی آواز بلند نہیں ہوئی' تم جو خاموش رہ کر فرماں برداری کا ایوارڈ حاصل کرنا چاہتی ہو نا' بہت بری طرح سے پچھتاؤ گی۔'' مبرم کا انداز صاف دھمکانے والا تھا' تب ہی تو وہ اور بھی سلگی۔

''اتنے ہی دلیر' جری اور بہادر ہو نا' تو پھر خود اپنے باپ کے سامنے کھڑے ہو کر انکار کر دو' ایک کمزور عورت کو ہتھیار کیوں بناتے ہو؟''

''ویرا! تم اچھا نہیں کر رہی ہو' ابھی بھی وقت ہے' سمجھ لو میری بات' میرے اور تمہارے ستارے نہیں ملتے۔'' ہ گویا چڑ کر چیخا تھا۔ ''میں گوشی سے پیار کرتا ہوں' وہ میری بچپن کی منگ ہے اور میں شادی کروں گا تو صرف گوشی سے۔''

''ایک کے بجائے دس شادیاں کر لو' میری بلا سے۔'' وہ ہمیشہ اسی طرح سے بے نیازی دکھا جاتی تھی۔

''مگر انکار میری طرف سے نہیں ہوگا۔'' ساتھ جتا بھی دیا گیا۔

''خود کو سمجھتی کیا ہو؟'' مبرم کا پارہ چڑھ گیا۔ ''میری نرمی کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔ اگر اس نام نہاد منگنی کو توڑنے کی ہمت تم میں نہیں تو پھر میرے ساتھ دوزخ میں جلنے کے لیے تیار ہو جانا۔ ایک دن بھی سکھ کا نصیب نہیں ہوگا تمہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ دوزخ میں جلنے کے لیے تیار ہوں۔ آفٹر آل تم میرے منگیتر ہو' دو سال سے یہ ایک تولے کی موٹی سی زنجیر نما چین تمہارے نام کی پہن رکھی ہے۔'' ویرا بھی اسے جلانے سے باز نہیں آتی تھی۔

''تو ...... تم انکار نہیں کرو گی۔''

''نہیں۔'' اس نے صاف جھنڈی دکھا دی۔

''تمہیں میرے ساتھ شادی پر اعتراض ہے تو خود اپنے والد بزرگوار سے کہو' ایک طرف پیار پیار الاپتے ہو اور دوسری طرف چار ایکڑ زمین سے ہاتھ دھونے کا غم بھی جان کو لگا رکھا ہے۔ گوشی سے اتنی محبت ہے تو لعنت بھیجو زمین جائیداد پر۔'' اس نے چار مربع کو چار ایکڑ محض اسے جلانے کے لیے کہا تھا۔

''چار ایکڑ ...... اس زمین پر میں دس مرتبہ لعنت بھیجتا ہوں۔'' وہ اس کے طعنوں کے جواب میں بلبلا اٹھا۔ ''تم جیسی خود غرض لڑکی کو کیا خبر کہ خاندان سے کٹ کر رہنا کس قدر مشکل ہے۔''

''یا خاندان بچا لو یا محبت۔'' اس نے صاف طنز کیا۔

''میں تمہارا حشر کر دوں گا۔ پچھتاؤ گی۔ تم۔ مگر وقت تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہو گا۔'' اب وہ اپنے

خطرناک ارادوں کا رعب ڈال کر اسے خوف زدہ کرنا چاہ رہا تھا۔

''تم جیسے ''بہادر'' آخر میں دھمکیوں پر ہی اتر آتے ہیں۔ تمہارے بھیجے میں یہ بات کیوں نہیں سما سکتی کہ تم مرد ہو کر اپنے باپ کے مقابل کھڑے ہونے سے ہچکچاتے ہو تو میں کیسے اپنی جان نچھاور کرنے والے باپ کو دکھ دینے کا سوچ سکتی ہوں۔ اگر تم بے بس ہو تو میں تم سے دس گنا زیادہ مجبور ہوں۔'' وہ گویا تڑخ کر بولی۔

''ہونہہ' مجبور۔'' وہ طنز سے بولا۔ اس وقت باپ کا خیال کر لینا تھا جب یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے مری جا رہی تھیں۔ ٹینس گراؤنڈ میں شوق پورا کرتے ہوئے ہی باپ کا خیال کر لیتیں۔ شہر کی سڑکیں ناپتے ہوئے کون سی مجبوری تمہیں باندھے ہوئے ہے۔ یہاں نیاز پور میں آ کر سارے کس بل نکل جائیں گے۔ ہماری عورتیں یوں آزادانہ نہیں گھومتیں۔ سچ میرے منہ سے نہ ہی نکلتا تو بہتر تھا تاہم تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں یہ سب تمہارے منہ پر ہی کہہ دوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ تم میرے ''معیار'' پر پورا ہی نہیں اتر سکتیں۔ تمہاری سوچ' رہن سہن اور طرز زندگی میرے معیار سے میچ نہیں کر سکتے۔ سو ہمارے راستے جدا ہی رہیں تو بہتر ہیں۔'' وہ بولتا ہی چلا گیا۔

''بات یہ ہے کہ تمہارے جیسے حاکمانہ نیچر کے آدمی کی انا بہت بے چین ہے۔ تمہیں ایسی عورت پسند ہے جس پر تم حکومت کر سکو۔ گوشی میں تمہیں اپنا آئیڈیل نظر آتا ہے۔ خوف زدہ' دبو اور بے زبان گائے جبکہ میری صورت میں تمہارے حاکم پسند مزاج کی تسکین نہیں ہو سکتی۔'' وہ ویرا ہی کیا جو دو بدو جواب نہ دے۔

''جسٹ شٹ اپ۔'' مبرم یکدم دھاڑا۔ اسے ویرا کا یہی انداز آگ لگا دیتا تھا۔ ''تم انکار کرو گی اور ضرور کرو گی۔''

''انکار کرتی ہے میری جوتی۔'' غصے میں وہ بھی دیہاتی پن پہ اتر آئی تھی کہ جڑیں تو آخر دیہات سے ہی تھیں۔ شاخیں اگرچہ کہیں کہیں شہروں میں نکلتی تھیں۔

''میں گوشی سے شادی کر کے رہوں گا۔''

''شوق سے کر لینا۔ پہلے ادھر بارات لے کر آنے کی تیاری کرو۔'' ویرا گویا خوب لطف اٹھا رہی تھی۔

''نیاز پور میں آنے کے بعد ''عیاشیوں'' کو بھول جانا۔ بڑی سخت زندگی ہے یہاں کی۔ کیوں خود کو عذاب میں ڈالنا چاہتی ہو۔''

''مجھے کالے پانی کی سزا بھی قبول ہے' صرف اپنے بابا جانی کے لیے۔''

''بڑی فرماں بردار ہو؟ تمہیں اس سعادت مندی پر کوئی میڈل تو ہرگز نہیں ملے گا۔'' وہ گہرے کاٹ دار لہجے میں بولا۔

''اچھا' اب غصہ تھوک دو۔'' ویرا نے موضوع بدلنا چاہا۔ لہجہ بھی خاصا نرمی لیے ہوئے تھا۔ اس نرمی کا مبرم پر خاطر خواہ اثر ہوا۔

''دیکھو ویرا میں نے اپنی ماں اور گوشی کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے۔ ابو محض مجھے جھکانے کے لیے تمہیں درمیان میں لے آئے ہیں۔ تم ویل ایجوکیٹڈ ہو۔ یہاں آ کر اپنی شناخت کیوں کھونا چاہتی ہو۔ میں کسی کے ساتھ بھی زیادتی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

میرے گھر میں تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ نہ محبت نہ عزت' نہ خلوص نہ پیار۔ میں سچ کہہ رہا ہوں میری تین عدد بہنیں اور ماں' گوشی کے علاوہ کسی اور کو میرے ساتھ دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ان کا رویہ کبھی بھی تمہارے ساتھ اچھا یا بہتر نہیں ہو سکے گا۔ ابو اس ضد میں بہت نقصان اٹھائیں گے' لیکن سب سے زیادہ تمہارا ہوگا۔''

''مجھے تو یہ بہترین ایڈونچر یا پھر کوئی مزیدار سا چیلنج نظر آ رہا ہے۔ دیکھیں گے کہ کیا کیا ہوتا ہے۔'' وہ یوں بول رہی تھی گویا کسی اور کے متعلق گفتگو کر رہی ہے اور مبرم اپنی اتنی لمبی تقریر کو بے اثر جاتا دیکھ کر پھر سے شائستگی کا چولا اتار بیٹھا۔

''ٹھیک ہے' تو پھر بھگتتی رہنا۔ کل کو مجھے کسی بھی بات پر ذمہ دار مت ٹھہرانا۔ میں نے من و عن سچائی تم تک پہنچا دی ہے۔ میرے ہاتھ صاف ہیں۔ ضمیر مطمئن ہے اور میں تم پر بار بار واضح کر رہا ہوں کہ میں شادی کروں گا تو صرف گوشی سے۔ تم صرف نام کی حد تک بیوی ہوگی۔''

اس نے ایک ایک لفظ گویا چبا چبا کر ادا کیا تھا اور پھر کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ ویرا جو کافی دیر سے خود کو مضبوط کیے ہوئے تھی' ایک دم بھربھری ریت کی طرح بکھر بکھر گئی۔

مبرم کی فون کال نے اسے بے حد اپ سیٹ کر دیا تھا۔

مبرم کا لہجہ' انداز اور باتیں اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں گویا' اور یہ نئی بات تو نہیں تھی۔ جب سے چاچا جی اس کی مبرم کے ساتھ منگنی کر کے گئے تھے' تب سے ہی ایسی صورت حال کا سامنا تھا۔ دو سال ہو چکے تھے اس نام نہاد منگنی میں چاچا جی کے علاوہ اس کے بابا ہی موجود تھے۔

ہوا کچھ یوں کہ چاچا جی زمینوں کے کیس کی تاریخ بھگتنے کے لیے شہر آئے تھے۔ جب بھی وہ شہر آتے تھے ان کا قیام ان ہی کے گھر میں ہوتا۔ بابا اور چاچا جی میں پیار بھی بلا کا تھا۔ بابا چھوٹے بھائی کو آج تک ادب و احترام سے بلاتے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ یونیورسٹی سے نمایاں کامیابی کے بعد فارغ تھی۔ اسے دوران تعلیم ہی ایک دو پرائیویٹ کالجز سے لیکچرر شپ کی آفرز مل رہی تھیں' سو اس نے آئی ٹی ایم کالج میں اپنی سی وی بھجوا دی تھی۔

چاچا جی کو اس کی کامیابی کی خبر کیا ملی' وہ مٹھائی کے ٹوکروں سمیت ان کے گھر آ موجود ہوئے۔ ساتھ وہ ایک بہت ہی خوبصورت ڈیزائن کی کافی بھاری سونے کی چین لائے تھے اور بڑی محبت سے انہوں نے وہ چین

اس کے گلے میں پہنا دی تھی۔ وہ چاچا جی کی پسند کو خوب سراہنے کا سوچ رہی تھی' جب چاچا جی نے پاپا کے ہاتھ محبت سے تھامتے ہوئے کہا۔

''آج سے ویرا بیٹی میرے مبرم کی امانت ہوئی۔''

وہ بڑی آس بھری نظروں سے بابا کو دیکھ رہے تھے۔ بابا کی طرف سے مثبت ردعمل نے چاچا جی کو گویا ہفت اقلیم کی دولت سے نواز دیا تھا۔

اس زبانی کلامی منگنی کے بعد نیاز پور سے کبھی چاچی یا مبرم کی بہنوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ حتیٰ کہ کسی نے ٹیلی فونک رابطہ رکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اکثر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مبرم اور چاچی وغیرہ کے سرد رویے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ان دو سالوں میں بار ہا مبرم چاچا جی کے ساتھ اپنے کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں شہر آتا رہا تھا۔

مبرم کو کئی مرتبہ قریب سے دیکھنے کے بعد اور اس سے پہلے بھی وہ اس نئے رشتے کی بدولت اپنے دل میں کافی نرم جذبات محسوس کرنے لگی تھی۔

مبرم کے لیے یہ میٹھے میٹھے جذبے وقت کے ساتھ ساتھ نشوونما پا رہے تھے۔ پھل پھول رہے تھے۔ اپنی جڑیں مضبوط کر رہے تھے۔

اگرچہ اس نے گوشی کے بارے میں بھی کافی اڑتی اڑتی خبریں سن رکھی تھیں' مگر ان خبروں کی صداقت پر اسے یقین نہیں تھا۔

نیاز پور والوں سے اس کا رشتہ بہت گہرا اور اٹوٹ تھا۔ اس کے بابا اور چاچو جی صرف دو بھائی تھے۔ دونوں میں بلا کا اتفاق اور پیار تھا۔ چاچا جی پڑھائی میں کچھ کمزور تھے جبکہ اس کے پاپا بہت ذہین اور محنتی۔ سو تعلیم کے میدان میں وہ چاچا جی سے آگے نکل گئے تھے۔

پاپا کی شادی بھی شہر میں ہوئی تھی سو وہ مستقل شہر میں ہی شفٹ ہو گئے تھے۔ ویرا ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس سے چھوٹے تین بھائی کم سنی میں ہی وفات پا گئے تھے۔ منگنی سے ایک سال پہلے اس کی بہت ہی حلیم الطبع امی بھی انہیں تنہا چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔

امی اور چاچی کے تعلقات بالکل روایتی سے تھے۔ چاچی کافی تنک مزاج تھیں۔ بہت موڈی اور نک چڑھی خاتون تھیں۔ شاید وہ کچھ کچھ احساس کمتری کا شکار بھی تھیں۔ انہوں نے بھی خیر سے سکول کا منہ تک نہیں دیکھا تھا۔ تاہم چاچو کو اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا خاصا شوق تھا۔ مگر ان کا اکلوتا نور چشم ان کی اس خواہش کو شاید قسطوں میں پورا کرنا چاہتا تھا۔

چاچا کی خواہش تھی کہ مبرم انگریزی میں ماسٹرز کرے اور وہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھجوا دیں گے' مگر مبرم تھا پکا زمین دار...... اپنی سونا اگلتی زمینوں کا عاشق' وہ یونیورسٹی آف ایگری کلچر فیصل آباد سے زراعت میں

ماسٹرز کرنے کا خواہشمند تھا' مگر چاچا جی کی ضد نے اسے بھی "ضد" دلا دی تھی اور وہ کسی بھی طریقے سے ان کی خواہش پوری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو ابھی تک ایم اے فائنل کی کلاسز بڑے شوق سے اٹینڈ کرتا تھا۔ اس کے کلاس فیلوز اب تک عملی زندگی میں بھی قدم رکھ چکے تھے' مگر مبرم کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ بھی بلا کا ضدی' ڈھیٹ اور بددماغ واقع ہوا تھا۔

چاچا اگر سیر تھے تو مبرم سوا سیر۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا ایم اے پارٹ ون کے فائنل ایگزامز میں بھی چاچا زبردستی مبرم کو پکڑ کر اس کے پاس لے آئے تھے۔ وہ شکل سے ہی بے حد بیزار لگ رہا تھا اور اب فائنل ایگزامز میں بھی وہ اسے ویرا کے پاس لے آئے تھے۔

"میں پرچے پر کچھ لکھوں گا' تب ہی پاس کریں گے نا۔"

مبرم نے ناک چڑھا کر زیرلب کہا تھا۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ چاچا کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا ورنہ یہ دونوں باپ بیٹا کافی ...... بدلحاظ واقع ہوئے تھے۔

بغیر کسی لحاظ کے ایک دوسرے پر تاک تاک کر حملے کرتے۔

چاچا تو اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے' مگر وہ مبرم ہی کیا جو وہاں ٹک کے کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتا۔ چاچا کے چلے جانے کے فوراً بعد وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ان سے پہلے ہی باہر بھی نکل گیا تھا' مگر تھوڑی دیر بعد پھر سے واپس آ گیا۔ ویرا صوفے پر اطمینان سے بیٹھی میگزین دیکھ رہی تھی' مگر اس کا سارا دھیان مبرم کی طرف تھا۔ وہ اپنی جیبیں ٹٹولنے کے بعد اب صوفے کے کشن اٹھا اٹھا کر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب کافی دیر کی تلاش کے بعد وہ ناکام ہوا تو بظاہر لاپروا بنی ویرا کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم نے میری گاڑی کی چابی دیکھی ہے؟"

"چابی' کون سی چابی؟" وہ چونک کر یوں اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی' گویا اس کی موجودگی کی اسے قطعاً خبر نہیں تھی۔

"میری گاڑی کی چابی۔" مبرم دانت پیس کر گویا ہوا۔

"نہیں۔"

وہ صاف مکر گئی تھی۔ حالانکہ چاچا نے مبرم سے نظر بچا کر چابی اسے تھما دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے چلے جانے کے بعد مبرم آوارہ گردی کے لیے نہ نکل سکے۔

"ابو نے ضرور تمہیں چابی دی ہوگی۔" وہ بھی ٹلنے والوں میں سے نہیں تھا۔

"میرے پاس نہیں ہے اور میرا دماغ مت چاٹو۔ اگر پڑھنا چاہتے ہو تو جو کچھ میں کہوں گی' وہی کرنا ہو گا۔"

"تم سے میں پڑھوں گا' ہونہہ۔" مبرم نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

''تو نہ پڑھو' لیکن سوچ لو' چاچا کو کتنا دکھ ہوگا۔'' اس کی بے نیازی عروج پر تھی۔

''بڑی آئی چاچا کی ہمدرد۔'' مبرم نے طنز کیا۔

''میں تو چاچا کے بیٹے کی بھی ہمدرد ہوں۔''

''اونہہ! مجھے کسی ہمدرد کی ضرورت نہیں۔''

''اچھا چھوڑو' چائے پیو گے؟'' ویرا بھی اسے باہر نکلنے سے روکنا چاہتی تھی۔ چاچا جی نے بہت دفعہ تاکید کی تھی کہ مبرم کو باہر آوارہ گردی کے لیے نہیں جانے دینا۔

''میں نہیں پیتا چائے وائے۔''

''تو پھر کیا پسند ہے؟''

''میرے کھانے پینے کی آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' مبرم خوامخواہ تڑخا۔

''کیوں تمہاری اماں گوشی کو تو یہاں بھیجنے کا پروگرام نہیں بنا رہیں؟''

''گوشی تمہاری طرح ہر جگہ دندناتی نہیں پھرتی۔ ہمارے ہاں رواج نہیں کہ رشتہ داروں کے گھر لڑکیاں جا کے قیام کریں۔'' وہ بھی دل کی جلن زبان تک لانے میں قطعاً ہچکچاتا نہیں تھا۔

وہ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگی۔ ''سینڈوچ اور کوک لاؤں تمہارے لیے؟'' اس نے ایک دفعہ پھر موضوع بدل دیا۔

''سینڈوچ اور کوک تمہیں ہی مبارک ہوں۔ میں تو انبالہ جا رہا ہوں۔'' وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''شوق سے جاؤ۔'' وہ بھی ہاتھ جھاڑتی کھڑی ہوگئی۔ ''مگر جاؤ گے کیسے؟'' بڑی معصومیت سے پوچھا جا رہا تھا۔

''پبلک ٹرانسپورٹ کس مرض کی دوا ہے۔'' وہ استہزائیہ ہنسا۔ ''میری گاڑی کی چابی کسی مزار پر چڑھا دینا یا پھر چاچا جی واپس تشریف لائیں تو چپکے سے ان کے ہاتھ میں دب دینا تاکہ جاتے ہوئے کسی شوروم میں دیتے جائیں۔'' مبرم بھی دل کی جلن زبان پر لے آیا۔

''اپنا والٹ چیک کر کے جانا ڈیئر کزن! کہیں انبالہ والے بل پے نہ کرنے کے جرم میں تم سے ڈش واشنگ کروانا نہ شروع کر دیں۔'' کچن کی طرف جاتے جاتے اس نے شگوفہ چھوڑا تھا۔ مبرم نے بے اختیار اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا دیا تھا اور پھر اس کا دل سچ مچ دھک سے رہ گیا۔ والٹ جیب میں نہیں تھا۔

''میرا والٹ کہاں ہے؟''

''میرے پاس۔'' وہ اطمینان سے ٹرے سجاتی بولی۔

''بھاڑ میں جاؤ تم۔'' وہ دھپ دھپ کرتا غصے کے عالم میں سیڑھیاں چڑھ گیا تھا' جبکہ ویرا دیر تلک ہنستی رہی تھی۔ وہ اسے روکنے میں کامیاب تو ہو چکی تھی سو اب اطمینان کے ساتھ سینڈوچز کی طرف متوجہ ہوگئی۔ یہ

سارے سینڈوچ اس نے اب اکیلے ہی کھانے تھے۔

✦❃✦

ویرا کے دادا کی نیاز پور میں خاصی زمینیں تھیں۔شہر میں دو پلاٹ بھی تھے۔شہر والے پلاٹ بھی بیچ کر انہوں نے مزید زمینیں خرید لی تھیں۔مختصر سی اولاد تھی' سو اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے مگر ویرا کے پاپا جب مزید پڑھنے کے لیے شہر چلے گئے تو دادا کو اپنی جلد بازی پر بلا کا افسوس ہوا۔اگر وہ پلاٹ نہ بیچتے تو شہر میں ایک گھر بنا ہی سکتے تھے۔

پاپا کی جاب کیا لگی' وہ مصروف سے مصروف تر ہوتے چلے گئے تھے۔گویا نیاز پور کا راستہ ہی انہیں بھول گیا تھا۔دادا کے بعد چاچا جی ہی تھے جو باقاعدگی سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے اور انہوں نے فاصلوں اور دوریوں کو کبھی درمیان میں آنے دیا تھا۔

پاپا اور امی بہت کم گاؤں جاتے تھے سو امی کی چاچی کے ساتھ بے تکلفی بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔امی بھی انہیں خاص پسند نہیں کرتی تھیں اور وہ بھی امی سے خوب خار کھاتی تھیں۔

امی کی وفات کے بعد بھی چاچی کے ساتھ تعلقات بحال نہیں ہو پائے تھے۔وجہ صرف اتنی تھی کہ چاچی کو بے شمار خدشات لاحق تھے۔

پہلا خوف تو انہیں یہ تھا کہ کہیں چاچا جی اپنی اکلوتی بھتیجی کا رشتہ مبرم سے طے نہ کر دیں۔اگر ایسا ہو جاتا تو پھر ان کی اکلوتی بھانجی گوشی بھلا کہاں جاتی۔

گوشی سے ان کی محبت کا انداز ہی کچھ الگ تھا۔بہن اور نشئی بہنوئی کے مرنے کے بعد وہ گوشی کو اپنے گھر لے آئی تھیں۔ان ہی کی مہربان گود میں گوشی نے پرورش پائی تھی۔سو اب وہ اپنی لاڈلی بھانجی کو بہو بھی بنانا چاہتی تھیں۔مگر چاچی اور گوشی کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے' جب انہیں اطلاع ملی کہ چاچا جی ویرا کے ساتھ مبرم کا نام جوڑ آئے ہیں۔یعنی مبرم اور ویرا کی بات طے ہو گئی تھی۔

چاچی اور ان کی بیٹیوں نے آج تک اس منگنی کو تسلیم نہیں کیا تھا اور مانتا تو مبرم بھی نہیں تھا' مگر جب چاچا نے اسے اپنی جائیداد سے عاق کر دینے کی دھمکی دی تھی تو مبرم نے خوامخواہ ویرا سے عداوت پال لی تھی۔

مبرم کی آمد کے دوسرے دن ہی چاچی میراں بھی کشاں کشاں چلی آئی تھیں۔بیٹے کی جدائی انہیں بھلا گوارا ہی کہاں تھی' مگر شوہر کی وجہ سے مجبور ہو گئی تھیں۔جوان کے لاڈلے کو عالم فاضل دیکھنا چاہتے تھے۔اسی شوق کے ہاتھوں وہ مبرم کو یہاں چھوڑ کر گئے تھے۔انہیں پورا یقین تھا کہ مبرم کی توجہ ویرا کی طرف مبذول کروانے کے لیے سارے پاپڑ بیلے جا رہے تھے۔

چاچی کی آمد سے ویرا بھی خاصا بوکھلا گئی تھی کہ چاچی کے میزائل اور بم بارود کا مقابلہ کرنا آسان کہاں تھا۔

یہ پہلی صبح کی بات تھی۔ ویرا اپنے دھیان میں مگن ناشتہ بنا رہی تھی' جب چاچی دبے قدموں کچن میں داخل ہوئیں۔

"کیا کر رہی ہو؟" آواز اور انداز ایسا تھا کہ ویرا بری طرح سے بوکھلا گئی۔

"ناشتہ بنا رہی ہوں۔" سلام کے بعد اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

"لسی' ریٹرک گئی ہے؟" انہوں نے اردگرد کا جائزہ لے کر کافی نخوت سے پوچھا۔ چاٹی اور مدھانی تو کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"جی۔" وہ توس ٹوسٹر میں سے نکال رہی تھی۔ ساتھ ساتھ آملیٹ بھی بن رہا تھا۔

"مبرم کا ناشتہ بن گیا۔" اس نے میز کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "آپ بیٹھیئے وہاں۔"

"کیوں؟" وہ تنک کر بولیں۔ "تم نے نظر بچا کر چائے میں تعویذ ملانا ہے۔"

"جی نہیں۔" ویرا سمجھ کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

"بھلا مجھے تعویذوں سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟"

"چاچی! ایک غلط فہمی تو اپنے ذہن سے نکال دیں۔" ویرا کا انداز پُرسوچ قسم کا تھا۔

"کیسی غلط فہمی؟" وہ ناک چڑھا کر بولیں۔

"یہی کہ آپ کا ستون کی طرح لمبا اور برآمدے جتنا چوڑا بیٹا میری ننھی سی مٹھی میں کیسے آ سکتا ہے۔" اس کی سادگی بھرے انداز میں بھی شرارت چھپی تھی۔

"باتیں بنانا تو بہت آتی ہیں۔ ماں سے بس یہی کچھ سیکھا ہے۔" چاچی بھی بیٹے کی طرح طنز کے تیر پھینکنے کا سلیقہ رکھتی تھیں اور یہ تیر عین نشانے پر لگتے تھے۔

"نہیں' سیکھا تو اور بھی بہت کچھ ہے۔ کبھی فرصت کے لمحوں میں بتاؤں گی۔" اس کا انداز مصروف قسم کا تھا۔ آج اس نے کالج جانا تھا۔ صبح کے اس کے تین پیریڈ ہوتے تھے اور باقی کا وقت وہ فری ہوتی تھی۔ سو اسے ابھی کالج جانے کی تیاری بھی کرنا تھی۔ مبرم ابھی تک نیچے نہیں اترا تھا۔ آج بھی یقیناً اس کا چھٹی مارنے کا ارادہ تھا۔ وہ کچھ سوچ کر مبرم کے کمرے میں چلی آئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ نیند میں دھت تھا۔ اسے غصہ آ گیا' کمرے کی حالت ابتر تھی۔

"مبرم! اٹھ جاؤ۔" وہ ساتھ ساتھ چیزیں بھی سمیٹ رہی تھی' مگر مبرم ٹس سے مس نہ ہوا۔

"آج پھر چھٹی کرنے کا ارادہ ہے؟" اب کے اس نے کچھ نرمی سے پوچھا تھا۔

"ہاں۔" بڑی خوش دلی سے بتایا گیا۔ اگرچہ آواز سوئی سوئی سی تھی۔

"کیوں؟"

"بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔"

''بہانے مت بناؤ۔'' وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔ ''کیا چاچا جی کو فون کر کے بتاؤں؟'' اس کا انداز دھمکانے والا تھا۔

''بتا دو۔''

''کیا ہوا' کیوں مبرم کے سر پر سوار ہو؟'' چاچی بھی ان کے مذاکرات سننے کے لیے آ پہنچی تھیں۔

''کچھ نہیں چاچی! بس مبرم کو جگانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ بہت بگاڑ رکھا ہے آپ نے اس کو۔ چار دن اور میرے پاس رہا تو تیر کی طرح سیدھا کر دوں گی۔ دعائیں دیں گی آپ مجھے۔'' اس نے پانی کا جگ اٹھا کر بھرپور طریقے سے چاچی کے منع کرنے اور چلانے کے باوجود مبرم پر پھینک دیا تھا۔ پانی سے نہانے کے فوراً بعد ہی وہ اچھل کر اٹھ گیا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے۔'' وہ چیخا۔ نیند سے آنکھیں بھاری تھیں۔ آواز بھی حلق سے نکل نہیں پا رہی تھی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دیکھیں اماں! مجھے کتنا بخار ہے۔'' وہ ہمدردیاں لوٹنے کے چکر میں تھا۔ چاچی کی ممتا گویا تڑپ اٹھی۔

''لڑکی! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ بخار میں اس پر پانی پھینک دیا ہے۔ ہائے میرے اللہ۔'' چاچی بے قراری سے مبرم کا منہ پونچھنے لگیں۔

''کچھ نہیں ہوا اسے ڈرامے بازیاں ہیں ساری۔ آپ خاموش ہو کر تماشا دیکھیں۔'' چاچی کی دہائیوں کو وہ کسی خاطر میں نہیں لائی تھی۔

''اٹھو' یہاں سے۔'' وہ زبردستی اس کا بازو پکڑ کر باتھ روم کی طرف دھکیلنے لگی۔

''لڑکی! نہ کر' بخار ہے اسے۔ اے ویرا! تیرا دماغ تو صحیح ہے۔ اے' چھوڑ بھی دے۔'' چاچی ہکا بکا ہی تو رہ گئی تھیں۔ مبرم کو اس نے باتھ روم میں دھکیل کر باہر سے کنڈی لگا دی۔

''اسے بند کر دیا ہے۔ تیرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ میرا بچہ بخار میں پھنک رہا تھا۔'' ان کا ملال کسی طور کم نہیں ہو پا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مبرم نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا تھا۔ وہ صاف ستھرے حلیے میں باہر آیا تھا۔ نیند بھی غائب ہو گئی تھی۔

''بخار اتر گیا ہے؟'' ویرا نے طنزیہ کہا۔

''میرے متھے مت لگو' سویرے سویرے۔'' وہ سر سے پیر تک جلا بیٹھا تھا۔ ویرا مزے سے مسکراتی ہوئی باہر آ گئی تھی۔ اس سے پہلے چاچی بھی باہر نکل آئیں۔

''میرے بچے کی یہاں تو کوئی حالت نہیں۔ نہ مرضی سے سونا' نہ اٹھنا۔ ایسی پڑھائی کو بھاڑ میں جھونکتی ہوں۔ میرے بچے کی صحت کا ستیاناس مار دیا ہے۔ ہائے' ہائے کیسی جلاد صفت لڑکی ہے۔ نہ سنتی ہے' نہ سمجھتی ہے' بس اپنی چلائے جاتی ہے۔''

''مبرم! ناشتہ کرلو۔'' اس نے چاچی کی تقریر کے جواب میں ہانک لگائی تھی۔ وہ جلدی جلدی ناشتہ کر رہی تھی۔ اسے وقت پر کالج پہنچنا تھا۔ خلاف توقع مبرم جلدی باہر آ گیا تھا اور اسے توس کے ساتھ آملیٹ کھاتے ہوئے دیکھ کر چاچی کا کلیجہ گویا منہ کو آ گیا۔

''یہ ناشتہ ہے؟ سوکھی ڈبل روٹی' تب ہی کہوں مبرم کی صحت کیوں گرتی جا رہی ہے۔ نہ پراٹھا' نہ مکھن' نہ لسی کا گڑوا۔''

''سلائس پر مکھن لگا کر دیا ہے۔ پراٹھا یہ خود نہیں کھاتا۔ پوچھ لیں اس سے اور لسی کا جگ آپ کا مبرم روزانہ ڈکار جاتا ہے۔ یاد رہے پورا جگ۔'' وہ گرما گرم چائے حلق سے جلدی جلدی اتار رہی تھی۔

''ماشاء اللہ نظر مت لگا دینا۔ میرے بچے کی دشمن۔'' چاچی نے نظروں ہی نظروں میں اپنے بچے کی نظر اتار دی۔ ''ویسے نہ چاٹی نہ مدھانی' تو یہ لسی کیسے بنا لی؟'' وہ حیرانی سے چونکی تھیں۔ اچھا اچھا گرینڈر میں بنائی ہو گی' مگر چاٹی کی لسی کا تو اپنا ہی سواد ہے۔ میری گوشی اپنے ہاتھ سے مکھن کے تازہ پیڑے نکالتی ہے۔ بڑی برکت ہے گوشی کے ہاتھ میں۔ چار پانچ پیڑے سے کم مکھن نہیں نکلتا ہے۔''

''کبھی گوشی کے بابرکت ہاتھوں کا نظارہ بھی کر لیں گے۔'' مبرم نے صاف اس کا طنز محسوس کر لیا تھا۔ تب ہی تو اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

''وہ تمہاری طرح زبان دراز نہیں ہے۔ کم از کم بڑوں سے بات کرنے کا سلیقہ رکھتی ہے۔'' مبرم نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''او کے' کبھی تمہاری گوشی سے بڑوں کے ساتھ بات کرنے کا طریقہ سیکھوں گی۔ ایڈوانس میں بکنگ کروا دینا۔ گوشی سے کلاسز لینا ضرور شروع کروں گی۔'' وہ جی بھر کے اسے جلا چکی تھی' تب ہی اپنے خالی برتن سنک میں رکھنے لگی۔

''اسے تمہاری طرح چالاکیاں نہیں آتیں۔ سیدھی سادی سی خدمت گزار صوم وصلوٰۃ کی پابند بچی ہے۔ میری اتنی خدمت کرتی ہے کہ اپنی بیٹیوں کی طرف سے ملنے والے آرام بھول گئے ہیں۔ ایسی سگھڑ سیانی' اس قدر میٹھی طبیعت' باپردہ' باحیا' کبھی گیٹ کے قریب تک نہیں گئی۔ کبھی سر کھلا نہیں چھوڑا۔ آج کل کی لڑکیاں تو گلے میں پٹکے لٹکا کر باہر نکلتی ہیں۔ نہ شرم ہے نہ حیا۔ بھئی میں تو لگی لپٹی کی قائل ہرگز نہیں ہوں۔''

وہ تاک تاک کر اس پر حملے کرتے ہوئے لحہ بھر کے لئے رکیں۔

''میرے گھر بھی بیٹیاں ہیں۔ بے حیائی کے نمونے گھروں میں سجا کر اپنی بچیوں کو بگاڑنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اگر ہماری بچیوں نے تایا زاد کو دیکھ کر رنگ ڈھنگ بدلنے شروع کر دیئے۔ دوپٹے گلے میں لٹکا کر آوارہ گردی کرنے لگیں تو بھائی حلق پر چھری پھیرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔''

''توبہ' توبہ' ایسی خوف ناک' دہشت ناک' غضب ناک اور ہر قسم کی اونچی' نیچی' موٹی پھیلی ''ناک'' والی باتیں آپ کو آتی ہیں چاچی! میرا تو ننھا سا دل آپ نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔'' اپنی طویل دل جلانے والی تقریر کے جواب میں یہ الفاظ سن کر وہ بری طرح سے جلی تھیں۔

''کیسی ڈھیٹ لڑکی ہے انا اور غصہ نام کی چیز نہیں۔ سوچا تھا' طعنے دے دے کر اور باتیں بنا بنا کر اسے متنفر کر دوں گی' مگر یہ تو بڑی استاد ہے۔''

''مبرم! تم کیسے ظالم' خود غرض اور جلاد قسم کے بھائی ہو۔ اتنی معمولی سی بات پر بہنوں کے حلق پر چھری پھیر دو گے؟ ہمارے تو خاندان میں ایسا کوئی ظالم درندہ آج تک پیدا نہیں ہوا۔'' وہ برتن دھوتے ہوئے خاموش بیٹھے مبرم کو بھی چھیڑ رہی تھی۔ مبرم سر جھکائے ناشتے کی طرف متوجہ تھا۔

''میرا بیٹا درندہ ہے؟ کچھ شرم کرو لڑکی! ہائے کیسی قینچی جیسی زبان ہے تمہاری بھابی صاحبہ تو ایسی نہیں تھیں۔'' چاچی کو نہ چاہتے ہوئے بھی بولنا پڑ گیا۔

''ددھیال والوں پہ گئی ہوں اس لیے۔ ذرا اپنے بیٹے کو گفتگو فرماتے ہوئے سنا کریں۔ کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ ایسی باکمال طنزیہ گفتگو فرماتا ہے۔'' اب وہ رگڑ رگڑ کر کچن کی سلیب صاف کر رہی تھی۔

''لو اور سن لو۔'' چاچی نے گویا ہاتھ جھاڑے۔ ''یہ ددھیال والوں پر گئی ہیں یعنی دادی پر۔'' چاچی بھی کوئی نہ کوئی نقطہ نکال ہی لیتی تھیں۔

''اب دادی کی شان میں گستاخی تو نہ کریں۔ بھلا دادی کب گلے میں پٹکا لٹکا کر کالج پڑھانے جاتی تھیں؟'' اس کا انداز بھرپور شرارت لیے ہوئے تھا۔

''میں تمہارے جیسی عالم فاضل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔''

''انہوں نے گویا عاجزانہ طور پر دونوں ہاتھ جوڑے۔

''عالم فاضل تو میں ہوں۔ آپ کے خاندان میں کسی لڑکی تو کجا لڑکے تک نے ماسٹرز کی ڈگری نہیں لی۔'' وہ مبرم پر صاف چوٹ کر رہی تھی۔ محض اس لیے کہ شاید اس کے طنز و طعنوں سے تنگ آ کر وہ اپنی ضد چھوڑ دے اور کیریئر کی طرف دھیان دے لے۔

''کیا فائدہ اس علم و فضل کا' بڑوں کے ساتھ بات کرنے کی تو تمیز نہیں۔'' مبرم کے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

''اور تمہیں بڑوں کے فیصلوں پر سر جھکانے کی بھی تمیز نہیں' یوں ماش کے آٹے بنے اینٹھ رہے ہو۔'' وہ بھی تو جتلانے سے باز نہیں آتی تھی۔

''مری جا رہی ہو' میرے ساتھ شادی کرنے کے لیے۔'' وہ ایک دم زہر خند ہوا۔

''کیا کروں' خوب صورت ہی اتنے ہو' مجھے تمہارے جیسا اِس جہان میں اور اُس جہان میں ملنا مشکل

ہے۔'' اس نے مصنوعی ٹھنڈی آہ بھری۔ وہ کچن سے فارغ ہو چکی تھی۔ اور چاچی من پسند ناشتے سے ...... ایسا لذیذ ناشتہ تو کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا' ایک بات کی تو وہ قائل ہو ہی چکی تھیں کہ ویرا کے ہاتھ ذائقہ بھی ہے اور کام کاج میں بھی پھرتیلی ہے' مگر زبان کی بے پناہ تیز۔

''یہ میری بدقسمتی ہے۔'' اس کا لہجہ اب بھی کٹیلا تھا۔ جب سے منگنی ہوئی تھی' تب سے ہی مبرم یوں ہی اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اب اس میں بھلا ویرا کا کیا قصور تھا۔ وہ کیونکر اپنے پاپا کے سامنے سر اٹھاتی' ان کا دل دکھاتی' جبکہ مبرم میں کوئی کمی تھی بھی نہیں۔ بس مسئلہ تھا تو صرف گوشی کا۔ مگر گوشی کے معاملے میں بھی اس کا بھلا کیا قصور تھا۔

''غم نہ کھاؤ۔'' اب وہ ڈائننگ ٹیبل کا سامان سمیٹ رہی تھی۔ نظریں اس کی گھڑی کی آگے بڑھتی سوئیوں پر تھیں۔ ''یوں کرنا' گوشی سے بھی شادی کر لینا۔''

''بک بک نہ کرو۔'' وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''میری گاڑی سروس کے لیے گئی ہے۔ جاتے ہوئے مجھے بھی ڈراپ کرتے جانا۔'' وہ اپنا بیگ' گلاسز اور فائلیں اٹھا کر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ چاچی سے یہ منظر بھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ نہ جانے بے چاری کے کیسے تاثرات تھے۔ ویرا جلدی میں دیکھ نہیں پائی تھی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی مبرم نے پیشگی کہہ دیا۔ ''واپسی پر خود ہی آ جانا۔''

''آپ فکر نہ کریں شہزادہ عالم! آپ کو زحمت نہیں دوں گی۔''

''تو پھر کیسے آؤ گی؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اسے پوچھنا پڑا۔

''تم لینے آ جانا۔'' وہ ایسے ہی باتوں میں چکرا کر رکھ دیتی تھی۔

''میرے پاس ٹائم نہیں ہوگا۔'' مبرم کو اس کے اسی لہجے سے سخت چڑ تھی۔ عجیب سا رعب جماتا لہجہ تھا۔

''تم نے اے سی کی میٹنگ اٹینڈ کرنا ہے؟'' ویرا کو بھی غصہ آ گیا۔

''اگر مجھے اختیار دیا جاتا تو آج سچ مچ کمشنر ہوتا۔'' وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ گیا۔

''یہ تمہاری بے وقوفی ہے کہ تم وقت ضائع کر رہے ہو' وہ بھی ایک ایسی ضد میں جس کا کوئی حاصل نہیں۔''

ویرا کا انداز ناصحانہ تھا۔ مبرم کو احساس زیاں نے عجیب سے دکھ میں مبتلا کر دیا۔

''یہ سب میرے والد صاحب کی کرم نوازی ہے۔''

''جی نہیں' یہ تمہاری خودساختہ انا اور ضد ہے' ورنہ آج تم کہاں سے کہاں پہنچے ہوتے۔'' وہ لیکچر کے صفحات کو ترتیب دے رہی تھی۔

''ابو نے ہمیشہ ہر مقام پر مجھے ڈی گریڈ کیا ہے۔''

اس کا لہجہ بے پناہ دکھ لیے ہوئے تھا۔ اتنی آسانی سے تو وہ کھلنے والا نہیں تھا۔ نہ جانے کیسے یہ الفاظ اس

کے منہ سے پھسل گئے۔

اس نے گاڑی کی سپیڈ کم کر دی تھی۔ عجیب سی بے چینی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ویرا کے ساتھ اس کا رشتہ ابو نے ہٹ دھرمی اور اسے شکست سے دوچار کرنے کے لئے طے کیا تھا۔

یہ جنگ دو مردوں کے درمیان تھی اور اس جنگ میں دو عورتوں کے جذبات مجروح کیے جا رہے تھے۔ ویرا کو اپنے ساتھ ساتھ گوشی کے جذبات کا بھی بے حد احساس تھا۔

''کیا تم ٹھیک کر رہے ہو مبرم؟''

اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

''مگر یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے' تم اپنا نقصان کر رہے ہو۔''

''نفع ونقصان بھلا کون دیکھتا ہے۔'' وہ ایک پٹرول پمپ کے قریب گاڑی روک چکا تھا۔ ویرا نے گھڑی کی طرف دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔ مبرم جان بوجھ کر اسے لیٹ کروا رہا تھا۔ صبح والا بدلہ لینے کے لیے' ویرا کو غصہ آ گیا۔

''مبرم! سپیڈ بڑھا دو میں لیٹ ہو رہی ہوں۔''

''تو میرے ساتھ نہ آتیں ناں۔''

وہ بھی بلا کا کمینہ تھا۔

''اترو نیچے' میں خود گاڑی ڈرائیو کرتی ہوں۔'' ویرا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کچا چبا لیتی۔

''محترمہ! یہ گاڑی میری اپنی ہے۔'' اس کا انداز صاف جتانے والا تھا۔ ''میری موجودگی میں تم ڈرائیو کرو' یہ مجھے گوارا نہیں۔''

''عورت کی ترقی تم لوگ بھلا کہاں برداشت کر سکتے ہو۔'' ویرا کو رونا آنے لگا۔ آج پھر وہ بغیر وجہ کے لیٹ ہو گئی تھی۔

''آئندہ مجھ پر پانی تو نہیں پھینکو گی؟'' مبرم نے مسکراہٹ دبا کر پوچھا۔ وہ بھی اسے چڑا کر سینے میں ٹھنڈ ڈال چکا تھا۔

''نہیں۔''

''آملیٹ میں چینی تو نہیں ملاؤ گی؟''

''نہیں۔''

''لسی میں نمک تیز تو نہیں کرو گی؟''

''نہیں۔'' وہ گویا بھنا اٹھی۔ مبرم نے مسکراتے ہوئے گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی تھی۔

''اورتمہارے ساتھ کم ازکم کالج جانے کی غلطی بھی نہیں کروں گی۔'' وہ گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔

''نوازش ہے آپ کی۔''

''جاتے جاتے دعا دے کر جاؤ۔'' وہ پیچھے سے ہانک لگاتے ہوئے بولا۔ ''سفر پر جارہا ہوں۔''

''کہاں......؟''

ویرا جاتے جاتے پلٹی۔

''گاؤں......''

''کیا مطلب؟'' وہ چیخ پڑی تھی۔

''وہ ہی جوتم سمجھ چکی ہو۔'' وہ گاڑی زناٹے سے بھگا کر لے گیا تھا۔

''مبرم!'' وہ چیختی رہ گئی تھی۔ ''لگتا ہے اس دفعہ بھی تم فیل ہونا چاہتے ہو۔'' ویرا زیرلب بڑبڑاتے ہوئے افسردگی سے سوچنے لگی تھی اور پھر سر جھٹک کر کالج کے کھلے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

✦❃✦

پورے ڈیڑھ ہفتہ بعد وہ پھر سے گاؤں جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ مگر اس دفعہ ویرا کو چکمہ دینا آسان نہیں تھا۔ اس کا جیب خرچ جو کہ ابو جان نے خیر سے ویرا کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور گاڑی کی چابی اور اس کے کاغذات' حتیٰ کہ سیل فون اور آئی ڈی کارڈ تک ویرا کے قبضے میں تھا۔

ابھی کل ہی تو وہ اس سے دو ہزار روپے مانگنے کے لیے منتیں کر رہا تھا۔ اپنے ہی پیسے کسی دوسرے سے بھکاریوں کی طرح مانگنا کہاں کا انصاف تھا۔ مگر وہ اپنے جلاد صفت ابو کو بھلا کس انداز میں سمجھاتا۔ دونوں ایک دوسرے کی بات الٹ سمجھتے تھے۔ آئے دن ان کی آپس میں ٹھن جاتی تھی اور دونوں میں مہینہ مہینہ بول چال بند رہتی تھی۔ ان دونوں کے سرد تعلقات چاچی کا بلڈ پریشر بڑھانے کا سبب بنتے تھے اور وہ بات کو گھما پھرا کر ویرا کے ساتھ منسوب کر دیتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ سارے فساد کی جڑ ویرا کی ذات ہے۔ حالانکہ ان باپ' بیٹے کے درمیان اختلافات بچپن سے ہی شروع ہو گئے تھے۔

پہلے پہل مبرم کو مبارز نام دیا گیا تھا۔ نام تو خاصا مشکل تھا' مگر چاچی کو خوب پسند آیا' مگر چاچی جی نے معنی معلوم کیے تو پتا چلا کہ مبارز کے معنی تو خاصے خطرناک ہیں۔ جنگجو' سپاہی' فوجی۔

چاچا جی نے سنا اور دل تھام لیا۔ سپاہیوں اور فوجیوں سے سخت الرجک' جنگجو اور لڑاکا لوگوں سے دور بھاگنے والے چاچا جی نے فوراً نام تبدیل کر کے مبرم رکھ دیا۔ اس کے معنی انہیں خوب پسند آئے۔ پائیدار' پکا' مستحکم اور مضبوط۔

چاچا جی بہت خوش ہوئے تھے' مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان پر مختلف انکشافات ہوتے رہتے تھے۔ یعنی کہ ان کا بیٹا ارادوں کے معاملے میں مستحکم' ضد کا پکا' غصہ پائیدار اور مضبوط ترین انا اور اونچی ناک رکھنے والا اسم بامسمیٰ تھا۔ نام شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ عید کے عید بھی وہ کبھی مسکرایا نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک انہوں نے اسے خود سے متنفر ہی پایا تھا۔ حالانکہ بہت سے معاملوں میں وہ خود ہی قصوروار بھی ہوتے تھے' مگر پھر بھی مبرم کا دل جلانے سے باز نہیں آتے۔

''تمہارا نام باسم رکھ دیتا تو بہتر تھا۔ کم از کم کچھ نہیں ہنس مکھ تو ہوتے۔ تمہاری ماں نے بھی اپنے کھیت کے سارے کریلے تڑکا لگا کر تمہاری پیدائش سے پہلے کھا لیے تھے۔''

مبرم کو ابو کی ان ہی باتوں سے تپ چڑھ جاتی تھی۔ اب تو اس کے ضبط کی انتہا ہو گئی تھی۔ یعنی کہ وہ ویرا محمود الحسن نیازی سے فقیروں کی طرح ضرورت کے لیے رقم مانگا کرے گا۔

''بھاڑ میں گئے ابو جی آپ کے حصے کے پورے چار مربع۔'' وہ خالی والٹ لیے سویرے سویرے کچن کے چوکھٹے میں چہرہ سجا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ویرا ہمیشہ کی طرح ناشتہ بنانے میں مصروف تھی۔ بلینڈر چل رہا تھا اور مخصوص گرر گرر کی آواز سماعتوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ مبرم نے ہاتھ بڑھا کر بلینڈر کا سوئچ کھینچ کر نکال دیا تھا۔ یہ ویرا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا طریقہ تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق ویرا اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' مبرم نے تیوری چڑھا کر اپنا خالی والٹ کچن کی سلیب پر زور سے پٹخا۔

''کون سی بے ہودگی؟'' ویرا مصنوعی انداز میں چونکی۔ ''ارے یہ تو والٹ ہے' مگر مجھے کیوں دے رہے ہو؟ میرا نان نفقہ ابھی تمہارے ذمے نہیں ہے۔ صرف منگنی تو ہوئی ہے' ابھی دل بڑا نہ کرو اور والٹ اٹھا لو۔''

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔'' مبرم بھنا اٹھا۔ ''اس والٹ کو نوٹوں سے بھر دو' فوراً اور ابھی۔'' اس کا انداز تحکم لیے ہوئے تھا۔

''نوٹوں سے بھر دوں؟ یا عجائب! کیا نوٹ درخت کے پتے ہیں؟ اور کیا تمہارے دادا کی فیکٹریاں چل رہی ہیں؟'' وہ بغیر برا مانے میدہ گوندھنے میں مصروف تھی۔ آج اس کا ارادہ میٹھی روٹی پکانے کا تھا۔ سو اسی سلسلے میں مصروفیت حد سے سوا تھی۔

''محترمہ! جو رقم آپ کے چچا حضور میرے لیے دے کر گئے ہیں نا' خون پسینہ شامل ہے ان پیسوں میں میرا۔ جون کی کڑکتی دوپہروں اور سرما کی سرد ترین راتوں میں ہل چلاتا اور پانی لگاتا رہا ہوں۔ کوئی احسان نہیں کر رہے وہ مجھ پر' نکالو فٹافٹ میری رقم' سانپ بن کر بیٹھ جاتی ہو۔'' وہ بلبلا کر بولتا چلا گیا۔

''تو نہ زمینوں پر ہل چلایا کرو' کون مجبور کرتا ہے تمہیں۔ آرام سے پڑھو' مقابلے کا امتحان دو اور افسر لگ جاؤ۔ الگ سے ہی ٹھاٹ باٹھ ہوں گے۔'' وہ گندھے ہوئے میدے کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا رہی تھی۔

''وہ زمینیں جو ہیں نا' میرا عشق ہیں ان کی دیکھ بھال' ان کی نشوونما میرا سیروں خون بڑھا دیتی ہے۔ آم کے پھل سے لدے درخت دیکھ کر اور زمین کے پیٹ سے ابلتے ٹھنڈے شفاف پانی کی ٹھنڈک محسوس کر کے میری رگوں میں خون جوش کھانے لگتا ہے۔ اپنی مٹی سے محبت ہر زمین دار کے خون میں دوڑتی ہے۔ کیا تھا اگر میں زراعت میں ماسٹرز کر لیتا' مگر ہمارے بڑوں کی بے جا ضدیں ہمیشہ شوق اور لگن کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔''

اسے نہ جانے کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔ اسی لیے لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''اور مقابلے کے امتحان کے بعد اگر میں افسر بن بھی جاتا' بننا تو میں نے تمہارا ہی شوہر تھا۔ پھر تمہیں

کیوں میرے توسط سے خوشی میسر آتی۔‘‘

’’بھئی مجھے تو تم ہر روپ میں قبول ہو۔ چاہے ہل چلاؤ یا چاہے کمشنر لگ جاؤ۔‘‘ پیڑا نما گولیاں بیل رہی تھی۔

’’نیاز پور میں جا کر دیکھنا زندگی کتنی مشکل ہے۔ یہ آرام‘ یہ نخرے وہاں نہیں ہوں گے۔‘‘ وہ جل کر بولا۔

’’میں گوبر سمیٹ کر اپلے تھاپنے کی اور چاٹی میں مدھانی ڈال کر مکھن نکالنے کی پریکٹس کر کے جاؤں گی۔‘‘ اسے بھی لاجواب کرنا خوب آتا تھا۔

’’صرف کہنے کی باتیں ہیں۔‘‘ مبرم نے تمسخرانہ کہا۔

’’یہ تو وقت بتائے گا۔‘‘ توے پر آئل ڈال کر وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

’’وقت تو تب ہی بتائے گا نا جب میں تم سے شادی کروں گا۔‘‘ مبرم چڑ کر بولا۔

’’یہ زہر تو تمہیں پینا پڑے گا‘ چاہے اپنی پسند سے پینا یا چاچا جی زبردستی پلا دیں گے۔‘‘ وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

’’اور یہ ہی میری بدقسمتی ہے۔‘‘ وہ خوامخواہ دکھی ہو گیا۔

’’غم نہ کھاؤ نا‘ کہا تو ہے تمہاری دوسری شادی کروا دوں گی۔‘‘ اس کا انداز تسلی دینے والا تھا۔ وہ سر سے پیر تک سلگ گیا۔

وہ پہلی سنہری روٹی پلیٹ میں رکھ کر چکھنے لگی تھی۔ ’’واہ‘ مزا آ گیا۔‘‘ اب وہ دوسری روٹی بیل رہی تھی‘ جب مبرم بھنا کر بولا۔

’’میں کچھ بکواس کر رہا ہوں۔‘‘

’’کیوں سیلاب زدگان جیسی صورت بنا رکھی ہے۔ جاؤ میرے پاؤچ میں سے دو سو روپے نکال لاؤ۔‘‘ اس کمال مہربانی سے کہا تھا۔

’’ایسی سخاوت کی صرف تم ہی سے توقع کی جا سکتی ہے۔‘‘ مبرم کا انداز بھرپور طنزیہ تھا۔

’’بھاڑ میں جاؤ تم۔‘‘ مبرم بھنا کر پلٹ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ویرا اسے ہرگز بھی بغیر کسی ضرورت کے پیسے نہیں دے گی سو اس کا رخ پاپا کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ اسے پاپا کے کمرے میں جاتا دیکھ چکی تھی۔ سو اس کا ناشتہ بھی وہیں اٹھا لائی۔ جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے مبرم کو دبی آواز میں کہتے سنا۔

’’پاپا جی ! کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔‘‘ اس نے باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے سیدھے طریقے سے اپنا مطالبہ دہرا دیا۔

’’کیوں بیٹا جی! ایسی کیا ضرورت آن پڑی ہے؟‘‘

وہ صبح صبح اخبار سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اپنے اور اخبار کے درمیان کسی تیسرے کو برداشت نہیں

کرتے تھے۔ اخبار بینی کے شوق میں انہوں نے کبھی ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ بس بھتیجے کی طرح نہار منہ لسی پینا پسند کرتے تھے۔

''پاپا جی! اویس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ مجھے فوراً ہسپتال پہنچنا ہوگا۔'' جھوٹ بولتے ہوئے اس کی آواز لحہ بھر کو ڈگمگائی تھی۔

''اچھا' اویس کا۔'' انہوں نے عینک کے پیچھے سے اپنے لاڈلے کو دیکھا۔

''جی' وہ ہی اویس جو میرا سب سے اچھا دوست ہے۔'' مبرم نے لہجے میں قدرے رقت بھری۔

''یہ اویس کا پانچواں یا چھٹا ایکسیڈنٹ ہے۔ بڑا خوش نصیب بچہ ہے جو دو دن بعد بھلا چنگا ہو کر ہمارے گھر بھی آ جاتا ہے اور ہر دفعہ حادثے میں اسے چوٹ تک نہیں آتی۔''

پاپا نے اطمینان سے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ یقیناً وہ مطالعہ کر چکے تھے۔ اب فرصت میں مبرم کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے دیکھنے کے سٹائل سے مبرم کو خاصی بے چینی ہو رہی تھی۔ ویرا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''جی' واقعی خوش نصیب ہے۔''

''کتنے پیسے چاہئیں؟'' وہ اتنی آسانی سے مان جائیں گے نہ ویرا کو اندازہ تھا' نہ ہی مبرم کو۔

''یہی پانچ چھ ہزار۔'' مبرم نے بے ساختہ خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''ویرا بیٹا! مبرم کو پیسے لا کر دو۔'' انہوں نے اپنے خزانچی کو آواز دی تھی۔ وہ تابع داری سے ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ گئی تھی۔ واپس آئی تو چڑ مڑ سے دو تین نوٹ پکڑ رکھے تھے۔

''صرف اتنے؟'' مبرم نے تین سو روپے دیکھ کر بمشکل غصے کو ضبط کیا۔

''تمہارے لیے اتنے ہی کافی ہیں۔'' پاپا کا انداز قابل دید تھا۔ مبرم جل کر رہ گیا۔

''یہ بہت زیادہ ہیں' کچھ آپ واپس رکھ لیں۔''

''واپسی پر ویرا کے لیے آئس کریم لیتے آنا۔'' پاپا نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''پاپا جی! یوں کریں آپ خود ہی آئس کریم منگوا لیجئے گا۔ یہ پیسے آپ کو مبارک ہوں۔ چلتا ہوں۔'' وہ زہر کے گھونٹ بھرتا گویا ہوا تھا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر پاپا سرعت سے بولے۔

''ناراض کیوں ہوتے ہو بیٹا! اگر اس دفعہ فیل ہو گئے تو یہ دو تین سو روپے بھی نہیں ملیں گے۔''

''آپ کی کرم نوازی کا شکریہ۔'' وہ آگ بگولا باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ پاپا نے پھر سے اخبار اور عینک کو اٹھا لیا تھا جبکہ ویرا تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے آئی۔

''مبرم! ناشتہ تو کر لو۔''

''خود کھا لینا' موٹی بھینس۔'' اس کے قدم پورچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ویرا کچھ سوچ کر تیز قدموں

سے چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔

''ناشتہ کرلو پیسے دیتی ہوں۔''

''مجھے نہیں ضرورت۔'' وہ اس قدر شدید غصے میں تھا اور ویرا کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہا تھا۔ اگر اس لمحے اس کی جگنوؤں سے چمکتی آنکھوں کو دیکھ لیتا تو لحہ بھر کے لیے ضرور دم بخود رہ جاتا۔ عجیب سے جذبوں کی حدت سے ویرا کے رخسار تپ رہے تھے اور اس کا دل یوں ہی بیٹھا جا رہا تھا۔ ایک ہی احساس بس کچوکے لگا رہا تھا کہ مبرم خالی معدہ لیے صبح سویرے ناراض گھر سے نکلے گا۔ اس کی ناراضی کے احساس نے ویرا کو حد درجہ متوحش کر دیا۔

''پلیز مبرم! رک جاؤ نا۔ اچھا' جتنے مرضی پیسے لے لینا' مگر ناشتہ تو کرلو۔'' وہ منتوں پر اتر آئی۔

''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ بھنا کر پلٹا گملے کو زوردار ٹھوکر لگائی اور بولا۔ ''یہ پیسے تمہیں ہی مبارک ہوں' مگر یہ بات یاد رکھنا کہ میں تم سے کبھی شادی نہیں کروں گا' کبھی نہیں۔''

وہ ایک تنفر بھری نگاہ اس کی طرف اچھال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا' جبکہ ویرا بے چاری جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

✦❋✦

مبرم کا جیب خرچ بالکل بند کر دیا گیا تھا۔ چاچا جی نے اس کی گاڑی بھی بیچ دی تھی۔ اسے دی گئی تمام آسائشات چھین لی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ فلیٹ بھی جو مبرم کو کرائے پر لے کر دیا گیا تھا۔ مبرم اپنے ابو کی ساری سیاست کو اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مبرم کو اس حد تک تنگ کریں گے کہ وہ نہ صرف اپنے تایا کے گھر میں قیام کرنے پر مجبور ہو جائے گا' بلکہ پڑھائی کے معاملے میں بھی کچھ سنجیدہ ہو جائے۔

اور یہ مبرم کی بدقسمتی تھی کہ ویرا کو اس کے کالج میں بطور لیکچرار اپائنٹ کر لیا گیا تھا۔ ان دنوں ویرا کے گویا زمین پر قدم نہیں ٹک رہے تھے۔ اس نے آئی ٹی ایم سے ریزائن کر دیا تھا۔ ویسے بھی اس کالج کی طرف سے ملنے والے پیکیج سے وہ مطمئن نہیں تھی۔

ویرا کو زیادہ خوشی اس وجہ سے تھی کہ وہ اب کالج میں بھی مبرم پر کڑی نظر رکھ سکے گی اور مبرم کی ساری سرگرمیوں پر اس کا دھیان رہے گا۔

پہلا دن تو تعارف میں ہی گزر گیا۔ باقاعدہ کلاسز کا آغاز تیسرے دن سے ہو چکا تھا اور ویرا بہت محنت لگن اور توجہ کے ساتھ لیکچر تیار کرتی تھی۔ اسے پوری پوری امید تھی کہ مبرم کہیں نہ کہیں اس پر ضرور چوٹ کرے گا۔ وہ کلاس کا ذہین سٹوڈنٹ تھا' مگر فائنل ایگزامز میں جان بوجھ کر خالی پرچہ پکڑا کر آتا تھا۔ صرف اور صرف ایک ضد' غصے اور انا کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ اپنے کیریئر کے بہترین سال ضائع کر رہا تھا اور ویرا ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

اس روز کلاس روم میں وہ بہت اہم موضوع پر لیکچر دے رہی تھی' مگر ہمیشہ کی طرح مبرم اسے زچ کرنے کے لیے کھڑکی سے باہر کے منظر دیکھ رہا تھا۔ محض یہ جتلانے کے لیے کہ اسے کسی بھی قسم کے لیکچرز سے کوئی دلچسپی نہیں۔

''ریگولر سٹڈی پلیز اے ویری امپورٹنٹ رول ان ونز کیریئر۔'' کلاس روم میں اس کی آواز کے علاوہ محض سناٹا بول رہا تھا اور وہ چن چن کر تعلیم کی افادیت کے متعلق ٹاپکس زیر بحث لاتی تھی۔ کچھ دیر بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا' مگر مبرم کی طرف سے ہمیشہ کی طرح سے خاموشی کے علاوہ کچھ بھی سننے کو نہیں ملا تھا۔

پورے تین ماہ تک وہ اس کی ایسی روٹین کو برداشت کرتی رہی تھی' مگر اس ڈھیٹ پر قطعاً اثر نہیں ہوا تو اس نے ایک دم گویا فیصلہ کر لیا۔ یعنی مبرم کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی وہ خود بخود مطمئن ہو گئی تھی اور اس کا اطمینان بھی مبرم کو کہاں گوارا تھا۔ اب وہ جان بوجھ کر اسے کلاس روم میں بھی زچ کرنے لگا تھا۔ ایسے ایسے بے تکے سوال کرتا کہ ویرا بھنا اٹھتی۔

''میم! میرے ایک چھوٹے سے کوئسچن کا جواب تو دیں۔'' اس دن بھی وہ لیکچر سے فارغ ہو کر کلاس روم سے نکل رہی تھی جب مبرم اس کے برابر چلتے ہوئے مزے سے بولا۔

''جی فرمائیے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی ویرا کو رکنا پڑا۔

''سیڈسٹک اور ٹروکولینٹ میں کیا فرق ہے؟''

''ہوں۔'' ویرا نے گویا ہنکارا بھرا۔ ''سیڈسٹک لفظ جانتے ہو کس کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے؟''

''جانتا تو ہوں' پھر بھی تم بتا دو۔'' مبرم کا لہجہ خاصا دھیما تھا۔ وہ اس وقت کوریڈور میں کھڑے تھے۔ ویرا نے کچھ سوچا اور بولی۔

''گھر کب جاؤ گے؟''

''ابھی گھر ہی جا رہا ہوں۔''

''تو پھر چلو۔'' وہ پارکنگ کی طرف آئی تھی۔ مبرم بھی بغیر اختلاف کیے اس کے پیچھے آ گیا۔ ویرا فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ مبرم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

''تم نے بتایا نہیں؟'' گاڑی مصروف شاہراہ پر رواں دواں تھی' جب مبرم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دوسروں کو ستانے یا ان پر حکومت کر کے خوش ہونے والا سیڈسٹک ہوتا ہے اور وحشی' بے رحم اور سنگدل' ٹروکولینٹ ہوتا ہے یعنی کہ تم۔'' وہ لمحہ بھر کو رکی۔ ''تم خوش ہوتے ہو' خود سے وابستہ لوگوں کو ستا کر اور یہی تمہاری سب سے بڑی سنگ دلی ہے تم اپنے قول اور فعل کو اولیت' فوقیت دینا چاہتے ہو اور یہ تمہاری سب سے بڑی خود غرضی ہے۔''

''اپنی جائز خواہش کی تکمیل چاہنا خودغرضی ہے؟''

اس کی توقع کے عین مطابق وہ بھڑک اٹھا۔''خودغرض تو آپ کے چچا حضور ہیں۔ تمام عمر اپنے فیصلے زبردستی دوسروں پر ٹھونسنے میں لگے رہے۔ چاہے کوئی ان کے فیصلوں کے بوجھ تلے دب کر رہ جائے۔ گھٹن سے اس کی سانس بند ہو جائے یا دل۔''

''تم کیوں ایسا سوچتے ہو مبرم!'' دفعتاً اس کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔

''کیوں نہ ایسا سوچوں؟'' وہ تپ کر بولنے لگا۔

''شروع سے لے کر آج تک ابو اپنی مرضی کو اولیت دیتے رہے ہیں۔ ایف ایس سی کے بعد میں نے آرمی جوائن کرنا چاہی تو یہ میرے شوق کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ نجانے کن دقتوں کے بعد میں نے ابو کی خواہش پر سر جھکا دیا تھا۔ پھر سوچا کہ فارمیسی پڑھوں گا' مگر اس دفعہ بھی وہ اپنی مرضی ٹھونسنے کے چکر میں میرا خواب توڑ گئے۔ پھر سوچا کہ بزنس فیلڈ سلیکٹ کر لوں گا۔ بی بی اے میں ایڈمیشن لینا چاہا تو پھر اپنی ضد پر اڑ گئے۔'' کہہ تو وہ سچ ہی رہا تھا۔

''تم اپنا نقصان کیوں کر رہے ہو؟'' وہ آرام سے بولی۔

''اس لیے کہ انہوں نے میرا نقصان کیا ہے۔''

اس نے چبا چبا کر جواب دیا۔

''تمہارا نقصان؟'' ویرا الجھی۔

''ہاں۔'' اس کی نظریں شفاف سڑک پر تھیں جبکہ ویرا کی نظریں اس کے چہرے پر۔

''کیا مطلب......؟''

''تم نہیں سمجھ پاؤ گی۔ کبھی بھی نہیں۔ یہ گتھیاں' یہ الجھنیں' یہ قصے یہ کہانیاں۔'' مبرم نے نچلا لب دانتوں تلے دبا رکھا تھا۔ وہ اور بھی الجھ کر رہ گئی۔

''کچھ تو بتاؤ؟'' وہ سخت متجسس ہو گئی۔

''وقت بہت کچھ بتا دے گا۔'' مبرم کا انداز اب بھی مبہم تھا۔''ویسے ایک بات تو بتاؤ۔'' کچھ دیر بعد وہ لہجہ اور انداز بالکل بدل چکا تھا۔

''پوچھو۔''

''تم نے اتنا علم حاصل کیا ہے۔ کیا لوگوں کے ذہن' سوچ اور چہرہ پڑھ سکتی ہو؟''

''شاید ہاں یا شاید نہیں۔'' اس نے کچھ نا سمجھی کے عالم میں جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ تم اس فن سے نا آشنا ہو۔'' وہ ہولے سے مسکرا دیا تھا۔ ویرا اب بھی نہیں سمجھی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔

''میں کبھی بھی کچھ غلط نہیں کہتا۔'' اس کا انداز پھر سے مبہم ہو گیا۔

گاڑی گھر کے گیٹ کے سامنے رک گئی تھی۔ ویرا نے نیچے اتر کر گیٹ کھولا تھا۔ مبرم گاڑی کو اندر لے آیا تو وہ گیٹ بند کر کے اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

''ویرا بیٹی! آج تو سادہ سے دال چاول بنالو۔'' وہ اسے کچن میں مصروف دیکھ کر بولے تھے۔

''اور مبرم کیا کھائے گا؟'' وہ جانتی تھی کہ مبرم کو دال چاول پسند نہیں۔

''میں تمہارا بھیجہ کھا کر گزارا کرلوں گا۔''

مبرم چینل سرچنگ میں مصروف تھا' مگر ساری توجہ ان دونوں کی طرف تھی۔ پاپا نے مسکرا کر مبرم کو دیکھا اور بولے۔

''ویرا کا بھیجہ کھا کر اگر تم ماسٹرز کی ڈگری لے لو تو میری جان! ہمیں ویرا بغیر بھیجے کے بھی قبول ہے' مگر شرط یہ ہے کہ ایسا ذہین دماغ کھانے کے بعد نتیجہ سو فیصد ہونا چاہیے۔''

''ماسٹرز کی ڈگری کو آپ سب نے زندگی موت کا مسئلہ بنالیا ہے۔''

مبرم جھنجھلا کر بولا۔

''کیا کریں بیٹا جی! ہماری مجبوری ہے اور آپ کے فائدے کے لیے تو کہتے ہیں۔'' پاپا نے مزے سے کہا تھا۔ وہ بلا کے خوش مزاج انسان تھے۔ کوئی بندہ ان کی کمپنی میں بور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

''میرا فائدہ؟'' وہ چونکا۔

''تو اور کیا۔'' پاپا ذرا دبی آواز میں بولے۔ ''اب دیکھو نا ویرا کے برابر کی ڈگری تو تمہارے پاس لازمی ہونا چاہیے۔ ورنہ خوامخواہ میرے بیٹے پر رعب ڈالتی رہے گی۔''

''یہ آپ دونوں کیا کھسر پھسر کر رہے ہیں۔'' وہ چاول چن رہی تھی' مگر توجہ ٹی وی لاؤنج کی طرف ہی مبذول تھی۔

''کم از کم آپ کی غیبت نہیں کر رہے۔'' مبرم اٹھ کر کچن میں چلا آیا۔ ''پانی دو۔'' وہ فریج کے پاس ہی کھڑا تھا اور پانی مصروف ویرا سے مانگا جا رہا تھا۔

''خود پی لو نا۔ یہ گلاس بھی پاس ہی رکھا ہے۔'' اسے جلدی جلدی لنچ تیار کرنا تھا' کیونکہ نیند سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔

''میں تم سے پانی مانگ رہا ہوں۔''

مبرم کے لہجے میں عجیب سی دھونس تھی۔

''تمہاری نوکرانی تو نہیں ہوں۔ مفت میں تمہاری خدمتیں کرتی رہوں۔ کپڑے دھو کر اور استری کر کے بھی دوں' من پسند کھانے بھی تیار کروں۔ فری میں دماغ کھپا کھپا کر پڑھاؤں بھی۔'' وہ جل کر بولی۔

''نوکرانی نہیں ہو، مگر زبردستی کی منگیتر تو ہونا۔'' ویرا جانتی تھی کہ اب وہ اسے چڑانے کی کوشش میں رہے گا۔

''منگیتروں پر حکم کی بجا آوری نہ فرض ہے نہ واجب۔'' اس نے ابلتے ہوئے پانی میں چاول ڈال کر چمچہ چلایا۔

''تو رشتہ بدل لیتے ہیں؟''

مبرم نے معنی خیزی سے کہا۔

''کیا مطلب......؟''

وہ سرسری سے انداز میں پوچھنے لگی تھی۔ تمام تر توجہ کھانا پکانے کی طرف تھی۔

''نکاح کر لیتے ہیں۔'' مبرم شاید جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا۔ تبھی تو اسے خود بھی خبر نہیں ہو پائی تھی کہ اس نے کیا کہہ دیا ہے۔

''کیا......؟'' ویرا چونک کر پلٹی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

''اب بات کو پلٹو نہیں۔ میں سن چکی ہوں۔''

نجانے کیوں اس کے دل میں ایک شگوفہ کھل گیا تھا۔

''بڑی بے قرار ہو۔'' اس کے لہجے میں عجیب سی تپش تھی۔ ویرا کے رخسار گرم ہو اٹھے۔

''اب ایسی بھی بات نہیں۔'' ویرا کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ اس سے کوئی بات ہی بن نہیں پائی۔

''بات تو کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔ کچھ جذبے خوشبو کی مانند ہوتے ہیں ویرا اور ان کی خوشبو چھپائے نہیں چھپتی اور ان جذبوں کی آگ بجھائے نہیں بجھتی۔'' وہ بے انتہا سنجیدہ تھا۔ ویرا گویا نگاہ جھکا کر رہ گئی تھی۔ بھلا اپنا آپ عیاں کرنا کچھ آسان تھا۔ وہ بھی اس شخص کے سامنے جس کے نزدیک آپ کے کوئی اہمیت سرے سے نہ ہو۔

''اور کچھ لوگ جذبوں اور ''رشتوں'' کا مذاق بنا لیتے ہیں۔'' وہ صاف مبرم پر چوٹ کر رہی تھی جو کہ آج بھی اپنے اور اس کے درمیان موجود رشتے کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ بڑوں کے طے کیے جانے والے اس رشتے پر معترض تھا، انکاری تھا، جھٹلا دیتا تھا۔

''شاید اس لیے کہ وقت ان لوگوں سے عجیب بے ڈھنگے انداز میں پیش آتا ہے۔ تمہیں ایک بات بتاؤں۔ کبھی ایک چیز کے حصول کے لیے ہم پاگل ہو رہے ہوتے ہیں، مگر وہ چیز ہمیں مل نہیں پاتی اور جب زبردستی ہماری جھولی میں ڈال دی جائے تو وہ چیز اپنی اہمیت خودبخود کھو دیتی ہے۔'' اس کا لہجہ عجیب ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔

پھر ایک دم ہی وہ سنبھل گیا تھا۔ اسے اپنے تمام تاثرات پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔
''پانی نہیں دو گی؟''
''دیتی ہوں۔'' اس نے گلاس میں ٹھنڈا ٹھار پانی بھرا۔ وہ پانی پی کر جانے لگا تھا' جب ویرا نے اسے روکا۔
''کھانا کھا کر سومت جانا۔ ابھی کچھ دیر تمہیں پڑھاؤں گی۔ آج میں نے ٹینس کلب جانا ہے۔'' اس کی سوئی ہوئی ٹینس کی شوقین روح بیدار ہو اٹھی تھی شاید۔ مبرم حیران ہوتا تھا۔ اس قدر ایکٹو لڑکی تھی کہ حد نہیں۔ ایک جگہ ٹک کر تو بیٹھ نہیں سکتی تھی۔
نجانے کیوں وہ شروع سے ہی ویرا سے متاثر رہا تھا۔ حُسن کے ساتھ ساتھ ذہانت بھی بلا کی تھی۔ حاضر جواب تھی۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں ہمیشہ آگے آگے رہتی تھی۔ سپورٹس کی بہترین کھلاڑی تھی۔ ٹینس کی شوقین۔ نجانے کتنے ہی پرائز اس نے کالج کی طرف سے جیتے تھے۔
وہ بلا کی پُر اعتماد تھی۔ یہ اعتماد اسے پاپا کی طرف سے بخشا ہوا تھا۔ وہ اسے اپنی بیٹی نہیں' بیٹا سمجھتے تھے۔ باپ بیٹی میں بلا کی ذہنی ہم آہنگی اور دوستی تھی۔ مبرم حیران ہوتا تھا کہ ایسی دوستی ان باپ بیٹے میں کبھی قائم نہیں ہو سکی تھی۔ بیٹیوں سے بھلا کیسے ہوتی۔ اس کی بہنیں ابو جی کی آواز سنتے ہی کونوں کھدروں میں جا چھپتی تھیں۔ عجیب سے خوف و ہراس کی فضا گھر میں قائم ہو جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا گویا ایک دم گھٹن سی ہر طرف چھا گئی ہے۔ ایسے ماحول میں ان کی شخصیت کس طرح سے دب کر رہ گئی تھی۔ اس بات سے ابو یکسر ناواقف تھے۔ وہ ان والدین میں سے تھے' جو اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کے بچے آنکھ اٹھا کر بات ہی نہیں کر سکتے۔
کچھ سال پہلے مبرم بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ ابو کو دیکھ کر تھر تھر کانپنے والا۔ پہلے پہل وہ زمینوں پر ابو کے خوف کی وجہ سے کام کرتا تھا تا کہ ابو اس سے خوش رہا کریں' مگر آہستہ آہستہ یہ خوف شوق میں بدل گیا تھا اور اسی شوق کی بدولت وہ زمینوں پر نت نئے تجربات کرنے لگا تھا اور یہ ابو کو کہاں گوارا تھا کہ ان کے مشوروں کے بغیر وہ کوئی بھی قدم اٹھائے۔ اگر وہ انہیں کھاد اور بیج کے ''معیار'' کے متعلق بتانا چاہتا تو وہ اس کی بتائی باتوں کو سرے سے نظر انداز کر دیتے تھے۔
خوف و ہراس کے اس ماحول سے اٹھ کر ایک دم پاپا کے گھر' شہر میں آکر قیام کرنا اس کے لیے بہت خوشگوار تجربہ تھا۔
اور محمود الحسن سے ملنا' اسے پہلی مرتبہ دیکھنا سب سے بہترین' انوکھا اور اچھوتا سا تجربہ تھا۔
وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ویرا میں ایسا کیا تھا' جس سے وہ بری طرح سے متاثر ہو گیا۔ اس کے بولنے کا انداز' اس کا اعتماد' اس کی ہنسی کے شگوفے یا پھر پاپا سے اس کی بے تحاشا بے تکلفی۔
ویرا اسے بھلا کیسی لگی تھی؟ اس سوال کا جواب اسے اسی پل گویا الہامی طور پر مل گیا تھا اور پھر۔

''مبرم! کہاں کھو گئے ہو تم؟'' وہ ناراضی سے اس کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے گویا ہوئی۔

''ہوں۔'' مبرم ایک دم چونک گیا۔

''کیا کھڑے کھڑے سو گئے تھے؟''

ویرا دال کو بگھار لگاتے ہوئے بولی۔

''شاید سچ مچ سو گیا تھا۔''

وہ عجیب سے انداز میں کہتا پلٹ گیا تھا۔ ویرا کندھے اچکا کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ تاہم مبرم کا پل پل بدلتا موڈ اسے الجھا کر رکھ دیتا تھا۔

"مبرم! اٹھ جاؤ۔" آج پھر وہ بیماری کا بہانہ بنا کر نیند پوری کر رہا تھا۔ اسے آج ذرا جلدی کالج پہنچنا تھا۔ وہ تیار ہونے میں بھی بچوں کو مات کر دیا کرتا تھا اور ناشتہ بھی بے حد نخرے دکھا دکھا کر کرتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ویرا کو اس کی نخرے بازیاں بہت بھاتی تھیں۔

"مبرم! اٹھ جاؤ ورنہ گرم پانی ڈال دوں گی۔" اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوتا تھا۔ مبرم کی بند آنکھیں فوراً کھل جاتیں۔

"آج میں ذرا دیر سے جاؤں گا۔" اس نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

"کس خوشی میں؟" وہ طنزیہ بولی تھی۔ ساتھ ساتھ پھیلاوے کو بھی سمیٹ رہی تھی۔ مبرم کوئی بھی چیز ٹھکانے پر نہیں رکھتا تھا اور وہ تھی بلا کی نفاست پسند۔

"سر عاشق آج چھٹی پر ہیں سو اسی خوشی میں لیٹ جاؤں گا۔" اس نے آنکھیں موندے موندے جواب دیا۔

"سر عاشق نے تو اپنی شادی والے روز بھی چھٹی نہیں کی تھی۔ جھوٹ وہ بولا کرو جو قابل قبول ہو۔" وہ ڈسٹنگ والا کپڑا اٹھا کر ڈیکوریشن پیس جھاڑنے لگی تھی۔ مبرم نے لمبی سی جمائی لے کر کروٹ بدل لی۔

"شادی تھی، اسی لیے چھٹی نہیں کی۔ آج تو انہوں نے "ڈیٹ" پر جانا ہے۔"

"بکومت۔" اس نے آگے بڑھ کر اس کا کندھا جھنجھوڑا۔

وہ چڑ کر اٹھ گیا۔ تیار ہو کر باہر آیا تو کمرہ اپنی اصلی حالت میں آ چکا تھا اور ناشتہ بھی میز پر تیار رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کی پھرتیوں کا ایک دفعہ پھر سے قائل ہو گیا' حالانکہ اس کی اماں اور تین بہنوں کی موجودگی میں بھی کوئی چیز تیار نہیں ملتی تھی۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اور اس کے ابو دونوں ہی عین وقت پر انہیں بوکھلا کر رکھ دیتے تھے' جس کی وجہ سے ان کے سیدھے کام بھی الٹے ہونے لگتے تھے اور بھائی اور باپ کا پارہ ہائی دیکھ کر ویسے بھی بے چاریوں کو دانتوں پسینہ آ جاتا تھا۔

وہ میز پر سجے لوازمات دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا تھا۔ سوجی کا حلوہ' میدے کی پوریاں اور اچار چنے کا سالن۔ اگر یہی ناشتہ سمانہ یا ثمرہ بڑے پیار سے بنا کر سامنے رکھتیں تو اس نے زمین آسمان ایک کر دینا

تھا۔

''بھلا ان میدے کی پوریوں سے پیٹ بھرتا ہے؟'' اس نے دانت پیس کر کہا۔ وہ جو رغبت سے ناشتے میں مصروف تھی۔ اس اعتراض کو سن کر تحمل سے بولی۔ ''بھوک میں چنے بھی بادام ہوتے ہیں۔''

''مجھے یہ گھی میں تر بتر پوریاں پسند نہیں۔ پراٹھا بنا دو۔'' وہ پلیٹ پرے کھسکا کر بولا۔

''آٹا نہیں ہے۔'' اس کا تحمل قابل دید تھا۔ اسے پانچویں پوری پر ہاتھ صاف کرتے دیکھ کر وہ تحیر میں مبتلا ہو گیا۔

''تم یہ کیسے کھا لیتی ہو؟''

''جیسے کھا رہی ہوں۔ یعنی منہ سے۔'' وہ سمجھ کر بھی انجان بنی۔

وہ گرما گرم چائے کا مگ بھی لے آئی۔ بھاپ اڑاتا چائے کا مگ اور سوندھا سوندھا سنہرا سوجی کا حلوہ۔

''آج میں بھوکا ہی کالج چلا جاؤں گا۔ کاش گوشی اور اماں ہوتیں۔'' لہجے میں خوامخواہ مسکینی بھر لی گئی تھی' مگر ویرا نے کوئی توجہ نہیں دی۔

''خالی معدہ ہو تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔''

''تم ٹھونس ٹھانس کر بھی کون سا توجہ دیتے ہو۔ بہتر ہے بھوکے ہی چلے جایا کرو۔'' وہ ناشتہ کر چکی تھی' اس لیے برتن بھی سمیٹنے لگی۔

''آج لسی بھی نہیں ملے گی؟''

''نہیں البتہ ملک شیک پینا چاہو تو بنا دیتی ہوں۔'' اسے خوامخواہ ہی ترس بھی آ گیا۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' وہ جو بے دلی سے اٹھ رہا تھا' پھر سے بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں پاپا بھی چلے آئے تھے۔ ہاتھ میں اخبار پکڑ رکھا تھا۔ خود تو وہ مطالعہ کر ہی چکے تھے' اب ویرا کو دینے کے لیے آئے تھے۔

''ایک نظر جاتے جاتے دیکھ لو۔'' پاپا بولے۔

پاپا نے باؤل میں سے تھوڑے سے چنے نکال لیے تھے۔ ''آج تو ناشتے پر کافی اہتمام کیا گیا ہے۔'' ان کی نظروں میں خاص ستائش تھی۔

''افسوس کہ آپ کے سڑی شکل والے بھتیجے کو یہ اہتمام پسند نہیں آیا۔'' وہ پھرتی اور نفاست سے آم کاٹ کر جگ میں دودھ ڈالنے لگی تھی۔ ساتھ ہی سوئچ لگا کر بٹن آن کر دیا تھا۔

''تم میرے بھتیجے کی پسند کا ناشتہ بنایا کرو۔''

''آپ کے بھتیجے کی پسند نیاز پور کے اردگرد گھومتی ہے اور میں نیاز پور والوں جیسی نہ ہو سکتی ہوں' نہ ان جیسا کچھ بنا سکتی ہوں۔'' اس نے مبرم کے گوشی کو یاد کرنے کا جواب اب دیا۔

''صرف شیک پی کر مبرم کالج جائے گا؟'' اس نے جگ اور گلاس اٹھا کر مبرک کے سامنے رکھا تو پاپا خفگی

سے بولے۔

''جی' یہ پورا جگ ابھی خالی ہو جائے گا۔'' آپ بے فکر ہو جایئے۔ پورا جگ شیک کا پینے کے بعد مزید کچھ بھی کھانے کی گنجائش نہیں رہتی۔'' اس نے پاپا کو تسلی دی۔

''تم میرا کھایا پیا ہی گنتی رہنا۔'' مبرم نے شکایتاً کہا۔ ان دونوں کو چونچیں لڑاتے دیکھ کر پاپا نے مبرم کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''عزیزم بھتیجے! اس دفعہ پاس ہونے کا ارادہ ہے یا نہیں؟'' پاپا نے کیا حساس اور نازک سا موضوع چھیڑ دیا۔ مبرم تیسرا گلاس چڑھاتے ہوئے ذرا دیر کو رکا۔

''دیکھیں کیا ہوتا ہے۔'' اس نے مکاری سے جواب دیا۔

''نہ بچہ! یہ سیاست دانوں والا جواب مجھے پسند نہیں آیا۔'' پاپا بھی پکے وکیل تھے۔ بال کی کھال اتارنے والے۔

''پاپا جی! یہ تو وقت پر ڈیپینڈ کرتا ہے کہ وقت مجھ سے کیا فیصلہ کروائے گا۔'' مبرم نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

ویرا کو اس کے سنجیدہ انداز پر بے انتہا ہنسی آ گئی تھی۔

''اس دفعہ تو ویرا کی لاج رکھ ہی لینا یار! لوگ کیا کہیں گے۔ ویرا نے ٹھیک نیت سے پڑھایا نہیں۔'' پاپا نے گویا درخواست کی تھی۔

''میں خود ٹھیک نیت سے پیپر نہیں دیتا۔ اس میں بھلا ویرا کا کیا قصور ہے۔''

''اس دفعہ ہم سب کے حال پر رحم کر لینا۔'' ویرا اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لائی تھی۔ مبرم سیل فون اور گاڑی کی چابی لیے ویرا کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔

''اتنی منت سے کہو گی تو پھر کچھ غور تو کرنا پڑے گا۔'' وہ مسکراتا ہوا اس کے برابر چل رہا تھا۔ پاپا نے انہیں مسکراتی نظروں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور دل ہی دل میں دعا دی۔

''ہمیشہ یوں ہی ساتھ رہو۔'' ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

✦❋✦

مبرم کے فائنل ایگزامز کے بعد ویرا نے بھی اچانک گاؤں جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ مبرم نے سنا تو بدک کر رہ گیا۔

''اب وہاں بھی میرے سر پر سوار ہو گی؟''

''تمہیں سیدھا رکھنے کے لیے میرا تمہارے ساتھ جانا ضروری ہے ورنہ پھر سے اڑیل گھوڑے بن کر آ جاؤ گے۔ مشکل سے سدھارا ہے تمہیں۔'' وہ اپنے ضروری کام نمٹا رہی تھی۔ پھر اسے شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ چاچی' سمن اور سمی وغیرہ کے لیے کچھ شاپنگ کرے گی۔ بہت بچپن میں وہ صرف ایک دفعہ امی اور

پاپا کے ساتھ گاؤں گئی تھی اور اس کے بعد آج جا رہی تھی۔ مبرم خوامخواہ کڑوا کریلا بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے کپڑے استری کر کر کے ڈھیر لگائے جا رہی تھی اور مبرم اندازہ لگا رہا تھا کہ گاؤں میں اس کا قیام کتنے دن تک کا ہوگا۔

''تم نے وہاں اپنا ولیمہ کروانا ہے جو اتنا میک اپ اٹھا کر لے جا رہی ہو؟'' مبرم کوئی دل جلانے والی بات نہ کرے' یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی ''بکواس'' سن کر آنکھیں سکیڑے اسے دیکھنے لگی۔

''تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ سارا سامان بطور گفٹ لے کر جاؤں گی تمہاری بہنوں کے لیے۔'' ویرا نے وضاحت کی۔

''اور شاپنگ کے لیے کب تک نکلنا ہے؟'' ظاہر ہے اس کام کے لیے بھی مبرم کو ساتھ ہی جانا تھا۔ حالانکہ سارے شہر کی سڑکیں روندنے اکیلی نکل جاتی تھی اور شاپنگ کے لیے اسے ساتھ جانے کا آرڈر دیا گیا تھا اور ساتھ پاپا کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔

ویرا کپڑوں کو سمیٹ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ ارادہ تھا کہ چائے بنا کر پاپا کو دے کر ہی جائے گی' مگر اسے کچن میں جاتا دیکھ کر مبرم نے اسکوائش کے لیے کہہ دیا۔

''یہ کون سا ''ٹھنڈا'' پینے کا ٹائم ہے۔ لوگ اس وقت چائے پیتے ہیں۔'' وہ چولہے پر چائے کا پانی چڑھا رہی تھی۔

''اب تقریر کرنے نہ بیٹھ جانا' میں خود بنا لیتا ہوں۔'' مبرم بھی کچن میں آ گیا۔

''مہربانی جناب کی۔'' وہ طنزیہ بولی۔ ''خبردار' جو کسی بھی چیز کو ہاتھ لگایا تو۔ ذرا سے کام میں اتنا پھیلاوا کر دیتے ہو۔''

''تو پھر خود بنا دو۔'' وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

اسکوائش کا گلاس سے تھما کر وہ پاپا کو چائے دینے چلی گئی تھی۔ پاپا سے باتوں میں کچھ وقت لگ گیا تھا۔ جب وہ واپس آئی اور اپنا مگ دیکھا تو حیران رہ گئی۔

''میری چائے کہاں ہے؟''

''جہاں اسے ہونا چاہیے۔'' مبرم جاگرز کے تسمے کستے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ وہ قد میں اس سے کافی اونچا تھا' اسی لیے ویرا کو کچھ گردن اٹھا کر بات کرنا پڑتی تھی۔

''تم نے چائے پی لی؟'' ویرا حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ مبرم بھلا کہاں چائے پیتا تھا۔

''ہاں۔''

''پر تمہیں تو چائے پسند نہیں۔'' ویرا الجھی۔

''پر تمہیں تو پسند ہے نا۔'' مبرم ایک دم پلٹ کر اس کی طرف آیا تھا۔ ''چائے میں تمہارا ساتھ کسی نہ کسی کو تو ضرور دینا ہوگا اور وہ کوئی اور میں کیوں نہیں ہو سکتا۔'' وہ اس کی شفاف آنکھوں میں جھانک کر کچھ دیر ٹھہرا رہا

تھا اور پھر اسے آنے کا کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔

''ارے' یہ مبرم کیا بول گیا ہے۔'' اسے خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔

✦✻✦

شاپنگ مال میں گویا رنگ و بو کا سیلاب اترا ہوا تھا اور مبرم کا چہرہ اسے دھڑا دھڑ شاپنگ کرتے دیکھ کر اتر چکا تھا۔ وہ پندرہ منٹ کا کہہ کر آئی تھی' مگر پچھلے تین گھنٹوں سے بذریعہ لفٹ اوپر نیچے آجا رہی تھی۔

مبرم تیوریاں چڑھائے ساتھ ساتھ تھا۔

''ویرا! اب اور کتنا کیا خریدنا ہے؟'' وہ رکھائی سے پوچھنے لگا۔

''جب خواتین شاپنگ کر رہی ہوں تو مردوں کو صبر سے کام لینا چاہئے۔ ویسے تم بھی کچھ خرید لو یا چلتے پھرتے آئس کریم ہی کھا لو۔ کیا روٹھی روٹھی بدمزاج دلہن کی طرح منہ بسورے میرے ساتھ چل رہے ہو۔''

ویرا کا موڈ بہت ہی خوشگوار تھا۔ وہ مہنگی مہنگی جیولری خرید رہی تھی۔ یہ تمام تر شاپنگ گاؤں والوں کے لیے تھی۔ خود تو وہ بہت ہی سادہ حلیے میں رہتی تھی۔

اس اثنا میں اویس چلا آیا تھا۔ وہ بھی شاپنگ کرنے آیا تھا یا پھر آوارہ گردی کرنے۔

''السلام علیکم میم! کیسی ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام۔ چلو اچھا ہوا تم بھی مل گئے ہو۔ یہ مبرم بڑا بے قرار ہو رہا تھا تمہارے گھر جانے کے لیے۔'' ویرا نے سلام کے جواب کے بعد کہا۔

''میں اس کی بے قراری دور کرنے کے لیے بس آپ کے گھر آنے ہی والا تھا۔'' اویس اسے آنکھ مار کر بولا۔ جواباً مبرم نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

''کبھی کبھار آ جایا کرو۔ مبرم بہت اداس رہتا ہے تمہارے لیے۔'' اس نے طنز کا تیر پھینکا اور مڑ کر چوڑیوں کی دکان کی طرف چلی گئی۔

''بڑے خوش نصیب ہو' میم استانی بھی ہیں اور منگیتر بھی۔'' اویس کو خوامخواہ رشک آ رہا تھا۔

''تم کو کیا خبر کہ کون خوش نصیب ہے؟'' مبرم کا لہجہ ایک دم عجیب سے دکھ کی بدولت بوجھل ہو گیا۔

''ہائے' یہ فلسفہ۔'' اویس کو مسخریاں سوجھ رہی تھیں۔ وہ مبرم کا کزن نما دوست تھا۔ بچپن سے ہی وہ مبرم کے بہت قریب تھا اور اس کے گھریلو حالات سے بھی بخوبی واقف تھا اور مبرم کے دل میں پوشیدہ ہر راز سے بھی' تب ہی تو اسے مبرم کی قسمت پر رشک آتا تھا۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں' جو جس چیز کی طلب کرتے ہیں اور پھر اسے پا بھی لیتے ہیں۔

''پلیز یار!'' مبرم نے گویا التجاء کی۔

''تم ابھی تک گاؤں بھی نہیں گئے۔'' اویس سمجھ کر سر ہلا گیا تھا۔

''کل ان محترمہ کو ٹیلر سے کپڑے ملیں گے' پھر پرسوں تک گاؤں جانا ہے۔'' اس کی نظریں دکان دار سے بحث میں الجھی ویرا کے اردگرد بھٹک رہی تھیں۔

''میم بھی گاؤں جا رہی ہیں؟'' اویس کو حیرانی ہوئی۔

''ہاں۔'' وہ بے دلی سے بولا۔ ''کتنا مشکل ہے' ہاتھ آئی نعمتوں کو دھتکار دینا۔'' وہ خود اذیتی کا شکار تھا۔

''تم۔'' اویس کچھ پل بول ہی نہ پایا۔ ''کیا تم اپنے اور ان کے ساتھ اچھا کر رہے ہو' پھوپھا جی کے ساتھ ضد میں صرف تمہارا اپنا نقصان ہے۔''

''تم اپنے پھوپھا جی کی ذہنیت سے واقف جو نہیں ہو۔'' وہ زہر خند ہو کر رہ گیا۔

''اپنے والدین کے بارے میں ایسا سوچنا بھی درست نہیں یار! چلو اس وقت انہوں نے تمہاری بات نہیں مانی' مگر اب تو خود بخود سارے راستے صاف ہو رہے ہیں نا۔ پھر تم کیوں اس قدر اپ سیٹ ہو۔'' اویس کا انداز ناصحانہ تھا۔

''اس لیے کہ میں جانتا ہوں اس سارے معاملے کی کڑی کہاں جا کر ملتی ہے۔'' اس نے ضبط کے عالم میں اپنے لب کچلے تھے۔

''عجیب پہیلیاں بجھواتے رہتے ہو۔ میرے بھیجے میں تمہاری باتیں نہیں سما سکتیں۔'' اویس سمجھ کر بھی انجان بن جاتا تھا۔ اس کے زخموں کو ادھیڑنا اویس کو کبھی بھی گوارا نہیں تھا۔

''تم نے ایسی باتوں کو سمجھ کر کرنا بھی کیا ہے۔ کھیلنے کے دن ہیں تمہارے' خوب کھیلو' کودو۔'' وہ بے دلی سے مسکرایا۔

''کھیل کود تو رہا ہوں۔ تمہاری وجہ سے میرا معاملہ بھی اٹکا ہوا ہے۔ اب تک ہماری نیا بھی پار لگ جانا تھی۔'' اویس کو اپنے دکھڑے یاد آ گئے تھے۔ ''ویسے پھوپھا جی جلد از جلد اس معاملے کو نمٹانا چاہتے ہیں۔ انہیں خدشات لاحق ہیں کہ تم کہیں چھپ چھپا کر گوشی سے زبردستی کورٹ میرج ہی نہ کر لو۔'' تب ہی ویرا آ گئی تھی۔

''احمقوں کی طرح کھڑے ہو۔ بندہ کم از کم ونڈو شاپنگ ہی کر لیتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''جی' شاپنگ تو کی ہے۔ دیکھنے دکھانے والی نہیں اصلی شاپنگ۔'' اویس نے جھٹ سے ایک شاپنگ بیگ اس کے سامنے کر دیا تھا اور ویرا نے بھی اسی پھرتی سے بیگ کھول کر دیکھ لیا۔ ''میں دیکھ لوں تم نے کیا خریدا ہے؟''

وہ شاپنگ بیگ کھول کر اس سے اجازت لے رہی تھی۔

''ضرور میم! کیوں نہیں۔''

''اپنی بہن کے لیے شاپنگ کی ہے؟'' وہ سٹائلش سے دو سوٹ دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''اللہ نہ کرے میں نے اسے بہن نہیں بنایا۔'' اویس ایک دم ہل کر رہ گیا۔

"تو پھر؟"

"یہ ہماری' انہوں کے لیے ہیں۔ مبرم کے ہاتھ بھیجوں گا۔ ویسے اطلاعاً عرض کرتا ہوں میری کوئی بہن اور بھائی نہیں۔ اکلوتا ہوں۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔" ویرا کو خوشگواریت سی محسوس ہوئی۔ "ویسے کبھی اس ڈفر کو بھی سمجھا دیا کرو کہ "تحفوں" کے لین دین سے محبت مضبوط بھی ہوتی ہے اور بڑھتی بھی ہے۔" وہ کچھ شاپنگ بیگ مبرم کے ہاتھ میں تھماتی معنی خیزی سے بولتی باہر کی طرف بڑھ گئی تھی' جبکہ یہ دونوں کچھ تحیر زدہ سے رہ گئے۔

"ہونے والی بھابی کیا بول گئی ہے یار!" اویس' مبرم کے کان میں گھس گیا تھا۔

"لگتا ہے' محترمہ کو کوئی "تحفہ" دینا ہی پڑے گا۔" مبرم اپنے سر پر ہاتھ مار کر رہ گیا۔

"تو نیک کام میں دیر کیسی۔ ابھی کچھ خرید لیتے ہیں۔" اویس نے بے صبری دکھائی تھی' جبکہ مبرم اسے گھور کر رہ گیا تھا۔

✦❋✦

وہ کلب سے آئی تو مبرم اور اویس کو لان میں خوش گپیوں میں مصروف دیکھ کر ان دونوں کی طرف ہی آ گئی تھی۔ وہ دونوں ہی اسے دیکھ کر احتراماً سیدھے ہو گئے۔ ان کے مصنوعی مؤدب انداز کو دیکھ کر ویرا کو ہنسی تو بہت آئی تھی' مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دی۔

"میرے کپڑے ٹیلر سے لے آئے ہو؟" وہ لان میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ کل فجر کے بعد انہیں گھر سے نکلنا تھا۔ سو کپڑوں کو آج ہی ٹیلر سے لے کر آنا تھا اور وہ یہ کام مبرم کے ذمہ لگا کر گئی تھی۔

"آتے ساتھ ہی استانی بن جاؤ بس!" مبرم کے منہ میں ڈھیروں کڑواہٹ گھل گئی۔

"یعنی نہیں لے کر آئے۔" وہ گویا چیخ اٹھی۔

"میری مجال ہے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔ "آپ کے حجرے میں رکھ کر آیا ہوں۔ جا کر اک نظر دیکھ لیجئے اور جی بھر کے نقص نکال لیجئے۔" وہ اس کی نکتہ چینی والی عادت سے سخت خار کھاتا تھا۔

"تھینک یو سو مچ۔ میں جانتی تھی تم میرا کام بھول ہی نہیں سکتے۔"

"مجھے طعنے اور لیکچر سننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اس لیے لے آیا ہوں۔" مبرم نے بھی وار خالی نہیں جانے دیا تھا۔

"بس باتیں جتنی مرضی کروا لو۔ کبھی پرچے میں بھی کچھ لکھ کر آ جایا کرو۔ بلینک پیپر پکڑا آتے ہو۔"

"اس دفعہ بہت کچھ لکھ کر آیا ہوں۔ تمہاری محنت کو ضائع نہیں کیا۔ بس ترس آ گیا تھا تم جیسی ٹیوٹر پر۔ ہماری قوم کو تم جیسے استاد مل جائیں تو کیا ہی بات ہو۔"

"یار اتنی دیر سے بیٹھا ہوں' نہ چائے پوچھی ہے' نہ پانی۔" اویس نے مداخلت کی۔

''تم نے اویس کو چائے بھی نہیں لائی؟ شرم کرو' وہ مہمان ہے' کم از کم چائے تو پلا سکتے تھے نا۔'' ویرا کو سچ مچ بہت افسوس ہوا۔ وہ تو بلا کی مہمان نواز تھی۔ گھر آئے مہمان کو کبھی سوکھے منہ نہیں جانے دیتی تھی۔

''کب سے باتوں پر ٹرخا رہا ہے۔'' اویس نے مزید منہ بسور کر شکایت لگائی۔

''زیادہ چاپلوسی کرنے کی ضرورت نہیں؟'' مبرم نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی۔ ''تمہارے جیسے مہمانوں کو میں کیوں کچھ بنا کر دوں جبکہ میں خود بھی مہمان ہوں۔''

''مہمان صرف تین دن کا ہوتا ہے' ذرا حساب لگاؤ' کب سے یہاں پر رہ رہے ہو۔'' وہ بھی تو اویس تھا' حساب کتاب میں مبرم کی طرح ماہر۔ ''اور کب سے یہاں کا کھا رہے ہو؟''

''تم میری روٹیاں گننے آئے ہو؟'' مبرم اس پر چڑھ دوڑا۔

''میری یہ مجال۔'' اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی تھی۔ ''میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس گھر کا کھایا پیا حلال کر جانا۔'' اویس کا اشارہ اس کے امتحانات کی طرف تھا۔

''توبہ' کس قدر بولتے ہو تم دونوں۔'' ویرا کو مداخلت کرنا پڑی۔ ''چائے لاؤں کیا تم دونوں کے لیے؟'' وہ اٹھتے ہوئے پوچھنے لگی تھی۔

''بس رہنے دیں ویرا جی! میرا تو روز' روز کا آنا جانا ہے' چائے پینا بلکہ روز' روز پینا کوئی اچھی بات نہیں۔'' اویس نے خوامخواہ شرمندگی خود پر ظاہر کر لی تھی' جبکہ مبرم اس کی چالاکی پر تاؤ کھا کر رہ گیا۔

''ارے یہ کیا بات ہوئی۔'' ویرا اس کی شرمندگی پر خود شرمندگی محسوس کرنے لگی تھی۔ ''میں ابھی چائے لاتی ہوں' بلکہ تم کھانا بھی کھا کر جانا۔ اسی بہانے مبرم کا دل بھی لگا رہے گا۔''

''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔''

ہائے' مبرم کے دل کا اس قدر خیال۔'' اویس کو گویا ٹوٹ کر پیار آ گیا۔

''تم کیوں بیچ میں ٹانگ اڑا رہے ہو' جبکہ مادام تم سے مخاطب نہیں' مجھ سے ہم کلام ہیں۔'' اویس نے تفاخر سے سینہ پھیلایا۔

''مادام کی چالاکیوں سے میں اچھی طرح سے آگاہ ہوں۔ تمہاری آڑ میں سنایا تو مجھے ہی جا رہا ہے۔'' مبرم نے جتا جتا کر کہا۔

''بڑی خوش فہمیاں لاحق ہیں جناب کو۔'' اویس کا انداز صاف مذاق اڑانے والا تھا۔ ویرا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''میں بھی اسے یہ ہی اکثر بتاتی ہوں کہ مت خوش فہم بنو اس قدر' کبھی کبھی دوسروں کی خوشی کی خاطر زہر کا جام بھی پینا بھی پڑتا ہے۔'' اس نے چمکتی آنکھوں سے مبرم کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ الفاظ آنکھوں میں جلتی قندیلوں کا ساتھ نہیں دے رہے تھے اور مبرم نیازی اچھی طرح سے جانتا تھا یہ زہر کا پیالہ نہیں' امرت کا جام

ہے اور شاید محبت کا بھی۔

''تو نہ پیو' زہر کے اس جام کو ملکہ کسی اور کے لیے رکھ چھوڑو۔'' مبرم نے سلگ کر کہا۔

''کوئی اور کیوں اس زہر سے زہریلا ہو جائے' میں بھلا ایسی خودغرضی کا مظاہرہ کر سکتی ہوں۔''

''یہ زہر تو آپ کو ضرور ہی پینا ہے ویرا صاحبہ جی! اگر یہ کام آپ نے نہ کیا تو مجھے خدشہ ہے کہ گوشی معصوم' مظلوم اور مغموم کو مجبوراً پھانسی کے پھندے کے قریب کر دیا جائے گا۔ میرے منہ میں ماسی رحمت کے تندور کے دہکتے انگارے پڑیں' سات سمندروں کی ریت پڑے' کوئی کالا بھڑ مجھے کاٹ جائے' میرے منہ میں پھر سے خاک' اللہ نہ کرے اگر اس کی شادی گوشی سے ہوگئی تو یہ ظالم' وحشی اور جلاد صفت انسان تو گرج گرج کر ہی اسے مار ڈالے گا۔ اس معصوم کا تو چڑیا جتنا دل ہے۔ یہ گھر میں داخل ہو جائے تو وہ کسی ایسے کونے میں خوف کی وجہ سے جا چھپتی ہے جہاں اس دیو کی آواز اس تک نہ پہنچ پائے۔

میں تو دل کی گہرائیوں سے دعا کرتا ہوں کہ یہ جن آپ کے قبضے میں ہی رہے۔ آپ کے علاوہ اس جلاد کو کوئی قابو نہیں کر سکتا۔ معصوم سی بے چاری گوشی تو بے موت ہی ماری جائے گی۔ بس آپ یہ زہر کا پیالہ پی ہی جائیں۔'' اویس نے جس مسخرے انداز میں کہا تھا ویرا ہنس ہنس کر بے حال ہوگئی تھی۔

✦❃✦

گاؤں جانا اس کے لیے بڑا دلچسپ ثابت ہوا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کی وجہ سے کافی تکلیف دہ سفر ہونے کے باوجود ذرا بھی تھکاوٹ کا شکار نہیں تھی۔

نیاز پور کی حدود شروع ہو چکی تھیں۔ ان کا گھر گاؤں کی آبادی سے کچھ ہٹ کر بنایا گیا تھا۔ اردگرد سبزہ ہی سبزہ تھا۔ کینوؤں کے باغات تھے۔ شاخوں پر چھوٹے چھوٹے بیر کے سائز جتنے کینو لگے ہوئے تھے۔ پھل ابھی بہت چھوٹا اور کچا تھا۔ سرما کی شدید سردی میں اس پھل نے پک کر تیار ہونا تھا۔ گھر میں ان کی آمد کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ تب ہی تو نہ جانے کس کس کونے سے ثمانہ' ثمرہ اور ثمن بھاگی بھاگی چلی آئیں۔

''بھایا آئے ہیں اور وہ بھی......'' ثمرہ بھاگ کر گوشی کو بھی مطلع کر آئی تھی۔ ثمانہ اور ثمن کا والہانہ استقبال ویرا کو بے حد مسرور کر گیا۔

مبرم تو نہ جانے کون کون سی جھوٹی کہانیاں سناتا رہتا تھا کہ ثمانہ اور ثمرہ اسے ناپسند کرتی تھیں۔ ویرا کو دیکھنا بھی انہیں گوارا نہیں تھا۔ ایسی تو کوئی بات ان کے رویے سے ظاہر نہیں ہو رہی تھی' بلکہ وہ تو بے انتہا خوش تھیں۔ خصوصاً ثمن تو بہت ہی زیادہ خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ چاچی تک نے کافی خوش دلی سے اسے گلے لگایا تھا۔ اسے کم از کم چاچی سے اتنی لگاوٹ کی امید نہیں تھی۔

''ویرا باجی! آپ بتا کر آتیں نا' ہم آپ کے لیے اچھا سا کھانا بنا لیتے۔ بھایا تو اپنے آنے کا کبھی نہیں بتاتے پھر جب نہ من پسند کھانا ملتا ہے اور نہ ہی کچھ اور تو پھر ہنگامہ کرتے ہیں۔'' ثمانہ اس کا ہاتھ تھام کر بڑے

پیار اور اپنائیت سے کہہ رہی تھی۔

''جو کھانا تم لوگ کھاؤ گے' میں بھی وہ ہی کھاؤں گی۔ میرے لیے تکلف مت کرنا۔'' وہ سمانہ اور ثمرہ کو کچن میں جانے نہیں دے رہی تھی۔

''تکلف کیسا؟ پہلی دفعہ تم آئی ہو۔ روٹی تو کم از کم اچھی ہونا چاہیے۔'' چاچی شاید مینیو ترتیب دینے لگی تھیں' جب ویرا نے کافی سختی سے انہیں منع کر دیا۔

''میں ابھی کچھ دن تک ادھر ہوں۔ اچھی سی روٹی کا اہتمام بھی کسی دن کر لیجئے گا۔'' اس نے سب کی مشکل آسان کر دی تھی۔

سمن آڑو کا جوس بنا کر لے آئی تھی۔ دو جگ لبالب بھرے تھے۔ ایک جگ اور گلاس وغیرہ اس نے بیٹھک میں مبرم کے لیے بھجوا دیا تھا۔ ثمرہ پھر سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ سمانہ اور سمن اس کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش تھی۔ وہ اس کی بول چال' پہننے اور اوڑھنے کے سلیقے سے خوب متاثر ہو رہی تھیں۔

''لڑکیو! ویرا کو اے سی والے کمرے میں لے چلو' گرمی بہت ہے' وہیں بیٹھ کر باتیں کر لینا بلکہ پہلے اسے آرام کرنے دو' سفر سے تھکی ہوئی آئی ہے۔''

چاچی نے گھٹنوں پر زور دے کر اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ سمانہ اور سمن اسے اے سی والے کمرے میں لے آئی تھیں۔ کمرہ کافی کھلا' ہوادار اور آرام دہ بھی تھا۔ وہ سب سے پہلے نہا کر تازہ دم ہو گئی تھی اور اس کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے بیٹھی تھی اور پھر سو بھی گئی۔

اس کی آنکھ اذان کی آواز سن کر کھلی تھی۔ مؤذن ظہر کی اذان دے رہا تھا۔ ویرا نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا' وضو کیا اور پھر نماز بھی پڑھ لی تھی۔ کچھ دیر آرام کر لیا تھا' سو اسی لیے وہ فرش بھی ہو چکی تھی۔ ابھی وہ باہر نکلنے کے لیے سوچ رہی تھی جب دروازہ کھول کر کوئی اندر آیا۔

''السلام علیکم۔''

وہ جھکی جھکی آنکھوں والی بہت ہی پیاری سی لڑکی تھی۔ ویرا گویا فوراً ہی سمجھ گئی۔

''وعلیکم السلام' تم گوشی ہو؟''

وہ بہت خوش دلی سے گوشی سے ملی۔

''جی ...... آپ سنائیں ٹھیک ہیں؟ سفر اچھا رہا؟''

گوشی نے بہت شائستگی سے پوچھا۔

''بہت اچھا ...... میں نے کافی انجوائے کیا' تم بیٹھو نا۔'' وہ بالوں میں برش کر رہی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کے بینڈ میں بالوں کو سمیٹا۔

''نہیں بیٹھوں گی نہیں' آپ کو دیکھنے کے لیے آئی تھی کہ آپ اٹھی ہیں یا نہیں' کھانا لگا دیا ہے' خالہ آپ کو بلا رہی ہیں۔''

''او کے' تم چلو میں آتی ہوں۔'' وہ واش روم میں ہاتھ دھو کر خود بھی باہر آ گئی تھی۔ دستر خوان ہال کمرے میں بچھایا گیا تھا اور بہت ہی ترتیب سے اور نفاست کے ساتھ کھانا چُن رکھا تھا۔ ویرا نے اک نظر دستر خوان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''کر لیا نا تکلف۔''

دستر خوان پر مختلف لوازمات رکھے تھے۔ بھنی ہوئی مرغی' پلاؤ' رائتہ اور سادہ روٹی کے ساتھ فروٹ کسٹرڈ بھی تھا۔

''تکلف کیسا' گھر کی بیٹی ہو' پہلی دفعہ آئی ہو' اگر مبرم اطلاع کر دیتا تو کچھ اور بھی اہتمام کر لیتے۔'' چاچی کا اخلاق اسے خاصا متاثر کر رہا تھا۔

''مبرم کہاں ہے؟''

اس نے اپنے دائیں بائیں بیٹھی لڑکیوں سے پوچھا۔

''بھایا بیٹھک میں ہیں' ان کے گاؤں میں رہنے والے یار دوست ملنے کے لیے آئے ہیں۔'' ثمرہ نے وضاحتی انداز میں بتایا۔

''مبرم کھانا نہیں کھائے گا؟''

سمن اس کے لیے پلیٹ میں سالن نکال رہی تھی' مگر ویرا نے توجہ نہیں دی۔ اس کا دھیان مبرم میں اٹک گیا تھا۔

''وہ بیٹھک میں کھانا کھاتے ہیں۔ خالو جی کے ساتھ یا پھر اکیلے۔'' اب کے گوشی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔'' ویرا کو مبرم کا یوں گھر والوں سے الگ تھلگ کھانا کھانا پسند نہیں آیا۔ ''کہاں ہے وہ' بلاؤ اسے۔''

''پتر! یہ تو ان کا روز کا معمول ہے' ہمارے مرد' بہنوں' ماؤں یا بیویوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے۔'' چاچی نے گویا اسے سمجھانا چاہا۔

''بھایا بیٹھک میں ہی کھانا مانگ رہے ہیں' وہ اندر نہیں آئیں گے۔''

سمن نے بتایا۔

''جاؤ گوشی جلدی سے کھانا نکال کر بیٹھک میں بھجوا دو۔'' ثمرہ اور گوشی سر پر پیر رکھ کے کچن میں بھاگنا چاہ رہی تھیں جب ویرا نے انہیں روکا۔

"کوئی ضرورت نہیں' اگر وہ کھانا کھانے کی خواہش رکھتا ہے تو یہاں ہمارے ساتھ کھائے' ورنہ بھوکا رہے۔"

"ویرا باجی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" گوشی اور ثمرہ خوف کے مارے ہکلا کر رہ گئیں۔ "وہ ہماری جان نکال دیں گے۔"

"جو کہہ دیا ہے' بس اسی کو کافی جانو' آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔"

اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔"

"یہ ایسی ہی باتیں کرتی ہے۔"

چاچی جو اس کے سارے رنگ ڈھنگ دیکھ آئی تھی۔ سو اطمینان سے کہنے لگیں۔ ان کے بیٹے کی بولتی بند بس یہی کروا سکتی تھی۔ وہ جتنے دن وہاں رہ کر آئی تھیں بس حیران ہی ہوتی رہیں۔ سو اس وقت انہوں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اب ان بے چاریوں کے حیران ہونے کی باری تھی...... اسی وقت مبرم کا پیغام آ گیا۔

"آپا جی! بیٹھک میں روٹی بھجوا دیں۔" منیر چاچا اپنا کھانا لینے کے لیے آئے تھے۔ پیغام دے کر چلے گئے' کچھ دیر بعد مبرم خود آ گیا تھا۔

"تم لوگوں نے کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی ہے' میں کب سے بکواس کیے جا رہا ہوں' خود شاہی خوان سجائے بیٹھے ہیں۔" وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ ویرا نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا اور بولی۔

"ذرا تمیز کے جامے میں رہ کر بات کرو' اپنی بہنوں سے مخاطب ہو' کنیزیں نہیں ہیں تمہاری اور یہ شاہی خوان تمہارے لیے سجا رکھا ہے۔ ہم لوگ تمہارا انتظار کر رہے تھے' آؤ یہاں۔" وہ چاچی کی طرف اشارہ کر رہی تھی تاکہ وہ ماں کے ساتھ اطمینان سے بیٹھ جائے۔

"میں یہاں......"

وہ ایک دم کچھ گھبرایا۔

"ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں کیا حرج ہے؟ وہاں بھی تو میرے اور پاپا کے ساتھ کھاتے تھے۔" اس کی جرح مبرم کو غصہ دلا رہی تھی۔

"وہاں کی بات اور تھی۔"

مبرم نے گویا دانت پیسے۔

"کیوں بھئی؟" وہ حیران ہوئی۔ "یہاں اور وہاں میں کیا فرق ہے؟ ادھر تمہاری تین بہنیں اور ماموں موجود ہیں' ان سے بھلا کیا جھجک؟ بس میں اور گوشی ہی کچھ دور کے رشتہ دار ہیں نا' تو ہم دونوں اٹھ جاتی ہیں۔"

ویرا نے رسان سے کہا۔

''ویرا......!''

مبرم کا بس نہیں چل رہا تھا' اس کی قینچی جیسی زبان کو کسی قینچی سے ہی کتر ڈالتا۔ ادھر گوشی اور ثمرہ وغیرہ کو مبرم کی پتلی حالت پر ہنسی آ رہی تھی۔

''بیٹھ جاؤ بیٹا' کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' چاچی نے بحث کے خاتمے کی خاطر مبرم کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھا لیا۔''مہمان بچی ہے' تمہارا اتنا خیال رکھتی ہے' کیا حرج ہے جو اس کی بات مان جاؤ گے۔'' وہ بیٹے کو پچکار رہی تھیں۔

''مہمان بچی ہمیشہ کے لیے آپ سب کے سروں پر سوار ہو جائے گی۔'' سمن نے بھائی کی پلیٹ میں سالن نکال دیا تھا اور اسے کھانا ہی پڑا' اس کایا پلٹ پر سب حیران تھیں۔ ویرا کی آمد نے اس گھر میں چھائے سناٹے اور جمود کو توڑ دیا تھا۔

✦❃✦

چاچا جی' ویرا پر کمال کی مہربانیاں کر رہے تھے۔ ان سب کو ویرا کے ساتھ گاؤں گھومنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اگرچہ مبرم نے کافی اعتراضات کیے تھے' مگر پھر چاچا جی نے جب اجازت دے دی تو مبرم کو خاموش رہنا ہی پڑا۔

ویرا کے جلو میں یہ چھوٹا سا لشکر سیاحت کے لئے نکل چکا تھا۔ حالانکہ گاؤں میں دیکھنے والی کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔ ایک گدلے پانی کی نہر تھی۔ یا پھر آم کے باغات تھے اور خربوزوں کے کھیت۔ ویرا کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا اور وہ فطرت کے حُسن کو بہت دل سے محسوس کر رہی تھی۔

ثمرہ' سمانہ اور سمن تینوں خربوزے توڑنے کے لیے کھیت میں اتر گئی تھیں۔ سمن برابر میں کسی اور کی زمین کے تربوز دیکھ رہی تھی۔ ان کے برابر میں کسی اور کی زمین تھی۔ اس کھیت میں تربوز لگے ہوئے تھے۔ ویرا کے پوچھنے پر گوشی نے اسے بتایا۔

''یہ میرے ماما جی کی زمین ہے۔ آپ کے شہر میں ہی ہوتے ہیں۔'' وہ دونوں اس وقت ٹیوب ویل کے حوض کی چار دیواری نما کچھ اونچی دیوار پر بیٹھی خربوزے کھا رہی تھیں۔

''اویس لوگوں کی۔''

''جی...... کیا آپ اویس کو جانتی ہیں؟'' گوشی کچھ چونک گئی۔

''ہاں' اکثر ہمارے گھر آتا رہتا ہے۔'' اس نے لاپروائی سے خربوزہ کھاتے ہوئے بتایا۔

''خالو جی کا جھگڑا چل رہا ہے ماما جی کے ساتھ' زمینوں کے کچھ مسئلے پر۔'' نہ جانے کیوں گوشی بے انتہا افسردہ ہو گئی تھی۔

''اچھا...... مگر کیوں؟'' اس کی رنجیدگی محسوس کر کے وہ ٹھٹکی۔

''بس ایسے ہی...... معمولی سی بات تھی' مگر خالو جی نے انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ جو زمین خالو جی خریدنا چاہتے تھے' وہ ماما جی نے خرید لی تھی' بس اسی وجہ سے۔'' گوشی لب کچل کر خاموش ہو گئی۔

''اتنی معمولی سی بات پر رنجش۔''

''جی...... اسی لیے انہوں نے میرا رشتہ بھی توڑ دیا۔'' گوشی کی آنکھیں برسنے کو بے تاب ہو گئیں۔

”رشتہ توڑ دیا۔“ اب کے وہ پوری کی طرف گھوم گئی تھی۔

”پہلے خود ہی اویس کے ساتھ میری منگنی کی تھی اور پھر خود ہی توڑ بھی دی۔ ماما جی اتنی دفعہ آئے ہیں‘ مگر خالو مانتے ہی نہیں۔“ وہ لب کچلتے ہوئے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی‘ مگر اس کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ شفاف آنسو اس کے گالوں پر پھسلتے جا رہے تھے۔

”خالہ چاہتی تھیں کہ مبرم بھایا سے میری شادی ہو‘ مگر ماما جی نے میرا رشتہ اویس کے لیے مانگا تھا تو پھر خالہ نے انہیں ہاں بول دی‘ مگر اب خالو نہیں مان رہے‘ وہ میرا رشتہ کہیں اور کر رہے ہیں‘ سمانہ کے سسرال میں۔“

”مگر چاچا جی ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ وہ گوشی کے آنسوؤں سے اندازہ تو لگا ہی چکی تھی کہ اویس سے کس حد تک اس کی جذباتی وابستگی ہے۔

”پتا نہیں کیوں؟“ سمن دو بڑے سائز کے تربوز اٹھا لائی تھی۔ گوشی نے سرعت سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

”تمہارے ”ان“ کے کھیت سے چوری کا مال اڑا لائی ہوں۔“ سمن اب ٹیوب ویل کے ٹھنڈے ٹھار پانی سے تربوز دھو کر ٹھنڈے کر رہی تھی۔ سمانہ اور ثمرہ بھی کیچڑ میں لت پت ہاتھ پیر لیے آ گئیں۔

”تم روئی ہو؟ آنکھیں کیوں سرخ ہیں تمہاری؟“ سمانہ کی آنکھوں میں فکرمندی اتر آئی۔ وہ گوشی کی طرف متوجہ تھی۔

”نہیں تو......“ وہ ہاتھوں کی انگلیوں سے آنکھیں مسلنے لگی۔

”اویس کے تربوز دیکھ کر اویس یاد آ گیا ہو گا۔“

سمن اسے ہنسانے کی کوشش کر رہی تھی۔ گوشی کو اپنا موڈ بحال کرنا پڑا تھا۔ وہ اپنی جان سے پیاری کزنز کو اپنے لیے فکرمند ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی اور یہ سچ ہی تھا کہ سمانہ اور ثمرہ کو گوشی بے انتہا عزیز تھی۔ بچپن سے اکٹھے رہنے کی وجہ سے انسیت بڑھتی چلی گئی تھی۔ پھر جب ابو نے مبرم کا رشتہ ویرا سے طے کر دیا تو ان سب کو اماں سمیت بہت دکھ کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا تھا۔

وہ گوشی جیسی معصوم اور پیاری‘ بے انتہا ہمدرد لڑکی کو ہی اپنی بھابی بنانا چاہتی تھیں۔

مگر جب انہیں گوشی کی اویس کے لیے پسندیدگی کی بات معلوم ہوئی تو خود بخود ان کے دلوں اور ذہنوں نے ویرا کو بطور بھابی قبول کر لیا تھا۔ وہ گوشی کا دل ٹوٹنے کے خیال سے افسردہ تھیں‘ مگر جب حقیقت معلوم ہوئی تو مطلع خود بخود صاف ہو گیا۔ ویرا کے لیے کینہ‘ بغض اور کدورت کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا۔

”جی نہیں‘ ایسی کوئی بات نہیں۔“ گوشی جھینپ کر مسکرا دی۔ سمن تربوز کاٹ رہی تھیں۔ ٹھنڈا میٹھا بے حد سرخ تربوز کھا کر وہ سب شام ڈھلے گھر واپس آئی تھیں۔

✦❋✦

چھت کے پچھواڑے ایک قطار سے بلند و بالا درخت لگائے گئے تھے جن کی اونچی، گھنی اور بلند شاخیں چھت کو بھی سایہ بخشتی تھیں۔ شام کو اس قدر ٹھنڈی ہوا چلتی تھی کہ گویا سرور آ جاتا۔ شام سے پہلے ہی سورج گھنی شاخوں کی اوٹ میں چھپ جاتا تھا۔ سو گرمائش اور تپش کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا۔

ویرا کو شام کے وقت چھت پر ٹہلنا پسند تھا۔ اکثر سمانہ اور سمن چائے کے لوازمات لے کر اوپر ہی آ جاتی تھیں۔ ویسے مبرم اور ابو جی انہیں بہت کم ہی چھت پر ٹہلنے کی اجازت دیتے تھے، مگر ان دنوں ویرا کی وجہ سے ہر طرح کی آزادی میسر تھی۔ وہ نرم نرم، پکی پکی جامنیں پیالے میں اتار کر رکھتی جا رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ڈوبتے سورج کو الوداع کہا تھا اور خود سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔ گیلری میں سے گزرتے ہوئے مبرم کے کمرے کا کھلا دروازہ دیکھ کر وہ اندر جھانکنے سے باز نہیں آئی تھی۔ مبرم ایک پیکٹ ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا، جو اس نے گوشی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اویس نے خریدے ہیں اور مامی نے بھجوائے ہیں۔ اب یہ نہیں پتا کہ مامی کی آڑ میں اویس صاحب نے کیا کچھ تحفتاً بھیجا ہے، ویسے اس کی جاب بھی لگ چکی ہے۔"

"شکریہ بھایا۔" گوشی نے بے ساختہ خوشی چھپاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ شکریہ بھی اسی کا ادا کرنا۔ ابھی کچھ دیر بعد اس کی میرے سیل پر کال آئے گی۔ احتیاط سے بات کر کے سیل مجھے واپس کر دینا۔" اس نے اپنا موبائل فون بھی گوشی کو تھما دیا تھا۔ گوشی کے باہر نکلتے ہی ویرا دبے قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اگرچہ ساری بات تو وہ سن ہی چکی تھی، مگر مبرم کو بھلا کیوں نہ جلاتی۔

"اوہو...... تو تحفے تحائف دیئے جا رہے تھے۔"

"جی، بالکل ...... جب تم میرے گھر والوں کو دو چار تحفے دے کر اپنا گرویدہ بنا سکتی ہو تو میں بھلا کیوں پیچھے رہتا۔" وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے ہی دیتا تھا۔

"اور تم نے سوچا، کیوں نا گوشی کو اپنا گرویدہ بنا لیا جائے۔" ویرا نے گویا خوب ہی لطف لیا۔ وہ اطمینان سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"مجھے ایسی گھٹیا کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔" اپنی بات میں وہ خود ہی پھنس کر رہ گیا تھا۔

"مگر میں نے خود تمہیں یہ گھٹیا کوشش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" وہ جان بوجھ کر اسے چڑا رہی تھی۔

"کوئی کام ہے مجھ سے؟" وہ اس کے کمرے میں آنے کی وجہ پوچھ رہا تھا۔

"کام تو ہے۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"بولو۔" مبرم کا انداز مصروف سا تھا۔

"یہ گوشی اور اویس کا کیا معاملہ ہے؟" وہ دوپٹے کے ایک کونے میں لپیٹے جامن نکال کر کھانے لگی تھی۔

''جب جانتی ہو تو پھر پوچھنے سے حاصل۔''

''چاچا جی ظالم سماج کس خوشی میں بن رہے ہیں؟''

''چاچا جی ظالم سماج ہی نہیں ظالم جلاد بھی ہیں۔ دوسروں کی خوشیوں کا رس نچوڑنے والے۔'' وہ گویا زہرخند ہوا تھا۔

''اب یوں تو نہ کہو' یہ چین تمہارے نام کی' انہوں نے ہی مجھے پہنائی ہے۔'' ویرا مسکرا کر بولی تھی۔

''بس اسی بات پر خوش ہوتی رہنا۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔''اچھی بات ہے' تم پر آگہی کے عذاب نہیں اترے۔''

''تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو نا۔''

''نہیں۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

''ویرا بی بی! کیوں گھر بدر کرنا چاہتی ہو۔'' اس کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی اور پھر وہ کچھ دیر کے لیے بھی نہیں رکا تھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا' جبکہ ویرا کمرے کے عین وسط میں کھڑی رہ گئی۔

✦❋✦

''ابھی تو نو بھی نہیں بجے۔''

''گاؤں میں پورے تین ہفتے رہنے کے بعد جب وہ شہر لوٹی تو چاچا جی اور چاچی تاریخ طے کرنے کے لیے آگئے تھے۔ زبانی کلامی تاریخ تو طے ہوگئی تھی تاہم باقاعدہ شگن کی رسم کرنا باقی تھی۔

ان ہی دنوں میں مبرم کا رزلٹ بھی آگیا تھا اور مبرم نیازی صاحب نے ان سب کے حال پر رحم کرتے ہوئے پورے کالج میں ٹاپ کر کے چاچا جی کو بھی خوش کر دیا تھا اور وہ مبرم کا نکاح کرنے کے بعد اسے یو کے بھیجنا چاہتے تھے۔

ادھر مبرم نہ تو نکاح کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی یو کے جانے کے لیے رضامند ہو رہا تھا۔ اسے پاکستان میں ہی رہنا تھا اور یہ اس کی ضد نہیں' خواہش تھی۔

شگن کی رسم سے پہلے مبرم کی فون کالز آنا شروع ہوگئی تھیں اور ہر فون کال میں اس کا ایک ہی دھمکی نما پیغام تھا۔

''تم میرے ساتھ شادی سے انکار کر دو' مجھے تم سے شادی نہیں کرنا۔ میں گوشی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

اس قسم کے فونز سن کر ویرا عجیب سی پریشانی میں گویا جکڑ کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گوشی کا دل کسی اور کے ساتھ منسوب ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مبرم کے دل میں گوشی کا ذرہ بھر خیال نہیں۔ وہ گوشی سے محبت نہیں

کرتا۔ اس کے باوجود اسے مبرم کی طرف سے اس مطالبے نے گویا چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ یہ بات درست تھی کہ منگنی سے لے کر آج تک مبرم نے اس سے کوئی اظہار پسندیدگی نہیں کیا تھا' مگر وہ بخوبی سمجھتی تھی کہ مبرم محض اسے جلانے کلسانے کے لیے گوشی کے حوالے سے چھیڑتا ہے۔ شادی سے انکار کی وجہ تو اسے آج تک سمجھ نہیں آئی تھی' یہاں تک کہ شادی کا دن بھی قریب آ گیا۔ جس دن شگن کا جوڑا اور دیگر سامان لے کر چاچا جی اور چاچی آئے تھے' یہ اسی شام کی بات ہے۔ مبرم نے عادتاً پھر فون کیا تھا اور وہ اس کی طویل تقریر خاموشی سے سن رہی تھی۔

''میری ماں اور بہنیں گوشی کو بہت چاہتی ہیں اور میری شادی گوشی کے ساتھ کرنے کی خواہش مند ہیں۔ تمہیں بھلا میرے گھر آ کے کیا ملے گا' نہ عزت' نہ محبت اور تم صرف نام کی حد تک بیوی ہو گی۔ شادی تو میں گوشی سے کروں گا۔'' مبرم خاموش ہوا تو وہ گویا پھٹ پڑی۔

''پلیز مبرم! اب اتنے جھوٹ مت بولو' تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے' نہ کرو مگر گوشی کا بار بار نام کیوں لیتے ہو' میں جانتی ہوں تمہیں گوشی تو کیا کسی سے بھی محبت نہیں۔''

''تم سچ کہہ رہی ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ وہ میرے دوست کی منگیتر ہے' مگر میں پھر بھی تم سے شادی نہیں کر سکتا' کبھی بھی نہیں۔''

نہ جانے کیوں مبرم کا لہجہ عجیب سے دکھ کے احساس کے بوجھل پن میں دب کر رہ گیا۔

''مجھے ریجیکٹ کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ تو بتا دو۔'' ویرا گویا لمحہ بھر میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی۔ خوابوں کی کرچیوں نے یکبارگی آنکھوں کو زخمی کر دیا تھا اور نہ جانے کہاں کہاں سے خون رسنے لگا تھا۔ دل پر گویا عجیب سے سناٹوں نے قبضہ کر لیا۔

''یہ سوال بہت مشکل ہے ویرا! میں اس کا جواب نہیں دے پاؤں گا۔ ہو سکے تو مجھے بھول جانا۔'' اس نے گویا درخواست پیش کی تھی' ویرا کا دل گویا دھک سے رہ گیا۔

''سب جانتے ہو پھر بھی۔'' اس نے اپنا ہر آنسو دل پر گرا لیا تھا۔

''بعض فیصلے پل صراط کی طرح ہوتے ہیں اور پل صراط کو کسی نہ کسی طریقے سے عبور تو کرنا ہوتا ہے۔'' مبرم کا لہجہ بھی چیخ رہا تھا۔

''تم جانتے ہو' صرف تین دن بعد ہماری شادی ہے' کارڈ بھی بٹ چکے ہیں مگر میں پاپا سے بات کر لوں گی۔ تم فکر مت کرنا' جب دل نہ ملیں تو کاغذ کے بندھن کا بھلا کیا فائدہ؟'' وہ گویا فیصلہ کر چکی تھی۔

''کبھی کبھی دل بھی مل جاتے ہیں' مگر نصیب اور ستارے نہیں ملتے۔''

مبرم نے فون رکھ دیا تھا اور ویرا کے اعصاب پر گویا صدیوں کی تھکن سوار ہو گئی تھی اور وہ آج بھی مبرم کے رویے کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

✦❋✦

بہت ہمتیں مجتمع کر کے اس نے پاپا سے بات کرنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا۔

یہ بہت کٹھن ترین اور دشوار مرحلہ تھا' مگر اس نے نوکیلے پتھروں والے راستے کا انتخاب کر ہی لیا تھا۔ پاپا جو اس کے فرض کی سبکدوشی کے خیال سے سرشار رہتے تھے۔ ویرا جانتی تھی اس کا یہ سفاکانہ فیصلہ ان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا اور وہ خود بھی تو اندرونی توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہی تھی۔

پاپا ہمیشہ کی طرح سٹڈی روم میں بند تھے اور وہ اپنے کمرے میں۔ بہت کوششوں کے بعد وہ لرزتی ٹانگوں کا بوجھ بمشکل سہارے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تھی۔ سٹڈی روم تک کا راستہ کسی پہاڑ کو سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔

اس نے جوں ہی دروازے کے ہینڈل کو گھمانا چاہا تو اندر سے آتی آوازوں کو سن کر ٹھٹک گئی تھی۔

''کیا چاچا جی آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے اپنی بے خبری کو جی بھر کر کوسا تھا اور پھر اندر سے آتی کچھ غیر معمولی سی گفتگو کو سننے لگی۔

''بھائی جی! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔'' چاچا جی کا سٹائل تمہید باندھنے جیسا تھا۔ ویرا اندر جانے کے بجائے وہیں رکی رہی۔

''کیوں نہیں عزیز! بولو۔'' پاپا نے خوش دلی سے کہا۔ چاچا جی شاید کچھ لمحے سوچ میں ڈوبے رہے تھے۔ جب بولے تو ان کی آواز عجیب سرد سی تھی۔

''بھائی جی! پٹواری سے ایک بات پتا چلی ہے۔'' چاچا جی بھی گویا تول تول کر بول رہے تھے۔

''کون سی بات؟'' پاپا بھی شاید الجھ گئے تھے۔

''بات دراصل یہ ہے۔'' چاچا جی نے گلا کھنکار کر کہنا شروع کیا۔ ''مال پٹواری آج میری طرف آیا تھا۔ بس ایسے ہی باتوں باتوں میں اس نے آپ کے سرمائے اور وراثتی جائیداد کے بارے میں بات کرنا شروع کر دی تھی۔ پٹواری کے کہنے کے مطابق آپ کے نام کوئی بھی جائیداد نہیں' حالانکہ میں اسے کئی مرتبہ جھٹلاتا رہا ہوں۔ آپ نے صرف اپنے حصے کی زمین بیچی تھی' مگر وہ تین کروڑ کی مالیت کا پلاٹ اور یہ بنگلہ تو آپ کی ملکیت میں ہے نا۔ مگر پٹواری مان کے نہیں دے رہا تھا۔ میرا ذہن کافی الجھ گیا تھا۔ سوچا آپ سے بات کو کلیئر کر لوں۔''

''پٹواری ٹھیک کہہ رہا تھا عزیز! میرے نام کسی بھی قسم کی جائیداد نہیں ہے۔'' پاپا نے شاید کوئی دھماکہ ہی تو کیا تھا۔ چاچا گویا ہکا بکا رہ گئے تھے۔ ادھر ویرا نے بھی دروازے کو ذرا سا کھول دیا تھا۔ اب ان کی آوازیں ہی نہیں' چہرے بھی نظر آ رہے تھے اور وہ چاچا کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ نسبتاً بگڑتا' مٹتے نقوش والا چہرہ۔

''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' چاچا ششدر رہ گئے تھے۔ ''آپ کا وہ ساڑھے تین کروڑ والا پلاٹ۔''

''وہ پلاٹ میرے ایک کلائنٹ نے مقدمہ جیتنے کی خوشی میں مجھے دیا تھا' بعد میں اس کا کسی اور سے جھگڑا

بن گیا۔ بہت سال وہ پلاٹ میرے نام ہی رہا ہے۔ جب اس کا جھگڑا ختم ہو گیا تو میں نے دوبارہ قانونی طور پر اس کا پلاٹ واپس کر دیا تھا۔ مجھے جائیدادوں اور جاگیرداروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور یہ تم بھی اچھی طرح سے جانتے ہو۔'' پاپا اپنی سادگی میں چاچاجی پر دھیرے دھیرے میزائل گرا رہے تھے اور چاچاجی کی رنگت بالکل متغیر ہو چکی تھی۔

''اور یہ گھر......'' انہوں نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''یہ گھر بھی کرائے کا ہے۔'' پاپا اپنے ازلی سادہ سے انداز میں بتا رہے تھے۔

''آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔'' چاچاجی کا رنگ بالکل پھیکا پڑ گیا تھا۔

''اس میں ایڈورٹائزمنٹ کی بھلا کیا بات تھی۔'' پاپا لاپروائی سے بولے۔

''تو کیا اتنے سال مفت مقدمے لڑتے رہے ہیں؟ ایسی پڑھائی اور علم کا بھلا کیا فائدہ' نہ کچھ جوڑا ہے نہ کچھ بنایا ہے۔'' چاچاجی کا لہجہ بلا کی کاٹ لیے ہوئے تھا۔

''دنیا جمع کرنے کا خیال نہیں آیا۔ جو کچھ پاس ہوتا تھا بس اللہ کا نام لے کر حج کر آتا تھا۔ مولا کا کرم ہے جو اس نے بار بار اپنے گھر میں بلوایا ہے مجھے۔''

''دنیا داری کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔'' وہ چبھتے لہجے میں بولے۔

''تو ہم نے سارے ہی تقاضے پورے کیے ہیں۔''

''کیا' کیا ہے بھلا؟'' وہ تنک کر پوچھنے لگے۔ دھیرے دھیرے ان کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی اور ویرا کا دل سمٹ سمٹ جا رہا تھا۔

''کیا کچھ نہیں کیا۔ اکلوتی بیٹی کی بہترین تربیت کی ہے۔ بہترین تعلیم دلوائی ہے۔ ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے' سوسائٹی میں نام ہے۔'' پاپا بھی گویا برا مان کر بولے۔

''معاف کیجئے گا بھائی جی! سوسائٹی میں نام پیسے کی بدولت بنتا ہے۔''

''چھوڑو ان باتوں کو' بتاؤ چائے پیو گے؟'' پاپا نے موضوع بدلنا چاہا۔

''یہ باتیں چھوڑنے والی نہیں۔'' یکایک چاچاجی کا لہجہ اور بھی کھردرا ہو گیا۔ ادھر ویرا کا دل کسی انہونی کی طرف اشارہ کرنے لگا تھا۔

''آپ کو پتا ہے کہ ویرا کا رشتہ میں نے مبرم سے کیوں جوڑا تھا؟''

''نہیں۔'' پاپا رکھائی سے بولے۔ انہیں چاچاجی کی گفتگو کے انداز غصہ دلا رہے تھے۔

''صرف اس لیے کہ گھر کی جائیداد باہر نہ جائے۔'' چاچاجی نے اجنبی سے لہجے میں کہا۔

''مگر اب جبکہ جائیداد سرے سے ہے ہی نہیں تو میں اس رشتے کو ختم کر رہا ہوں۔ میرے بیٹے کو رشتوں کی کمی نہیں۔ کئی صاحب جائیداد لڑکیاں منتظر بیٹھی ہیں۔ ایک تو میراں کی بھانجی گوشی ہے۔ پورے آٹھ ایکڑ

رقبے کی مالک' اسی لاکھ کی مالیت کی زمین ہے اس کی' میں مبرم کی شادی گوشی سے کر رہا ہوں۔ آپ نے مجھے انجان رکھ کر اچھا نہیں کیا۔ بتاتے کچھ ہیں اور دکھاتے کچھ ہیں۔'' چاچا جی نے اپنے چہرے پر سے سارا نقاب ہٹا دیا تھا اور اب ان کے بدنما اور کریہہ چہرے کی طرف دیکھنا بہت مشکل تھا۔ ویرا کا دل ایک دم بھر آیا۔

''اوہ ...... تو میں اب سمجھا۔'' پاپا نہ جانے کیسے اس شاک سے سنبھلے تھے۔ نامور وکیل ہونے کے باوجود انہوں نے دھوکہ کھایا بھی تو کس سے؟ ''تم مبرم کی شادی کے ذریعے مفت کی دولت حاصل کرنا چاہتے تھے؟'' وہ ان کی خودغرضی اور لالچ پر گہری چوٹ کرتے ہوئے بولے۔

''یہ ہی آج کل ہو رہا ہے بھائی جی! سب ہی کو ترقی کے لیے زینہ درکار ہوتا ہے۔'' چاچا جی قطعاً شرمندہ نہیں تھے۔

''اور تم منافع سمیت رقم وصولنا چاہتے ہو' واہ' اچھی چال بازی ہے۔'' پاپا کا لہجہ تلخ ترین تھا' چاچا جی اب اٹھ رہے تھے۔ پاپا بھی ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

''میں خود بھی اس رشتے کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میری طرف سے جواب سمجھو۔'' پاپا گویا ضبط اور صبر کی کڑی منزلوں سے گزر رہے تھے اور چاچا جی بغیر کسی پشیمانی کے سر اٹھائے باہر نکل رہے تھے۔ رشتوں کی اس دراڑ نے ویرا کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ خودغرضی کی یہ نہ جانے کون سی قسم تھی؟

✦❋✦

''تم نے کچھ کہنا ہے؟'' عزیز نیازی نے اپنے سامنے بیٹھے تذبذب کا شکار بیٹے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''جی ابو!'' وہ سر جھکائے لفظ پکڑنے اور جملے جوڑنے کی کوشش میں تھا۔

''پہلے میری بات سن لو۔ پھر اپنی سنانا۔'' وہ حساب کتاب کا کھاتہ کھولے بیٹھے تھے۔ نئی زمینیں خرید لی تھیں۔ وہ نفع' نقصان' آمدنی اور سرمایہ کاری کا حساب کر رہے تھے۔

''پہلے آپ میری بات سن لیں۔'' وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ عزیز نیازی نے گویا سر ہلا کر اجازت دے دی۔

''مجھے ویرا سے شادی نہیں کرنا۔'' اس نے اپنی بات چند جملوں میں باپ تک پہنچا دی۔ عزیز نیازی نے ہنکارا بھر کر بیٹے کی طرف دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ اتنی آسانی سے مان جائیں گے' مبرم کو یقین نہیں آیا۔

''آپ نے انکار کی وجہ نہیں پوچھی؟''

''میں نے ضروری نہیں سمجھا۔''

''مگر میں وجہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔'' مبرم کی آواز میں ضدی پن کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے' بتا دو مگر مختصر لفظوں میں۔'' انہوں نے گویا پھر سے کمال مہربانی کر دی۔ مبرم نے کچھ دیر

سوچنے میں وقت لیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

''آج سے صرف چند سال پہلے کی بات ہے ابو! یقیناً آپ کی یادداشت بھی کمزور نہیں ہوگی' آپ کو بھی سب کچھ یاد ہے' یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔

میں نیا نیا کالج گیا تھا۔ اس وقت ہاسٹل میں مجھے کمرہ نہیں مل سکا۔ سو آپ مجھے پاپا جی کی طرف لے گئے تھے اور میں نے پورے تین ماہ تک ان کے گھر میں قیام کیا تھا۔ اس دوران ان کی اکلوتی بیٹی' ویرا نے میرا بے حد خیال رکھا تھا۔ وہ میری ایج کی تھی' مگر پڑھائی میں مجھ سے ایک سال آگے تھی۔ وہ بہت ذہین تھی' پُراعتماد تھی' سٹائلش تھی اور بلا کی سلیقہ مند بھی تھی۔ میں نے ایک چھوٹی سی لڑکی کو ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور مجھے اس سے باتیں کرنا اور اسے دیکھنا اچھا لگتا تھا اور میں اپنی فیلنگز کو سمجھ نہیں پا رہا تھا اور یہی فیلنگز میں نے آپ سے ایک مرتبہ شیئر کر دی تھی۔ بے تکلفی تو میرے اور آپ کے درمیان کبھی بھی نہیں رہی تھی' مگر پھر بھی میں اپنی خاندانی روایات کو جانتا تھا اور اسی وجہ سے میں نے آپ سے اس غیر مناسب عمر میں ایک مناسب سی بات کہی تھی۔

میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ پاپا جی سے ویرا کو میرے لیے مانگ لیں۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ ہمارے ہاں بچپن میں یا لڑکپن میں رشتے طے کر دیئے جاتے ہیں۔ میں نے صرف پاپا جی تک بات پہنچانے کے لیے کہا تھا' مگر آپ نے ہنٹر پکڑ کر میری دھنائی کر دی۔ وہ مار مجھے آج تک نہیں بھولی اور میں نے اس وقت دل میں عہد کیا تھا کہ ویرا محمود الحسن نیازی اگر سونے کی بھی بن گئی تو پھر بھی آپ کے توسط سے طے کیا گیا میرا اور اس کا رشتہ مجھے کبھی قبول نہیں ہوگا۔ یہ میری ضد تھی جس کی بھینٹ میں اپنے اولین خواب کو چڑھا دینا چاہتا تھا۔ ضد میں اور ہٹ دھرمی میں آپ کے برابر ہی تو میں کھڑا ہوں۔

اس وقت آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کوشی کے ساتھ میری شادی کریں گے' تاکہ اس کے حصے کی آٹھ ایکڑ زمین ہمیں مل جائے۔ تب میں آپ کی سوچ تک رسائی نہیں کر پایا تھا۔

پھر آپ نے میری ہر خواہش کو دھتکارنے پر گویا مہر لگا دی تھی۔ مجھے میری پسند کا شعبہ آپ نے منتخب نہیں کرنے دیا۔ نہ میں فوج میں جا سکا' نہ میں پائلٹ بن سکا اور نہ ہی ڈاکٹر۔

بس آپ کی ایک ضد نے میری خواہشات کو کانٹوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر زخمی کر دیا تھا۔ وقت آگے بڑھتا رہا دن گزرتے رہے اور آپ پر کچھ انکشافات ہوئے۔ آپ کو پتا چلا کہ پاپا جی ایک بہت اہم مقدمہ جیت گئے ہیں اور ان کے موکل نے تین کروڑ کی مالیت کا پلاٹ انہیں تحفے میں دیا ہے۔ یوں آپ نے ایک اور پلاننگ ترتیب دے لی اور کچھ وقت اور مزید انتظار کرنے کے بعد ویرا کو میرے لیے مانگ لیا۔ ویرا کے ساتھ ہمیں بہت کچھ مل جانا تھا۔ شہر میں بہترین بنگلہ' بینک بیلنس اور شاندار قسم کا پلاٹ' یہ سودا گھاٹے کا نہیں تھا۔ مگر گھاٹا ہمارے نصیب میں لکھا تھا۔'' وہ ابھی مزید کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر عزیز نیازی نے اسے غصے کے عالم میں

ٹوک دیا۔

''تمہاری اس بکواس کا آخر مقصد کیا؟'' آئینہ دیکھنا آسان نہیں ہوتا اور جب اپنی ہی اولاد اٹھ کر آئینہ دکھانے لگ جائے تو یہ کام اور بھی مشکل ترین ہو جاتا ہے۔

''مقصد ہی تو بتانا چاہ رہا ہوں۔'' مبرم کا لہجہ بھی تلخ ترین ہو گیا۔

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ دفع ہو جاؤ۔'' وہ چنگھاڑ کر بولے۔ مبرم زہر خند کے ساتھ باہر نکل گیا۔

✦❋✦

اس وقت کمرے میں وہ باپ' بیٹا ہی نہیں' اماں بھی موجود تھیں' مگر ان تین افراد کی موجودگی کے باوجود کمرے میں بلا کا سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس سناٹے اور طوفانی خاموشی کو ابو جی کی آواز نے توڑا۔

''جمعہ کی شام کو تمہارا نکاح گوشی کے ساتھ ہے۔'' انہوں نے گویا دھماکہ کرنا چاہا۔

''لیکن مجھے یہ نکاح نہیں کرنا' میں شادی کروں گا تو صرف اسی کے ساتھ جو میرے نام کی مہندی لگائے بیٹھی ہے' جس کے ساتھ میری بات طے ہے۔''

''مبرم!'' وہ گویا پھنکارتے' دھاڑتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔ ''ابھی خود میرے سامنے تم نے کہا تھا کہ ویرا سے تم شادی نہیں کرو گے۔''

''ہاں' کہا تھا' مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ آپ پاپا جی کے ناتواں دل پر کون سا ستم ڈھا کر آئے ہیں اور میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ لالچ نے آپ کی آنکھ پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں مبرم نیازی آپ کا بیٹا ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ آپ علیم نیازی کے بھائی ہیں۔ میں جمعہ کی شام کو نکاح ضرور کروں گا' مگر گوشی کے ساتھ نہیں ویرا نیازی کے ساتھ اور یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔''

''مبرم! تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے۔ تم میرے بیٹے ہو' مجھے جھکانا چاہتے ہو کیا؟ یہ میری انا کا مسئلہ ہے۔ محمود الحسن نیازی کی بیٹی بیاہ کر اس گھر میں کبھی نہیں آئے گی۔'' وہ برابر چلائے جا رہے تھے۔

''یہ آپ کے لالچ کی شکست ہو گی۔ آپ کی خود غرضی کی ہار ہو گی۔ آپ نے رشتوں کے معاملے میں جوا کھیلا تھا' مگر آپ اس جوئے میں ہار گئے ہیں۔'' مبرم نے تنفر بھری نظر سے انہیں دیکھا تھا اور وہ اسی ایک نظر کے تیر سے گھائل ہو گئے تھے۔

''مبرم! میرا بچہ ہے۔ میری جان! یہ سب جھوٹ ہے۔ تجھے غلط فہمی لاحق ہوئی ہے۔'' وہ ہکلا کر رہ گئے تھے۔ پے در پے ذلت کے تھپڑوں نے انہیں ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ خود کو نظر اٹھانے کے قابل نہیں سمجھ رہے تھے۔

''جھوٹ نہیں' یہ سچ ہے اور سچ اب ہی تو کھلا ہے۔'' وہ سر سے پیر تک سلگ رہا تھا۔

''اور میں تمہارے سامنے اپنی سچائی ثابت کر کے رہوں گا۔ چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔''

جذباتیت، غصہ اور بیٹے کی آنکھوں میں اتری نفرت نے ان کے حواس معطل کر دیئے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ مبرم کو کیسے حقیقت کا علم ہوا ہے اور بیٹے کی نظر سے گرنے کی ذلت سہارنا ان کے لیے بہت مشکل امر تھا۔ اس ذلت سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ راستہ موت کے علاوہ بھلا کیا ہوسکتا تھا۔ وہ مبرم کو آوازیں دے رہے تھے، مگر وہ کانوں کو گویا بند کیے راستے میں آئی ہر شے کو ٹھوکروں سے اڑاتا باہر نکل رہا تھا۔

''مبرم چلا گیا ہے۔'' وہ گویا پتھرا کر رہ گئے تھے۔ غم اور غصہ انتہا پر پہنچ جائے تو انسانی دماغ پر مختلف کیفیات طاری ہو جاتی ہیں۔

وہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کے عمل کا شکار تھے اور یہی چیز ان کی منفی سوچوں سے ٹکرا ٹکرا کر نہیں اور بھی مشتعل کر رہی تھی۔

''نہیں بھائی جی! ہمیشہ ساری خوشیاں آپ کے نصیب میں تو نہیں لکھی جا سکتیں ...... پہلے وجیہ کی صورت میں آپ کو خوشی مل گئی تھی اور اب مبرم پر قبضہ جما لو گے۔ اپنا بیٹا تو ہے نہیں۔ ہماری رعایا پر تسلط جمانے کے خواب مت دیکھو۔''

وہ منفی سوچوں کے زیر اثر بہت اندھیرے میں جا رہے تھے جہاں سے روشنی کی ننھی سی کرن کا ملنا بھی بہت مشکل تھا۔

انہوں نے بہت کوشش کے بعد ایک چھوٹا سا پلان ترتیب دیا تھا۔ یہ پلان بہت چھوٹا سا معمولی سا ہی تو تھا ان کے نزدیک۔

پھر انہوں نے پیغام بھیج کر میراں بیگم اور گوشی کو بلوا لیا تھا۔ ان دو خواتین میں ایک تو ان کی شریک حیات تھیں۔ بے حد اطاعت گزار، خدمت میں ہمہ وقت مشغول رہنے والی۔

اور دوسری گوشی تھی۔ ان کی شریک حیات کی سگی بھانجی۔ تمام عمران کے احسانوں تلے دبی ہوئی۔ ڈری، سہمی، خوف زدہ ...... وہ جانتے تھے کہ ان کے ذرا سے دھمکانے پر وہ ایک ٹیپ ریکارڈ کی طرح بولے گی۔ انہیں کبھی بھی کم از کم اس کے زبان کھولنے کا خدشہ نہیں ہوگا۔

''جب میں بھائی جی کے گھر گیا تو گوشی میرے ساتھ تھی۔'' انہوں نے پلاننگ کے مطابق ایک ایک جملے کو ترتیب دیا تھا۔ میراں بیگم قطعاً حیران نہیں ہوئی تھیں۔ یہ سچ تھا کہ کل شام کو گوشی ان کے ساتھ ہی شہر سے واپس آئی تھی۔

وہ اپنے ماما جی کے گھر مامی کے اصرار پر خالہ سے اجازت لینے کے بعد ہی گئی تھی اور خالو نے ہی اسے شہر ماما جی کے گھر بھجوایا تھا۔ البتہ واپسی پر خالو جی ہی اسے لے کر آئے تھے۔ مگر ٹھٹکا دینے والی بات تو یہ تھی کہ وہ کب ان کے ساتھ نیازی ہاؤس گئی تھی۔ اسے خالو جی کی دماغی حالت پر کچھ شک سا ہوا تھا، اسی لیے وہ گھبرا گئی تھی۔

''تم میرے ساتھ بھائی جی کے گھر گئی تھیں نا؟'' وہ ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرا رہے تھے۔

''نہیں تو...... میں کب گئی تھی؟'' گوشی ہکلا کر رہ گئی۔

''جو یہ کہہ رہے ہیں' تم وہ ہی بولو۔'' اب کے وہ بھڑک اٹھے تھے۔ خالہ نے اس کا ہاتھ دبا کر نرمی سے کہا۔ ''چپ کر کے سر ہلاتی جاؤ۔ خوانخواہ بات کو طول دے کر فساد مچائیں گے۔'' خالہ متوقع جھگڑے سے بچنے کی خاطر دھیرے سے بولی تھیں۔

''جی خالو جی! میں آپ کے ساتھ وہاں گئی تھی۔'' اس نے کپکپاتی آواز میں کہہ دیا۔

''ہوں۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گئے۔

''تم نے وہاں کیا کیا سنا؟'' اب وہ براہ راست اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گوشی اور بھی گھبرا اٹھی۔

''پتا نہیں۔'' ظاہر ہے جب وہ گئی نہیں تھی تو اس نے بھلا کیا سنا ہو گا۔

''میں تمہیں جو کچھ بتاؤں گا۔ تم نے وہ ہی کچھ سنا ہو گا ٹھیک ہے نا۔'' ان کے لہجے میں عجیب سی سفا کی تھی۔ گوشی کا دل خوف کے مارے سکڑنے لگا۔

''جی' جی۔''

''دیکھو بیٹی! تم ہماری بیٹی ہو نا۔'' اب انہوں نے اپنا انداز بدل لیا تھا۔

''جی۔'' وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

''اور بیٹیاں والدین کی عزت' ناموس کو بچانے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لیے بھی تیار ہو جاتی ہیں۔''

''جی۔'' اس نے سر جھکا لیا تھا۔ خوف کے مارے بری حالت تھی۔

''بیٹی! یوں سمجھ لو' بھرے بازار میں میرے سر سے دستار اتر گئی ہے اور میری دستار کسی اور کے نہیں' میرے اپنے بیٹے کے قدموں میں رکھی ہے۔ میری عزت کو بچا لو' میرے جھکے سر کی طرف دیکھو میں مبرم کی نظر سے گر گیا ہوں اور ذلت کا احساس مجھے مار رہا ہے۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میراں بیگم اور گوشی گھبرا اٹھیں۔ بھلا یہ پتھر کا دل رکھنے والا انسان بھی رو سکتا ہے؟

''چوہدری جی! آخر بات کیا ہے؟'' میراں بیگم کا دل پسیج کر رہ گیا۔

''بات کچھ یوں ہے کہ میں بھائی جی کے گھر گیا تھا اور انہوں نے مبرا اور ویرا کی شادی کے متعلق کچھ شرائط میرے سامنے رکھ دی ہیں۔'' وہ بہت تول تول کر بول رہے تھے۔

''کیسی شرائط؟'' میراں بیگم اور گوشی بھی چونک گئیں۔

''بھائی جی نے کہا ہے۔ وہ ویرا کی شادی اس صورت میں مبرم کے ساتھ کریں گے' جب میں اپنی ساری زمین' گھر بار ویرا کے نام کر دوں۔ پچاس تولے سونا لے کر آؤں ...... اور سب سے بڑی اور اہم بات کہ ثمرہ کا
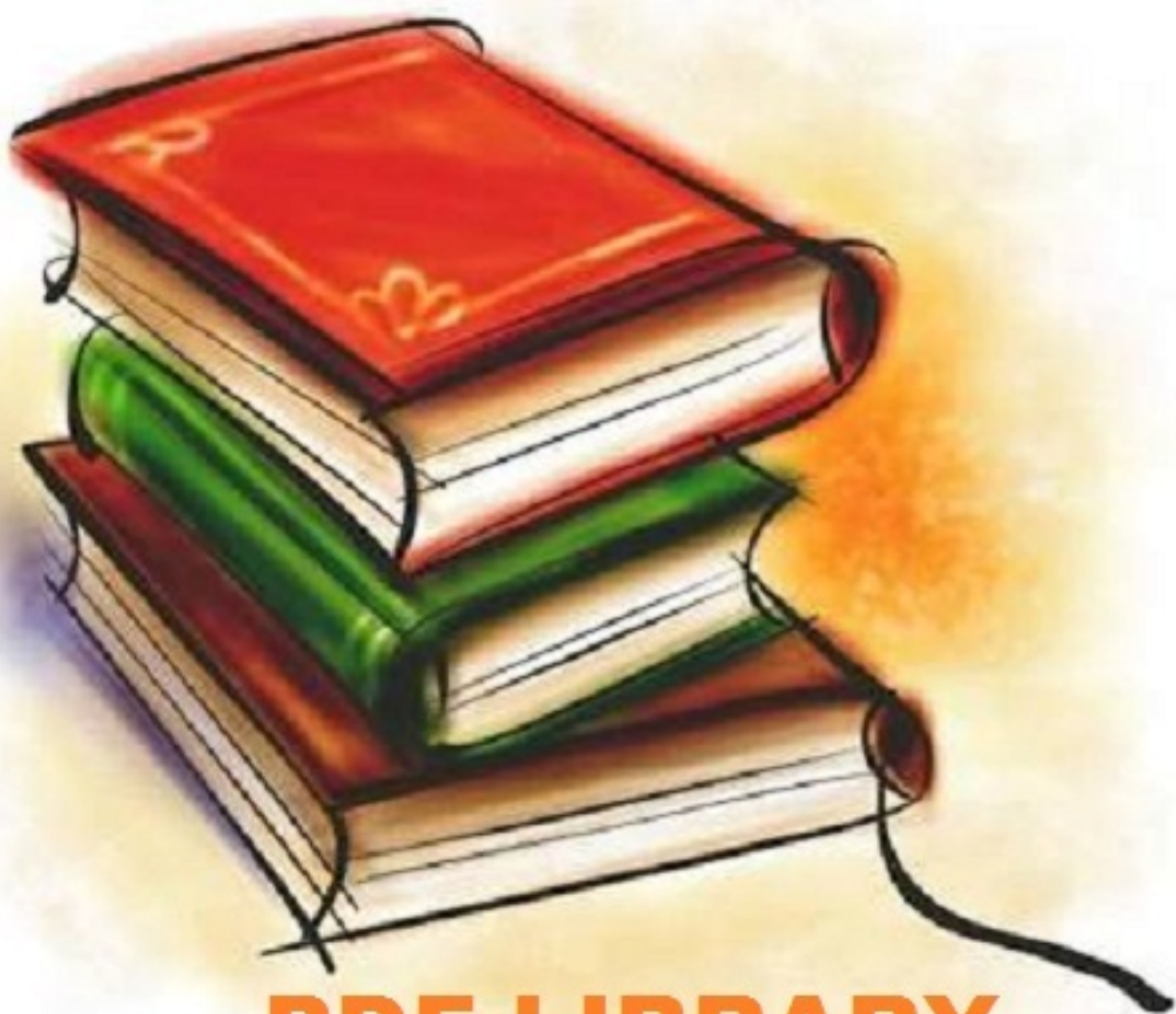
رشتہ اویس کے ساتھ طے کر دوں۔'' انہوں نے گویا بیک وقت میراں بیگم اور گوشی کے حواس اڑا دیئے تھے۔
''ثمرہ اور اویس کا رشتہ۔'' گوشی کا دماغ ایک دم سائیں سائیں کرنے لگا۔ ایسے بھلا کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے دل کے نجانے کتنے ہی حصے ہو گئے تھے۔
''بھائی جی کا دماغ تو ٹھیک ہے؟ اپنے جیتے جی ساری جائیداد بہو کے نام کر دیں۔ یعنی ہاتھ کاٹ کر اپنی بہو کے ہاتھ میں پکڑا دیں تاکہ وہ ہمیں کان سے پکڑ کر گھر سے چلتا کر دے۔'' میراں بیگم شوہر کی ہمدردی پا کر فوراً جیٹھ اور اس کی بیٹی کے خلاف بولنے لگی تھیں۔
''ثمرہ اور اویس کا رشتہ بھی بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ ادھر تو گوشی کی بات طے ہے۔'' میراں بیگم کا اشتعال ایک دم اُمڈ آیا۔ ''ہمارے بچوں کی زندگیوں کے فیصلے کرنے والے وہ کون ہوتے ہیں؟''
''یہی تو میں انہیں سمجھانا چاہ رہا تھا' مگر وہ میری ہر بات کا الٹا مطلب نکالتے رہے۔'' ان کی نظریں گوشی کے رنگ بدلتے چہرے پر گویا جم کر رہ گئیں۔ لوہا گرم بھی تھا اور نرم بھی۔ سو مزید چوٹ لگانے کی دیر تھی۔
''میں نے صاف لفظوں میں انہیں بتا دیا کہ گوشی بھی ہماری بیٹی ہے۔ ہم اس کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتے۔ مگر بھائی جی نے رشتہ ختم کر دیا۔''
''ختم کر دیا...... یعنی کہ بات ختم ہو گئی۔'' میراں بیگم کو گویا یقین ہی نہ آیا۔ ''تو اسی لیے آپ مبرم اور گوشی کا رشتہ کرنا چاہتے تھے۔'' ان کی آواز اب بالکل دب کر رہ گئی تھی۔ ان کے صرف ہونٹ ہلے تھے آواز حلق میں ہی گم ہو کر رہ گئی تھی۔
''اگر ایسا ہو جائے تو کچھ غلط بھی نہیں۔ گوشی' اویس کے بجائے اس گھر میں راج کرے گی۔ اچھا ہوا' جو بات ختم ہو گئی خود بخود۔'' وہ خوشگوار سوچوں کے زیر اثر پلنگ پر بیٹھ گئی تھیں۔ اس بات سے بے نیاز کہ گوشی کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا ہے۔
''گوشی کی شادی وہیں ہو گی جہاں اس کی بات طے کر دی ہے۔''
وہ ایک مرتبہ پھر لفظوں سے کھیل رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ مبرم اور گوشی کے نکاح کا دن بھی مقرر کر چکے تھے' مگر بات اور لفظ بدلنا کون سا مشکل ہوتا ہے۔ وہ اس وقت گوشی کے حق میں بات کر کے اس کا پورا تعاون اور ساتھ چاہتے تھے۔ ادھر گوشی کی گویا جان میں جان آئی۔ اس کے سر پر لٹکی تلوار کا رخ بدل گیا تھا۔
''مبرم کو میری کسی بھی بات پر یقین نہیں آئے گا۔ اسے یقین دلانے کے لئے ایک گواہ اور ثبوت کا ہونا ضروری ہے اور میری سچائی کی گواہی بھلا کون دے گا؟'' ان کے چہرے پر پھر سے عمارت کے تڑخ جانے والے آثار نظر آنے لگے تھے۔
''یہ گوشی ہے نا۔ کل یہ آپ کے ساتھ ہی تو شہر سے آئی ہے۔ یہ گواہی دے گی۔'' میراں بیگم نے اس کے کندھوں کے گرد بازو حمائل کر کے بڑے مان سے کہا تھا۔ گوشی کے پیروں کے نیچے کی زمین لحہ بھر کے لیے

تھر تھرا کر رہ گئی۔

''میں ......مگر میں' میں کیسے۔''

''دیکھو بیٹی! تمہیں ہماری عزت کو بچانا ہوگا۔ ورنہ بھائی جی جو کہیں گے' مبرم مانتا چلا جائے گا اور اگر مبرم ہمیں چھوڑ گیا تو ہم خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔'' انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے۔

''مگر' خالو جی! اگر مبرم بھایا آپ کا یقین نہیں کر رہے تو پھر میرا یقین کیسے کریں گے۔'' گوشی گھبرا کر بول اٹھی۔

''تمہارے خالو جی! کون سا جھوٹ بول رہے ہیں۔ تم بھی ان کی بتائی گئی من وعن سچائی اس تک پہنچا دینا۔''

میراں بیگم نے اس کی مشکل آسان کرنے کی کوشش کی تھی' مگر وہ اور بھی اُلجھ گئی۔

''پر' میں نے اپنے کان سے تو نہیں کچھ سنا...... بھایا مجھے جھوٹا کہیں گے۔''

''تمہیں جو کچھ میں کہوں گا' تم وہ ہی کرو گی...... ورنہ میں وہ کچھ کر دوں گا جو کسی کے گمان میں بھی نہیں ہو گا۔'' ان کی دھمکی میں پھنکار نمایاں تھی۔

''چوہدری جی! آپ غصہ نہ کریں۔ گوشی کی بھلا کیا مجال جو آپ کے حکم سے سرتابی کرنے کی کوشش کرے' جو آپ کہیں گے یہ وہ ہی کچھ بولے گی۔'' میراں بیگم کا انداز فیصلہ کن تھا۔ گوشی لمحہ بھر میں گویا پسینہ پسینہ ہو گئی۔ وہ چلے گئے تو گوشی نے روتے ہوئے خالہ سے کہا۔

''میں اتنا بڑا جھوٹ بولوں' مگر کیسے؟ کیا یہ گناہ نہیں ہوگا۔''

''گناہ کیسا......؟'' وہ بھڑک اٹھیں۔ چوہدری صاحب کون سا جھوٹ بول رہے ہیں۔ تم بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی جانا۔''

''مگر خالہ!'' وہ کس کشمکش کے عذاب میں جکڑی جا رہی تھی۔

''کوئی اگر مگر نہیں...... جو کہہ رہے ہیں' کرتی جاؤ۔ جانتی تو ہو' چوہدری صاحب کے غصے کو کچھ ایسا ویسا کر دیا تو تمام عمر روتی رہنا۔''

وہ دل ہی دل میں جیٹھ اور شوہر کے جھگڑے سے بہت خوش تھیں۔ ان کے خیال میں سانپ بھی مر چکا تھا اور لاٹھی بھی بچ گئی تھی۔

✦❃✦

''تم میری ضد میں ہمیشہ الٹ جاتے ہو۔ عاشی سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی' نوید مرزا کی بیٹی سے تمہاری بات طے کر آیا ہوں۔ مبرم! بھائی جی کی بیٹی اب اس گھر میں نہیں آئے گی۔ ایک بات تو طے ہے۔'' وہ باپ بیٹا بیٹھک میں موجود تھے اور ان کی بلند ہوتی آوازیں میراں بیگم کا دل دہلائے دے رہی تھیں۔

''اور میں بھی آپ کو صاف لفظوں میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔''

''تو پھر یہ کہو نا کہ تمہیں اپنے باپ پر یقین نہیں۔ تم یہی سمجھتے ہو کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔ بھائی جی نے مجھے ذلیل کر کے گھر سے نکالا۔ مجھے برا بھلا کہتے رہے۔ حتیٰ کہ شادی کے کارڈ تک میرے سامنے پھاڑ دیئے اور سارے رشتہ داروں کو میرے سامنے فون کر کے شادی روک دینے کی وجہ بتانے لگے۔ ہر کوئی مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں کس کس کو جواب دوں۔''

''اور میں حیران ہوں کہ پاپا جی اس قدر لالچی کیسے ہو گئے ہیں۔'' وہ سچ مچ الجھن کا شکار تھا۔

''ابھی تو میں تم سے بہت ساری باتیں چھپائے ہوئے ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھائی جی سے متنفر ہو جاؤ۔'' انہوں نے مبرم کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر کہا۔

''تاہم تمہیں یقین دلانے کے لیے بتا رہا ہوں۔ بھائی جی نے تمہاری ماں کو گالی دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا میں مبرم کو کیسے اپنی بیٹی دے دوں۔ مجھے تو شک ہے وہ تمہاری اولاد ہے بھی یا نہیں۔ تمہاری بیوی تو گھر سے بھاگ کر آئی تھی اور بھاگی ہوئی عورت پر بھلا کون یقین کرے۔''

مبرم کی رگوں میں دوڑتا خون ایک لحہ کو ایک دم ابلنے لگا۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو گئی تھیں اور پورے وجود میں گویا چنگاریاں سلگنے لگیں۔

''پاپا جی نے میری ماں کو گالی دی۔'' نجانے وہ اپنی سطح سے کس حد تک گر جانا چاہتے تھے۔ ''یقین نہیں آتا تو گوشی کو بلوا کر پوچھ لو۔'' انہوں نے ترپ کا آخری پتہ بھی پھینک دیا۔

''گوشی کو کیسے خبر؟'' اب کہ وہ سچ مچ چونکا۔

''گوشی بیٹی کے سامنے انہوں نے مجھے ذلیل کیا تھا اور میں سر ہی اٹھا نہ پایا۔ ایسی ذلالت سے موت اچھی جب سگی اولاد کو یقین دلانے کے لیے حلف اٹھانا پڑے۔'' وہ ٹوٹے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

اسی دم دروازہ کھول کر میراں بیگم آ گئی تھیں۔ ان کے ساتھ تھر تھر کانپتی گوشی بھی تھی۔

''آؤ بیٹی! ...... ذرا بتاؤ' مبرم کو کون جھوٹا ہے؟ کون سچا ہے؟''

''خالو جی سچ کہہ رہے ہیں مبرم بھایا۔'' گوشی کے سر پر گویا تلوار لٹک رہی تھی اور وہ یہ دو جملے بول کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

''تم ابو کے ساتھ گئی تھیں وہاں۔'' وہ خون آلود نظروں سے گوشی کو گھور رہا تھا۔ گوشی بے چاری کا دل گویا لرز لرز گیا۔

''جی۔'' اس نے سر جھکائے رکھا تھا۔

''مگر میں پھر بھی یقین نہیں کر سکتا۔ میں آپ کی کوئی بات نہیں مان سکتا اور میں وہ ہی کروں گا' جو میرا دل کہے گا۔''

وہ ایک سلگتی نگاہ ان سب پر ڈالتا باہر نکلتا چلا گیا تھا جبکہ عزیز نیازی اس پلان کی ناکامی پر بری طرح تاؤ کھا کر رہ گئے تھے تاہم ہار انہوں نے پھر بھی تسلیم نہیں کی تھی۔

✦❃✦

پاپا دل کے مریض تو تھے ہی۔ بھائی کی طرف سے ملنے والے اس جھٹکے سے سنبھل نہیں پا رہے تھے۔ ویرا انہیں ہسپتال تو لے آئی تھی' مگر اس کے ہاتھ سے امید کا دامن بار بار چھوٹ جاتا تھا۔ ڈاکٹرز نے صاف لفظوں میں ان کی نازک حالت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ کسی بہت بڑے صدمے کا اثر ہے جو ان کا دل اس کیفیت کے اثر سے نکل نہیں پا رہا۔

ویرا کی ساری دعائیں اور ڈاکٹرز کی ساری کوششیں ناکام جا رہی تھیں۔ پاپا کو ہوش نہیں آ رہا تھا اور یہ بے ہوشی ان کے لیے کس قدر خطرناک ہو سکتی تھی' ویرا اس بات سے بہت اچھی طرح آگاہ تھی۔

پچھلے دو دن سے وہ ہسپتال کے کوریڈور میں تنہا اور اکیلی بس دعا کا دامن پکڑے بیٹھی تھی۔

وہ مبرم کے پرسنل نمبر پر اسے فون کر کر کے تھک چکی تھی اور جب یہاں سے مایوس ہو گئی تو اس نے اویس کے گھر میں اطلاع کر دی۔

اس وقت بھی وہ نماز ظہر ادا کر کے پاپا کی صحت یابی کے لیے تسبیح پڑھ رہی تھی جب مبرم اور اویس دونوں ہی سامنے سے آتے نظر آئے۔ ویرا مبرم کو دیکھ کر گویا ضبط کی طنابیں چھوڑ بیٹھی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا کہ چیخ چیخ کر مبرم کو اس کے باپ کی سنگ دلی کا قصہ سنا دے۔

تب ہی ایک نرس نے اطلاع پہنچائی۔

''آپ کے پیشنٹ ہوش میں آ چکے ہیں۔ جلدی آیئے' ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''میرے پاپا!'' ویرا تڑپ کر اٹھی تھی۔ مبرم اور اویس بھی اس کے پیچھے اندر آ گئے تھے۔ پاپا کی طبیعت

واقعی بہت نازک تھی اور ویرا کو روتا دیکھ کر وہ اور بھی گھبرا رہے تھے؟

''میں ٹھیک ہوں میری جان! کیوں پریشان ہوتی ہو۔'' وہ بول نہیں سکتے تھے' مگر بمشکل بولنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ جان چکے تھے کہ ان کے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔

''مبرم! میرے بچے! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔'' وہ گویا چار لفظوں کا بوجھ بھی سہار نہیں پائے تھے۔ ان کی سانسیں بری طرح سے الجھ گئی تھیں۔

''پاپا! پلیز آپ بولیے مت ...... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' مبرم نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا نرم سا دباؤ ڈالا۔

''مبرم! آج تک کبھی نہیں سوچا کہ تم میرے بیٹے نہیں' ہمیشہ یہی لگا کہ میرا سب کچھ تم ہی ہو۔'' ان کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ رہے تھے۔

''پاپا......'' ویرا نے تڑپ کر ان کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر آنسوؤں کو سمیٹا۔ وہ ویرا کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

''میرے بچے! میری ایک بات مان لو۔'' وہ مبرم کے سامنے التجا کر رہے تھے۔

''جی پاپا! بولئے۔'' مبرم ان کے دونوں ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔

''مبرم! میں دنیا سے مطمئن ہو کر جانا چاہتا ہوں بیٹا۔ میری ویرا تنہا ہو گی۔ یہ بات مرنے کے بعد بھی چین نہیں لینے دے گی ...... میں چاہتا ہوں تم ابھی ویرا سے نکاح کر لو۔''

''ابھی ......'' وہ کچھ فکرمند ہو گیا تھا۔

''پاپا! آپ ٹھیک ہو جایئے ابھی تو۔'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا جب انہوں نے اسے روک دیا۔

''وقت بہت کم ہے بیٹا!''

''مگر پاپا! یہاں کیسے؟'' وہ کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ اویس نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ۔

''سب ہو جائے گا۔ تم انکل کو تسلی دو۔ میں کچھ انتظامات کرتا ہوں۔''

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پاپا!'' ویرا کو بالآخر بولنا پڑا۔ وہ ابھی تک گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔

''یہ طبیعت اب نہیں ٹھیک ہونے والی۔'' نجانے کیوں وہ اس قدر مایوس تھے۔

''اللہ بہتر کرے گا انکل! آپ مطمئن رہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں۔'' اویس سے ان کی حالت دیکھی نہیں گئی تھی۔ تب ہی تو وہ مبرم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''مگر اویس!'' وہ اسے روکنا چاہ رہا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

وہ بہت بے چین تھے۔ ان کی بے چینی' اصرار اور گھبراہٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر ویرا ڈاکٹر کو بلا لائی تھی۔

مگر پاپا ایک ہی لفظ کی تکرار کیے جا رہے تھے۔
"مجھے گھر لے چلو۔"
"آپ ان کی بات مان لیں۔" ڈاکٹر پاپا کا مکمل چیک اپ کرنے کے بعد بولا۔ ویرا ڈاکٹر کی بات سن کر پریشان ہو اٹھی۔
"مگر ڈاکٹر! ان کی کنڈیشن ٹھیک نہیں۔"
"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔" ڈاکٹر کچھ مبہم سے انداز میں بولا۔ "ابھی آپ کے ساتھ ایک نرس جائے گی۔ اگر ضرورت پیش آئی تو انہیں ہسپتال لے آیئے گا۔"
پاپا کی ضد' اصرار اور التجاؤں کے پیش نظر وہ انہیں گھر لے آئے تھے۔ ایک ڈاکٹر اور نرس ساتھ آئے تھے۔
ساری مشینوں کو وہ اچھی طرح سے سیٹ کر کے ہی گئے تھے۔ پاپا کی طبیعت گھر آنے کے بعد پہلے سے کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ وہ ہسپتال کے کمرے' بیڈ اور اردگرد کے ماحول سے گھبرا گئے تھے۔ سو اس وقت وہ حیرت انگیز طور پر بہتر نظر آ رہے تھے اور ویرا اور مبرم کے نکاح میں شرکت کے لیے فرداً فرداً اپنے سارے دوستوں کو فون کر کے بلوا رہے تھے۔ اویس نے بہت تھوڑے وقت میں مناسب انتظام کر لیا تھا۔
نکاح کے بعد جب مہمان رخصت ہوئے تو وہ انہیں دعائیں دے کر اپنے کمرے میں گئے تھے۔ ایک میل نرس کو ان کے ساتھ ہی کمرے میں رہنا تھا۔
اس وقت وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ اویس اپنے امی' ابو کو گھر چھوڑنے کے لیے گیا تھا۔ ویرا کو اردگرد بکھرے پھیلاوے سے سخت وحشت ہو رہی تھی۔ گلاس' پلیٹیں' چمچے سب میز پر بکھرے پڑے تھے۔ اویس مہمانوں کے لیے ہوٹل سے کھانا لایا تھا۔
سب سے پہلے اس نے صفائی ستھرائی کے لیے کمر کس لی تھی۔ لاؤنج اور ہال اچھی طرح سے صاف کرنے کے بعد اس نے ساری بکھری چیزیں ٹھکانے پر رکھیں۔ پھر کچن میں آ گئی۔ مبرم شاید پاپا کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کافی دیر گزرنے کے بعد مبرم بھی کچن میں آ گیا۔
"کچھ ہیلپ کروا دوں؟" نکاح کے بعد مبرم کے رویئے' لہجے اور انداز میں محسوس کی جانے والی تبدیلی در آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی تھی اور اس کے لبوں پر مسکان سج گئی تھی۔
"کیا ہیلپ کروانا چاہتے ہو؟" ویرا نے بغیر مڑے پوچھا۔ وہ سنک میں برتن جمع کیے دھونے میں مصروف تھی۔
"کچھ بھی......" وہ اس کے بالکل پیچھے آ کھڑا ہوا۔
اس کی گرم سانسیں اس کے گالوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ ویرا کے بہت قریب کھڑا تھا۔ یوں کہ اگر وہ ذرا

سا پلٹ کر اسے دیکھتی تو مبرم سے لگا جاتی۔
''مبرم!'' عجیب سی شرم نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔
''ہوں ......'' وہ اس کے رخسار پر جھک کر دھیرے سے بولا۔ ''کیا ہے؟''
''تم یہاں کیا کر رہے ہو اپنے کمرے میں جاؤ؟''
''اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔'' مبرم ایک سُرور بھری کیفیت میں بول رہا تھا۔ ایک عجیب سا نشہ اس پر طاری تھا۔ ویرا کے چہرے پر حیا کی لالی بکھر گئی۔
''کون سی محبت؟'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔
''وہ ہی جو تم پچھلے دو سال سے طعنوں میں لپیٹ لپیٹ کر مار رہے تھے۔''
''وہ محبت ہی تو تھی۔'' اس نے ایک بھرپور سی شرارت کر دی۔ ''تم میرے دل میں چھپی محبت کو جانتی کہاں ہو۔''
''تم نے کبھی دو گھڑی ٹھہر کر سنا بھی تو نہیں۔'' اس کے پاس بھی شکوے بے شمار تھے۔ ''ہر وقت استانی بنی رہتی تھیں۔ پڑھانے کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا تمہیں۔''
''میری محنتوں کی بدولت' تم پوزیشن ہولڈر بنے ہو۔ ورنہ تو ہر دفعہ گول انڈا ہی پرائز میں ملتا تھا تمہیں۔''
''اپنی ان محنتوں کا سلسلہ چاہو گی؟'' وہ ذرا سا اور جھک کر پوچھ رہا تھا۔ ٹونٹی کھلی تھی اور ویرا کے ہاتھ جھاگ سے بھرے تھے۔
''کیا دینا چاہتے ہو؟'' اس نے جھاگ کو دونوں ہاتھوں سے مسلا اور پھر ہاتھ ٹونٹی کے نیچے کر دیئے۔
''جو تم مانگو۔''
''بغیر مانگے کیا دو گے؟'' وہ ہتھیلی پھیلائے کھڑی تھی۔
''صرف محبت۔'' وہ اس کی سماعتوں میں امرت اتار رہا تھا۔
''اور مجھے صرف محبت ہی چاہیے۔ چلو پھر ایک معاہدہ کرو۔''
''بھلا کیا معاہدہ؟'' مبرم نے اس کا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔
''محبت سے کبھی بدگمان نہیں ہو گے۔''
''منظور ہے۔'' مبرم نے اپنا سر ہولے سے اس کے سر سے ٹکرایا۔ ''ویسے تم جانتی تو ہو۔ بدگمان میں صرف ایک بندے کے علاوہ کسی اور سے نہیں ہوتا۔'' اس کا اشارہ اپنے باپ کی طرف تھا۔
''مجھے کچھ بتانا ہے تمہیں۔'' ویرا کو ایک دم بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ پاپا کی صحت بگڑنے کی سب سے بڑی اور تکلیف دہ وجہ وہ اسے چاچو کے رویے کے اجنبی پن کے بارے میں تفصیل سے بتانا چاہتی تھی۔
''آج صرف میری سن لو۔'' وہ گویا التجا کر رہا تھا۔

''چلو سناؤ۔'' ویرا نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کیا۔

''پتا ہے ایک لڑکا تھا بہت اکھڑا اکھڑ سا...... انا اس کی ناک پر دھری رہتی تھی۔ انکار سننا اسے گوارا نہیں تھا اور محبت کرنے کا اسے سلیقہ نہیں آتا تھا۔

بس ایک شام وہ اپنے باپ کے ساتھ شہر چلا آیا۔ اس اکھڑ اکھڑ لڑکے کو ایسی ٹھوکر لگی کہ ابھی تک زخم تازہ ہے۔ جانتی ہو ویرا! پہلی محبت ایک زخم کی طرح ہوتی ہے۔ یہ ایسا زخم ہوتا ہے جو نہ سلتا ہے نہ مٹتا ہے۔

اس لڑکے کو بھی محبت ہو گئی تھی۔ بڑی ہی نامناسب سی عمر میں اور جب اس نے اپنے باپ سے اظہار کر دیا تو اس لڑکے کا باپ غصہ سے بھڑک اٹھا اور پھر ہاتھ میں ہنٹر پکڑے اسے مارتا رہا۔ مارتا رہا یہاں تک کہ اس لڑکے کو محبت کی اس حماقت پر غصہ آ گیا اور اس غصہ نے اس کو ضد دلا دی۔ اس لڑکے نے خود سے قسم کھائی کہ وہ اس لڑکی کو کبھی نہیں اپنائے گا اور پھر بار ہا وہ اپنی محبت کو جھٹلاتا رہا تھا' مگر جیت آخر کس کی ہوئی؟'' وہ ویرا کی روشن آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''محبت کی۔'' ویرا گویا سرتاپا آسودگی کی لہر میں نہا گئی۔

''کیا مجھے اپنے گزشتہ رویے کے لیے سوری کرنا پڑے گا؟'' اب وہ بلا کی معصومیت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا پوچھ رہا تھا۔

''سوری بھلا کیسے کرو گے؟'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''ایسے۔'' مبرم نے اس کے رخسار پر مہر محبت ثبت کی۔ ''اور پھر ایسے' اور ہمیشہ ہی ایسے۔'' وہ تو رفتار ہی پکڑ چکا تھا۔ ویرا شرم سے جھنجھنا اٹھی۔

''بس کرو نا۔'' وہ اسے دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکیل رہی تھی۔

''جانتی ہوں میں اس لڑکے کی ساری کہانی کو ضد' انا اور ہٹ دھرمی کے باعث اپنا نقصان کرنے سے بھی باز نہیں آیا۔ ویسے ایک بات تو ٹھیک ہوئی چاچو جی اگر رشتہ ختم کر کے نہ جاتے تو تم نے کہاں آج میرے ہاتھ آنا تھا۔'' اس کا انداز بھرپور شرارت لیے ہوئے تھا۔

''تو کیا ابو رشتہ ختم کر کے یہاں سے گئے تھے؟'' مبرم کچھ چونک گیا۔

''یہی بات تو بتانا چاہ رہی تھی' مگر تم سنتے کہاں ہو۔'' ویرا نے ناراضی سے کہا تھا' پھر من وعن تمام قصہ سنا دیا۔ مبرم خاموشی سے سنتا رہا تھا' پھر جب بات ختم ہو گی تو وہ دھیرے سے بولا تھا۔

''کیا تم میری خاطر ابو کو معاف کر سکتی ہو۔''

''ان کی وجہ سے پاپا کا دل دکھا ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ چاچو جی نے لالچ کی انتہا کر دی۔ کوئی اس طرح بھی کرتا ہے۔'' ویرا کی پلکیں نم ہو گئیں۔

''ابو نے جو کیا' غلط کیا۔ میں مانتا ہوں مگر وہ پھر بھی ہمارے بڑے ہیں۔ ہمیں ان کے بارے میں ایسے

سخت الفاظ نہیں بولنے چاہئیں۔'' حالانکہ ابو نے اسے پاپا اور ویرا سے متنفر کرنے کے لیے بہت سے جھوٹ سنائے تھے' مگر وہ پھر بھی ابو کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں سن سکتا تھا۔

''اور وہ تو جیسے تمہارے اس گناہ کو معاف کر دیں گے۔'' ویرا نے سچ ہی تو کہا تھا۔

''کرنا تو پڑے گا۔ آفٹر آل میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ویسے جس طرح جانوروں سے بھی بدتر میرے ساتھ ابو رویہ رکھے ہوئے ہیں۔ لگتا تو نہیں' میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔'' اس کے انداز میں بھرپور شرارت تھی۔

''شاید اس لیے کہ تم بگڑ نہ جاؤ۔ لاڈوں اور نخروں میں تمہارا ستیاناس نہ ہو جائے۔ ویسے نخرے باز تو تم اب بھی بہت ہو۔''

''ظاہر ہے' نخرے اٹھانے والے بھی تو بہت ہیں۔'' وہ ایک دفعہ پھر اسے بازوؤں کے حصار میں لے چکا تھا۔

''مجھ سے ایسی امید مت رکھنا۔'' اس کا انداز وارننگ دینے والا تھا۔

''نخرے ہی تو اٹھاتی ہو تم' ورنہ کب کا میں کسی ہاسٹل میں جا چکا ہوتا۔ تمہارے لاڈ اٹھانے کے انداز مجھے بہت بھاتے ہیں۔'' وہ اس کے بالوں سے اٹھتی بھینی بھینی مہلک نتھنوں کے راستے محسوس کر رہا تھا۔ دل میں اتار رہا تھا۔

''کچھ کام کرنے دو گے کیا؟'' اس کے لاڈ کچھ طویل ہو رہے تھے۔ تب ہی ویرا کو گزرتے وقت کا احساس ہونے لگا۔

''نہیں۔'' مبرم نے جھک کر گستاخی کی۔

''پیچھے ہٹو۔'' وہ چیخی۔

''اب پیچھے ہٹنا مشکل ہے۔'' مبرم نے ڈائیلاگ جھاڑا۔

''میں دھکا بھی دے سکتی ہوں۔'' وہ اپنے تئیں اسے دھمکا رہی تھی۔

''آج ہماری شب عروسی ہے اور تم برتن مانجھ رہی ہو۔''

''یہ انوکھی شب عروسی ہے اس لیے۔'' وہ پھر سے برتن دھونے لگی۔ مبرم دل مسوس کر رہ گیا تھا۔

''یہ نہ تھی ہماری قسمت۔'' وہ ٹیبل بجا بجا کر اس کا ناک میں دم کیے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ویرا نے تمام برتن سنک میں جھونکے اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی تھی اور مبرم کے دل کی مراد بر آئی۔

✦❋✦

''کیا ہمیں ہنی مون پر جانا چاہیے؟'' وہ بیڈ پر اس کے برابر لیٹا ہوا پوچھ رہا تھا۔ ویرا کسی کتاب کے مطالعے میں گم تھی۔ رات کو کچھ نہ کچھ پڑھ کر سونا اس کی عادت میں شامل تھا۔

''یہ اتنی موٹی کتاب کیسے پڑھ لیتی ہو؟'' وہ فی الفور موضوع سے ہٹ کر کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''جیسے تم ٹی وی دیکھ لیتے ہو۔''

''اچھا' اسے اب بند کرو۔ میں تم سے کچھ بات کر رہا ہوں۔''

''صرف چند ایک صفحات رہ گئے ہیں۔ اگر درمیان میں چھوڑ دیا تو مزا کرکرا ہو جائے گا۔'' اس نے التجائیہ کہا تھا۔

''ان کتابوں کو چاٹنے سے بھلا کیا فائدہ؟'' وہ ہر صورت اس کے ہاتھ سے کتاب رکھوانا چاہتا تھا۔

''یہ ایک سفرنامہ ہے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے نجانے کس کس ملک کی سیر ہو جاتی ہے۔'' ویرا نے اسے کتاب پڑھنے کے فوائد بتانے چاہے۔

''گھر بیٹھ کر سیر کرنے سے کیا حاصل چلو کہیں تفریح کے لیے چلتے ہیں۔'' مبرم سنجیدہ تھا۔

''پاپا کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔'' ویرا بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''ہم کون سا پیرس جا رہے ہیں۔ اپنے ملک کی تو بات ہے۔ نادرن' ایریاز سے ہو کر آ جائیں گے۔''

''مگر گھر سے تو دور رہیں گے نا۔ کم از کم ہفتہ بھر تو لگ جائے گا۔'' ویرا کا انداز پرسوچ قسم کا تھا۔

''میں پاپا سے بات کروں؟''

''کس قدر بے چینی ہے' تمہیں لور لور پھرنے کی۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے جاب لگے ہوئے اور محترم چھٹی کی پلاننگ بنا رہے ہیں۔'' ویرا نے اسے بری طرح ڈپٹا۔

''جاب کون سی ڈپٹی کمشنر کی ہے۔ اس فضول سی سیٹ کے لیے میں ہنی مون کی قربانی نہیں دے سکتا۔''

''کفران نعمت نہیں کرتے۔ کبھی اس سے اچھی جاب بھی مل جائے گی۔ تم اگر مقابلے کا امتحان پاس کر لو گے تو۔'' ویرا نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''تو پھر پروگرام ڈن سمجھوں؟''

''بالکل نہیں۔'' اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

''پلیز ویرا صرف تین دن کی تو بات ہے۔'' وہ ہفتے بھر سے تین دن پر آ گیا تھا۔

''تین دن بھی گھر سے باہر رہنا مشکل ہے۔ میں پاپا کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔''

پاپا کو اس حالت میں تنہا چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

''تم بھی نا...... بس دل توڑتی رہا کرو۔ میں تم سے خفا ہوں۔'' مبرم برا مان گیا۔

''میں تمہیں منا لوں گی۔''

''تو پھر مناؤ۔'' وہ مزے سے بولا۔

''صبح دیکھا جائے گا۔'' اس نے جان بوجھ کر سستی دکھائی۔ مبرم نے اس کا بازو کھینچ کر سیدھا کیا۔ ''ابھی مناؤ۔''

''ابھی موڈ نہیں۔'' وہ اسے تپا رہی تھی تاکہ وہ رات بھر روٹھا ہی رہے۔ ایسا ہونا اگرچہ ناممکن تھا۔

''اور میں ناراض بھی نہیں۔'' مبرم بھی اس کی ہر نبض سے واقف تھا۔

''اور تم کم از کم رات کے وقت استانی مت بنا کرو۔'' مبرم نے بھی ناک چڑھا کر ڈپٹا۔ ''اب اس رقیب کو ایک طرف رکھ دو۔'' وہ عاجزی سے گویا ہوا اور ساتھ ہی ویرا کے ہاتھ سے کتاب جھپٹ لی تھی۔

''تھوڑی دیر کے لیے دے دو پلیز۔''

''ہرگز بھی نہیں۔ چلو اب سوتے ہیں۔''

''مگر......''

وہ اس کے کان میں سرگوشیانہ کچھ بولا تھا اور پھر خود ہی بتی بھی بجھا دی۔

✦❋✦

''کیا بات ہے بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' پاپا نے کوئی تیسری مرتبہ یہی سوال دہرایا تھا۔ وہ بھلا پاپا کو اس بات کا کیا جواب دیتی۔ اس کی طبیعت تو ٹھیک تھی' مگر دل ٹھیک نہیں تھا۔ بے حد گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ مبرم صبح اس سے خفا ہو کر دفتر گیا تھا اور مبرم کی خفگی کا خیال اسے سخت بے چینی میں مبتلا کر چکا تھا۔ پورا دن اس سے کوئی کام ٹھیک سے نہیں ہوا اور جب مبرم کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تو اس کا ضبط بھی جواب دے گیا تھا۔ اس نے چپکے سے موبائل اٹھایا اور باہر برآمدے کی سیڑھیوں پر آ کے بیٹھ گئی۔

''کہاں ہو؟'' ویرا نے مبرم کے نمبر پر میسج سینڈ کیا تھا۔

''تمہارے دل میں۔'' اس کا جواب فوراً آیا تھا۔ جناب بھی شاید سیل ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔

''دل میں تو ہو...... اور یہاں سے کہیں اور جانے بھی نہیں دوں گی۔ اس وقت بتاؤ کہاں ہو؟ گھر کیوں نہیں آئے؟''

''ابھی ایک گھنٹہ آف میں باقی ہے۔'' مبرم نے گویا جتا دیا تھا۔

''مگر تم تو دو گھنٹے پہلے ہی آ جاتے ہو۔''

''آج بدنصیبی سے میرا گھونچو باس بھی گھر نہیں جا رہا۔ لگتا ہے' بیوی سے ناراض ہو کر آیا ہے۔'' ایک اور میسج فوراً ہی آیا۔

''اور تم بھی تو ناراض ہو کر گئے ہو بیوی سے۔'' ویرا مطلب کی بات پر آ گئی۔

''میں اپنی بیوی سے ناراض نہیں ہو سکتا۔''

''اچھا۔'' ویرا گویا کھل اٹھی۔ ''بھلا کیوں؟'' اس نے فوراً میسج لکھا۔

''بیوی ناراض ہو تو فریج کو لاک لگا دیتی ہے۔ ناشتے میں صرف لسی ملتی ہے اور ڈنر میں ابلے چاول اور

دال ایسی صورت حال میں بھلا بیوی سے ناراض ہوا جا سکتا ہے' جبکہ آپ کا والٹ بھی خالی ہو۔'' مبرم نے اسے سرتاپا جلا کر رکھ دیا۔

''بہت کمینے ہو تم۔''

اس نے دانت پیس کر کہا۔

''وہ تو میں ہوں۔''

وہ کہاں چوکتا تھا۔

''اللہ کرے آج تمہارا باس گھر ہی نہ جائے اور نہ ہی تم لوگوں کو جانے دے۔ دفتر میں بیٹھے سڑتے رہنا۔'' وہ بددعاؤں پر اتر آئی تھی۔ پھر تڑپ کر پوچھنے لگی۔

''بتاؤ نا گھر کب آؤ گے؟'' اس کی نظریں کلاک پر تھیں۔

''دال چاول کھلاؤ گی۔ پھر تو نہیں آؤں گا۔''

''اس ڈش کے علاوہ بہت کچھ ہے۔''

''تو پھر میں اڑتے ہوئے آیا۔'' اس کا ایک اور میسج آیا۔

''آرام سے انسانوں کی طرح آنا...... اڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کر کیا رہے تھے؟'' جواب میں دیر نہیں ہو رہی تھی۔ اسی حساب سے اس نے پوچھا تھا۔

''دعا کر رہا تھا۔ یہ باس گھونچو جلدی اٹھے تاکہ میں بھی دوڑ لگا دوں۔''

''موبائل ہاتھ میں پکڑ کر کیا کر رہے تھے؟''

ایک اور سوال۔

''گھر آ کر بتاؤں گا۔''

''مگر ابھی کیوں نہیں۔'' وہ شکی ہوئی۔

''تمہیں کال کرنے لگا تھا۔''

''کیا سچ۔'' وہ بے ساختہ خوش ہو گئی۔

''تم روٹھا نہ کرو' مجھے منانا نہیں آتا۔''

''تمہیں منانا نہیں آتا اور مجھے روٹھنا بھی نہیں آتا۔'' اس دفعہ میسج نہیں آیا تھا' بلکہ وہ خود دبے پاؤں گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا اور عین اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ویرا نے موبائل سکرین سے نظر ہٹا کر دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

اور جب فریش ہو کر واپس آیا تو ویرا کھانا لگا چکی تھی۔ اپنی پسند کا مینیو دیکھ کر مبرم کا دل خوش ہو گیا۔

''پاپا کہاں ہیں؟''

وہ پوچھ رہا تھا۔
''ڈرائنگ روم میں...... وکیل انکل آئے ہیں۔''
''او...... تو کیا انہوں نے کھانا کھا لیا ہے؟''
''وکیل انکل بغیر کھانا کھائے اتنی دیر بیٹھ سکتے ہیں۔''
ویرا اس کی پلیٹ میں سالن نکال رہی تھی۔
''ویسے ایک بات میں اکثر سوچتی ہوں مبرم!'' ویرا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔
''ایسی کیا بات ہے؟''
مبرم بھی چونکا۔
''بات کچھ یوں ہے کہ کبھی کبھی چاچو جی کے تلخ ترین رویے کے باوجود بھی ان پر کچھ ٹوٹ کے پیار آ جاتا ہے اور دل چاہتا ہے' ان کی ساری کڑوی کسیلی باتوں کو بھول جاؤں۔'' وہ فروٹ سلاد کھاتے ہوئے مزے سے بولی۔
''اچھا......'' وہ حیران ہوا۔
''ایسا کون سا کارنامہ چاچو جی نے سرانجام دیا ہے؟''
''میرا اور تمہارا رشتہ توڑ کر انہوں نے بہت اچھا کیا۔ ان ہی کی ضد میں تو آج تم میرے فرماں بردار شوہر بنے ہو۔ ورنہ دھمکیاں دے دے کر میرا ناک میں دم کر دیتے تھے کہ کسی طریقے سے میں خود ہی پاپا کے سامنے انکار کر دوں۔''
''اور تم نے کون سا میری بات مانی تھی۔''
مبرم بھی کچھ گزری باتوں کو سوچ کر مسکرا دیا۔
''اور اگر میں بھی ضد میں آ جاتی؟''
''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا' جو محبت کرتے ہیں وہ انا کی دیواریں نہیں اٹھاتے۔''
''تو پھر تم کیوں اٹھا لیتے ہو' محبت میں انا اور ضد کی دیوار کو؟''
''کیونکہ ضد دلانے والے ذہن کو منتشر کر دیتے ہیں۔'' وہ خالی گلاس کی طرف اشارہ کر رہا تھا تاکہ ویرا گلاس میں پانی ڈال دے۔
''تم نے چاچا جی سے ابھی تک ناراضی ختم نہیں کی۔ حالانکہ وہ والی بات تو خاصی پرانی ہو گئی ہے۔'' ویرا فریج میں ٹھنڈی بوتل نکال لائی۔
''میں ان سے ناراضی ختم نہیں کر سکتا۔ انہوں نے ہمیشہ میرے ہر شوق اور تمنا کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کی ہے۔ مجھے فوج میں کمیشن مل سکتا تھا' مگر ان کی ہٹ دھرمی کے باعث میرا خواب ٹوٹ گیا اور اگر وہ لالچ

میں آ کر میرا اور تمہارا رشتہ ختم نہ کرتے، تمہیں ہی بہو بنانے پر بضد رہتے تو اللہ کی قسم میں نے ان کی ضد کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنی محبت کو قربان کر دینا تھا۔'' اس کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

''جہاں تک بھی بھاگتے ...... آنا تو ہماری طرف ہی تھا نا...... تمہارے ہر راستے، ہر موڑ پر ویرا نیازی ہی تو کھڑی تھی۔''

''اس میں تو شک نہیں۔''

مبرم نے تسلیم کر لیا۔ اسی پل وکیل انکل اور پاپا بھی آ گئے تھے۔ ویرا ان کے لئے چائے بنانے اٹھ گئی تھی جبکہ مبرم، اویس سے ملاقات کرنے کے لیے چلا گیا تھا۔ دن میں ایک دفعہ یہ دونوں اگر ایک دوسرے سے نہ ملتے تو رات گزارنا ان کے لیے حد درجہ مشکل تھا۔ پھر موبائل چیٹ شروع ہو جاتی تھی جو ویرا کو سخت ناپسند تھی۔

اگلے بہت سارے دن ویرا کے مصروفیت میں گزر گئے تھے۔ کالج سے تو اس نے ریزائن کر دیا تھا۔ تاہم پاپا کی تیمارداری میں اور ان کی عیادت کے سلسلے میں آنے والے مہمانوں کی وجہ سے بہت سے کام جمع ہو گئے تھے۔ خصوصاً کپڑوں کا ایک ڈھیر اکٹھا ہو چکا تھا۔ اوپر سے مبرم دھلے ہوئے کپڑوں کا بھی ایک ڈھیر اٹھا لایا۔

''ویرا! ان کپڑوں کو کلف کیوں نہیں لگائی۔''

''مجھ سے نہیں کلف لگائی جاتی۔ پھر کپڑوں کی استری مشکل ہو جاتی ہے۔'' وہ مشین میں پائپ لگا کر پانی ڈال رہی تھی۔

''میں کلف لگے کپڑے پہننا پسند کرتا ہوں۔ یہ ایسے چرمرے سے مجھے نہیں پسند۔''

''گاؤں لے جاؤ گوشی سے کلف لگوا لینا۔'' وہ صاف صاف کپڑے اٹھا کر مشین میں ڈالنے لگی۔

''پلیز ویرا جی! کر دیں نا۔'' اب وہ منتوں پر اتر آیا۔ اس کے مزاج کی تبدیلیاں ویرا کو اکثر حیران کر دیتی تھیں۔ کہاں تو وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ ذرا سا کوئی اس کی بات سے اختلاف کر دیتا تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتا تھا اور اب اپنے چھوٹے سے ذاتی کام کے لیے کیسے چہرے پر مسکینیت طاری کر رکھی تھی۔

''مبرم! دیکھ نہیں رہے میں کام کر رہی ہوں اور تم یہ گٹھڑا اٹھا کر لے آئے ہو۔''

''میں ابھی کیا پہنوں گا؟''

''تم نے کسی کا ولیمہ اٹینڈ کرنا ہے۔ رکھ دو' استری سٹینڈ کے اوپر اس کام سے فارغ ہو لوں' کر دوں گی۔'' ویرا نے کلس کر کہا تھا۔

''او تھینک یو ویری مچ' میری جان!'' وہ فرط مسرت سے آگے بڑھا۔

''پلیز مبرم! کام کرنے دو مجھے۔ سوا نیزے پر سورج پہنچ رہا ہے۔'' ویرا اس کی بڑھتی پیش قدمی کو دیکھ کر بھنا کر بولی۔

''میرے رومانٹک موڈ کا ستیاناس مار دیا کرو۔'' وہ دل مسوس کر رہ گیا۔

''ہونہہ' میں تو بھر آئی تمہارے اس رومانٹک موڈ سے جو کہ دن دیکھتا ہے نہ رات۔'' ویرا نے تپ کر کہا۔

''میں کالج جا رہا ہوں' ذرا آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے۔ تمہاری سڑی ہوئی صورت دیکھ کر آنکھوں میں ریت چبھنے لگی ہے۔'' وہ بھی حساب برابر کرتا اسے جان بوجھ کر چڑاتا' کپڑوں کا ڈھیر پھلانگ کر سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ ویرا اسے پکارتی ہی رہ گئی تھی۔

✦❋✦

اس دن گرمی میں بہت ہی شدت تھی۔ ویرا صبح صبح پاپا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھی۔ تب مبرم سو رہا تھا۔ سو ویرا نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ جب وہ پاپا کا چیک اپ کروا کر واپس آئی تو پورچ میں کھڑی چاچو جی کی گاڑی دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''کون آ سکتا ہے؟'' اتنا تو اسے یقین تھا کہ چاچو جی کم از کم اب یہاں نہیں آ سکتے' مگر لاؤنج میں آ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ سامنے صوفے پر چاچو اور چاچی بیٹھے تھے۔ بہت رنجیدہ بھی اور شرمندہ بھی۔

''مجھے معاف کر دیں بھائی جی! میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ میں غلط تھا۔ کس قدر سطحی اور نیچ حرکت کی ہے میں نے۔ خود سے بھی نظر نہیں ملا سکتا۔ مجھے معاف کر دیں بھائی جی! میرے ضمیر پر بڑا بوجھ دھرا ہے۔ کسی پل چین نہیں آتا۔ میں مر جاؤں گا بھائی جی! مجھے اگر آپ نے اور میری بیٹی نے معاف نہ کیا تو۔'' وہ بری طرح سے سسک رہے تھے۔ میراں چاچی بھی روئے جا رہی تھی۔ ویرا کا دل بھی پسیج گیا تھا۔

''پلیز چاچو جی! بس کریں پاپا کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

''بھائی جی! معاف کر دیں نا...... پھر ہی میرے دل کو چین آئے گا۔'' انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''بس کر عزیز!'' پاپا کب تک کٹھور بنے رہتے۔ بالآخر وہ بھی اپنی اور اپنی بیٹی کی توہین اور کی جانے والی بے عزتی کو بھول گئے تھے۔ بھائی کو نہ صرف معاف کیا بلکہ صاف دل کے ساتھ گلے بھی لگا لیا تھا۔ ویرا کی آنکھیں اس ملاپ پر نم ہو گئی تھیں۔

''کہاں ہے ہمارا نافرمان بیٹا۔'' چاچو مبرم کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ویرا انہیں کولڈ ڈرنکس سرو کر کے مبرم کو جگانے کی غرض سے کمرے میں آ گئی تھی۔

اس کی توقع کے عین مطابق مبرم ابھی سو رہا تھا۔ لائٹس آف تھیں اور گلاس ونڈوز کو بھاری پردے نے چھپا رکھا تھا۔ ویرا نے کھٹا کھٹ لائٹس آن کر کے پردہ سمیٹنے کے بعد مبرم کا انگوٹھا ہلایا۔ ساتھ ہی اے سی کا ریموٹ پکڑ کر آف کا بٹن بھی دبا دیا تھا۔

''مبرم!'' وہ ایک دفعہ پھر اسے ہلا رہی تھی۔

''اٹھ جاؤ مبرم! باہر دیکھو کون آیا ہے؟''

''تم خود دیکھ لو۔ اب میں نیند سے اٹھ کر باہر دیکھنے جاؤں' کوئی فقیر ہو گا۔ بیل آف کر دیا کرو۔'' مبرم نے سوئی سوئی آواز میں بیزاری سے کہا۔

''پلیز مبرم!'' وہ زچ ہو اٹھی۔ ''میرا مطلب ہے تم ایک دفعہ اٹھو تو سہی۔'' ویرا نے اس کے بال کھینچ کر غصے سے کہا۔

''صبح صبح تشدد پر اتر آیا کرو بس۔'' مبرم چیخ کر بولا۔

''نجانے کون آ گیا ہے' عذاب بن کر۔''

''فضول مت بولو۔ تمہارے اپنے ہیں۔'' وہ بے اختیار اسے ٹوک گئی۔

''کون؟ کیا اویس آیا ہے؟'' مبرم نے چونک کر پوچھا۔

''خود جا کر دیکھو۔'' وہ بھی ہوا نہیں لگنے دے رہی تھی کہ کون آیا ہے۔

''میں نہیں جا رہا۔'' اس نے بھرپور قسم کی انگڑائی لی۔ ''جس نے مجھ سے ملنا ہے خود آ کر ملے۔'' انداز میں کافی شاہانہ پن تھا۔ ویرا تپ کر رہ گئی۔

''تم نہ جانے کس پر چلے گئے ہو۔ ہمارے خاندان میں تو تمہارے جیسا کوئی نہیں تھا۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ یقیناً چاچو جی نے تمہیں ایڈاپٹ کیا ہوگا۔''

''بالکل' بجا فرمایا آپ نے۔'' مبرم کہاں چوکتا تھا۔

''اب اٹھ بھی چکو' باہر چاچی اور چاچو۔'' ویرا کے لبوں میں بات رہ گئی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی اور پھر چاچی اندر آ گئیں۔ مبرم ماں کو دیکھ کر اچھل کر اٹھ پڑا۔

''اماں! میری پیاری اماں۔'' وہ بے ساختہ بچوں کی طرح ان سے لپٹ گیا۔

''چل ہٹ پرے...... بڑا ماں کا خیال آتا ہے تجھے۔ یہ نہیں کہ بوڑھی ماں کو اپنا چہرہ دکھا دے۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اور میرے دل کو کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر آ گئی ہوں۔'' چاچی نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کئی دفعہ چوما۔

''اماں! آئی رئیلی مس یو...... سچ کہہ رہا ہوں اماں! میں نے بھی آپ کو بہت مس کیا۔''

''مس کرتے تو ملنے آ جاتے۔'' اب وہ ویرا کو پیار کر رہی تھیں۔ ''کیا کیا نہ سوچا تھا' خیر جیسے اللہ کی مرضی۔''

وہ جلد ہی راضی بہ رضا ہو جانے والوں میں تھیں۔ کچھ دیر کڑھنے کے بعد مطلع خودبخود صاف ہو جاتا تھا۔

''اماں! آپ کے ارمان تو دل میں ہی رہ گئے ہیں۔'' وہ قدرے افسوس سے بولا۔

''ارمان تو پورے ہو گئے نا۔ ہم اسی میں خوش ہیں۔'' انہوں نے پھر سے اس کے سر کو چوما۔

''آپ کے شوہر کا ارادہ تو نہیں تھا۔ یہ تو میں نے زبردستی پورے کروائے ہیں۔ ویسے اماں! کبھی کبھی مجھے اپنے ابو جانی نجانے کیوں سوتیلے سوتیلے لگتے ہیں۔'' وہ مذاق کر رہا تھا۔ میراں بیگم کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

''اول فول نہیں بولتے پتر!'' وہ منہ پر آیا نادیدہ پسینہ پونچھ کر بولیں۔ ادھر مبرم خوامخواہ ویرا پر چڑھ

دوڑا۔

''میری اماں کو دیکھ کر اے سی بند کر دیا۔ بن گئیں نا فوراً ظالم بہو۔''

''توبہ ہے مبرم! اے سی تو میں نے اسی لیے بند کیا تھا تاکہ تم اٹھ جاؤ۔'' وہ جھینپ کر اے سی آن کرنے لگی۔ ابھی وہ دوبارہ چاچی کے پاس بیٹھنے لگی تھی جب مبرم نے پھر سے اسے اٹھا دیا۔

''میری اماں آئی ہیں۔ کچھ خاطر تواضع تو کرو۔ پھر سے اے سی کی ہوا لینے بیٹھ گئی ہو۔''

''مبرم!'' وہ اسے آنکھیں دکھا کر رہ گئی۔ ''کچھ دیر تو بیٹھنے دو چاچی کے پاس ...... ویسے بھی سب تیار ہے۔''

''اٹھ بھی جاؤ کچھ لے آؤ کیا باتیں کھلاؤ گی۔'' مبرم کو شاید خود کو بھی بھوک لگی تھی۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' ویرا نے تنگ کر پوچھا۔ ''میں نہ چاچی سے دو باتیں کروں۔''

''نہ بیٹا! تحمل سے بولا کرو۔ شوہر ہے تمہارا۔'' چاچی بے اختیار ٹوک گئی تھیں۔ خود تو وہ آج تک شوہر کے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولتی تھیں۔ ان کے خیال میں مردوں سے منہ ماری نہیں کرنا چاہیے تھی۔

''ذرا سمجھا کر جائیے گا اماں! ذرا بھی میری عزت نہیں کرتی۔'' مبرم کی تو من کی مراد بر آئی۔ فوراً شکایتیں لگانے لگ گیا تھا۔

''تم بھی عزت سے پیش آیا کرو۔ استانی بھی ہے تمہاری۔'' اماں نے مبرم کو بھی ڈپٹا۔ اس کا منہ اتر گیا تھا۔

''اٹھ کر اپنے ابو سے بھی مل آؤ۔'' اچانک انہیں خیال آیا تو بولیں۔

''وہ بھی آئے ہیں۔'' مبرم چونکا۔

''ہاں' بھائی جی سے ملنے' ان سے معافی مانگنے۔'' اماں نے دبی آواز میں بتایا۔

''او...... اچھا۔'' مبرم نے معنی خیزی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کسی نئے سیاست کا سوچ کر آئے ہوں گے۔ ویسے ہمارے والد محترم سیاست دانوں والے سارے جراثیم رکھتے ہیں۔''

''اٹھو' شاباش ملو ان سے۔ دل میں کدورت نہیں رکھتے۔ باپ ہیں تمہارے۔'' اماں نے اسے پچکارا۔

''نجانے لگتا کیوں نہیں۔ کبھی باپ جیسی گرمی اور محبت محسوس بھی نہیں ہوئی۔ شاید ان کی روکھی طبیعت کی وجہ سے۔'' وہ بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔

''مبرم! اٹھ جاؤ پہلے فریش ہو لو' کیا پوستیوں کی طرح بیٹھے ہو۔'' ویرا الماری میں سے اس کے کپڑے نکال لائی۔

وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میراں بیگم ویرا کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''مبرم تمہارے ساتھ ٹھیک ہے؟'' وہ اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ظاہر ہے' منگنی کے

وقت کے سارے ہنگامے انہیں یاد تھے۔ مبرم کس طرح سے طوفان اٹھائے ہوئے تھا۔

”جی...... ایک دم ٹھیک ہے۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“ وہ گویا پرسکون ہوگئی تھیں۔

”ہمارے ساتھ گاؤں چلو گی؟ ثمرہ اور سمانہ بڑا اصرار کر رہی تھیں کہ ویرا باجی کو لے کر آنا۔“

”ابھی فی الحال تو نہیں جا سکتی۔ پاپا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔“ ویرا نے کچھ سوچ کر جواب دیا تھا تاکہ انہیں برا بھی نہ لگے۔

”بھائی جی کی طبیعت سنبھل گئی تو ضرور چکر لگانا اور بیٹی! تم سے ایک بات کہنا تھی۔“ وہ اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر بولیں۔ لہجے میں کچھ جھجک نمایاں تھی۔

”جی کہیے۔“

”بیٹی! مبرم کو سمجھایا کرو اپنے باپ سے ضد نہ باندھے۔ جوان کا مزاج ہے وہ بس میں ہی سمجھ سکتی ہوں۔ اپنی توہین اور ذلت ان سے برداشت نہیں ہو پاتی۔“ وہ گویا تھک کر بولیں۔

”چاچی جی! ایک بات میں بھی کہہ لوں؟“ ویرا ان کی بات سمجھ چکی تھی۔ سو اسی لیے اجازت طلب نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

”کہو بیٹی!“

”معذرت کے ساتھ کہتی ہوں...... آج تک میں نے بھی ایک چیز ہمیشہ نوٹ کی ہے کہ چاچو کا رویہ مبرم کے ساتھ آقا اور غلام جیسا ہوتا ہے۔ وہ اسے بات بے بات ڈی گریڈ کرتے ہیں۔ وہ اکلوتا بیٹا ہے۔ اس حساب سے چاچو نے کبھی مبرم کو کوئی اہمیت یا حیثیت نہیں دی۔ اگر مبرم کو زمین داری کا شوق ہے تو اس کا یہ شوق کوئی غلط تو نہیں زمین سے محبت تو ہر کسان کو وراثت میں ملتی ہے وہ ہمیشہ اس کے ہر شوق کی راہ میں رکاوٹ بنے ہیں۔ اگر میں صاف لفظوں میں کہوں تو بات یہ ہے کہ چاچا مبرم کی شخصیت کو مسخ کر دینا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ مبرم ایک روبوٹ کی طرح ان کے اشاروں پر آنکھیں بند کر کے چلتا رہے۔ ایک باپ ہونے کے ناتے کیا ان کی ایسی سوچ درست ہے؟“

اس نے اپنی بات کے اختتام پر چاچی کے زرد چہرے کی طرف دیکھا تھا اور پھر چپ سی کر گئی۔ نجانے کیوں لحہ بھر کے لیے اسے محسوس ہوا تھا گویا چاچی ایک ٹوٹی پھوٹی سی شکستہ عمارت کا روپ دھار گئی ہیں۔

”آپ کو میری بات بری لگی ہے؟“

”بری کیوں لگے گی۔ مجھے تو آج پتا چلا ہے کہ محترمہ مجھے اس حد تک سمجھتی ہیں۔ کمال ہے استانی جی! آپ نے تو میرا دل ہی جیت لیا۔ میں کبھی بھی اتنے اچھے طریقے سے اماں تک یہ بات نہیں پہنچا سکتا تھا۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔ محترمہ ویرا مبرم نیازی صاحبہ!“ وہ نجانے کب سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ گیلا تولیہ اس کے

منہ پر پھینکتا وہ اس کے قریب چلا آیا۔

''میری جان! تم تو سچ مچ کمال کی چیز ہو اور میں کیسا نادان تھا۔ ابو سے ضد میں اپنا ہی نقصان کرنے والا تھا۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے جو ابو' پاپا کو جواب دے گئے تھے ورنہ میں تو مفت میں مارا جاتا۔'' اماں کے سامنے اس کے لاڈ کا عملی مظاہرہ شروع ہونے کے قریب قریب تھا' اس لیے تو ویرا چیخ پڑی۔

''کبھی تو لحاظ کر لیا کرو۔''

''تم ہی کبھی میرا خیال کر لیا کرو۔'' وہ دوبدو بولا۔

''ابھی تمہارا خیال نہیں رکھتی میں۔ پچھلے دو اڑھائی سال سے میرے سر پر ہی سوار ہو۔ اب تو خیر مستقل سوار ہو چکے ہو' مگر شکوے تمہارے پھر بھی ختم نہیں ہوتے۔''

''تو تم شکوؤں کو ٹھیک طرح سے ختم کرو نا...... کیوں اماں! دیکھیں میں کتنا پیلا پھٹک ہو رہا ہوں تو ناشتہ بھی ٹائم پر نہیں دیتی۔'' وہ اپنے سرخ و سفید چہرے پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ویرا اس سفید جھوٹ پر تلملا اٹھی۔

''چاچی! اس ہٹے کٹے کے جھوٹ پر دھیان نہ دیں اور وہی ناشتے کی بات تو جب چھٹی والے روز بارہ بجے اٹھنا ہو تو ناشتہ اس کے منہ میں بھلا کیسے ٹھونسا جائے۔''

''ارے' کیا تم بچوں کی طرح لڑتے ہو۔'' چاچی ہنس پڑیں۔ مبرم کو خوش دیکھ کر ان کے دل کا تمام تر بوجھ خود بخود ہٹ گیا تھا۔ ویرا کے لیے جو دل میں تھوڑی بہت کدورت تھی' خود بخود ختم ہو گئی۔ ادھر اب وہ زبردستی مبرم کو اٹھا کر باہر لے گئی تھیں تا کہ باپ' بیٹے میں صلح کروا سکیں۔ مبرم نے ماں کی بات کا مان رکھ لیا تھا۔

ویرا گویا پھول کی طرح ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ کھانا کافی خوشگوار ماحول میں کھایا جا رہا تھا جب مبرم نے اچانک گفتگو کا رخ موڑ دیا۔

''اس دفعہ فصل اٹھانے کے بعد آپ منشی اسلم کو گندم کی فصل کا مزارعہ رکھیں گے۔''

''منشی اسلم کو؟'' عزیز نیازی ایک دم چونک گئے۔

''تم کیسے منشی اسلم کو جانتے ہو؟'' ان کا حیران ہونا فطری تھا۔ آج سے پہلے مبرم نے کبھی اس آدمی کا نام نہیں لیا تھا' کیونکہ وہ منشی اسلم سے کبھی ملا ہی نہیں تھا۔ گاؤں سے وہ اسے ہمیشہ دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ شاید اس لیے بھی کہ رنگ رنگ کے لوگوں سے وہ کبھی مل ہی نہ پائے۔

''ایک دفعہ شہر میں ہی ملا تھا مجھے۔ کچہری بازار میں۔'' مبرم نے مختصر سا بتایا۔

''کیا کہا تھا اس نے؟'' وہ کھانا چھوڑ چکے تھے۔

''بس یہی کہ وہ ہماری ٹاہلی والی زمین کا مزارع بننا چاہتا ہے۔ آدھی فصل اس کی ہو گی اور آدھی ہماری۔ سارا خرچہ اس کا اور زمین ہماری۔ آپ اسے فصل بیچنے دیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بہت سال پہلے بھی وہ ہمارا مزارع

رہ چکا ہے۔'' مبرم نے تفصیلاً بتا دیا تھا۔ عزیز نیازی نے ہاتھ کھینچ لیا' ان کی تو گویا بھوک ختم ہو گئی تھی۔

''میں منشی اسلم کو زمین نہیں دوں گا۔'' انہوں نے دوٹوک اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ مبرم کچھ بے چین سا ہو گیا۔

''مگر ابو! میں وعدہ کر چکا ہوں۔ میں نے ہامی بھر لی ہے۔ عہد سے پلٹنا مجھے سخت ناپسند ہے۔''

''تم مجھ سے پوچھ تو لیتے۔''

''میں جانتا تھا کہ گندم کی فصل اٹھا کر آپ نئے مزارع پر رکھیں گے سو اسی لیے میں نے منشی اسلم کو ہاں میں جواب دے دیا تھا۔''

''اسی لیے تو میں تم سے کہتا ہوں۔ زمین کے معاملوں سے دور رہا کرو۔ تم کچھ نہیں جانتے زمین داری حساب کتاب کو۔'' انہیں حسب معمول غصہ آ گیا تھا۔

''میں جاننا ہی تو چاہتا ہوں۔ اسی لیے دلچسپی لے رہا ہوں۔'' وہ اطمینان سے کھانا کھاتا رہا۔

''تمہاری دلچسپی شہر تک محدود رہنا چاہیے۔ آرام سے جاب کرو۔ شادی تو ہو چکی ہے۔ بیوی کو ساتھ لے کر یو کے چلے جاؤ۔ پڑھنا چاہو تو وہاں جا کر پڑھتے رہنا۔ کماؤ' کھاؤ جو مرضی کرو' ہر طرح کی آزادی ہے تمہیں۔''

''میں یو کے نہیں جانا چاہتا۔''

''تو اور کیا چوہدری جی! میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ کیسے نظروں سے اوجھل کر دوں۔'' کب سے خاموش بیٹھی میراں چاچی بھی بول پڑیں۔

''اس کے روشن مستقبل کے لیے ہی تو کہہ رہا ہوں۔ کیوں بھائی جی!'' انہوں نے پاپا کو بھی اپنا ہمنوا بنانا چاہا۔

''مستقبل میرا یہاں بہت روشن ہے۔ زیادہ روشن کرنے کی مجھے خواہش بھی نہیں' اتنی روشنی آنکھوں کو کہاں بھاتی ہے۔ مجھے اندھا ہو کر کیا ملے گا۔ دراصل میں اپنی ہی مٹی پر چلنا چاہتا ہوں۔ کوئی اور ملک مجھے صرف روپیہ دے گا' پہچان نہیں۔'' مبرم کا انداز بھی فیصلہ کن تھا۔

''آج کل ہر کوئی یورپ بھاگ رہا ہے' مگر ایک ہمارے صاحبزادے ہیں جو ہمیشہ کنویں کا مینڈک بنے رہنا چاہتے ہیں۔'' وہ سخت تاؤ کھا کر بولے۔

مبرم کچھ اور کہنا چاہتا تھا' مگر ویرا نے اس کے پاؤں پر اپنے پاؤں کا ٹھوکا دے کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''چاچو جی! یہاں رہ کر بھی تو ترقی کی جا سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے ہمارے ملک کی زمین سونا ہے سونا۔ مبرم کا ارادہ یہاں فروٹ اور سبزیاں سٹور کرنے کے لیے کولڈ سٹور بنانے کا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو آپ خود سوچئے' چھوٹے پیمانے پر فصل اور سبزی' فروٹ کا کاروبار کرنے والے کسان کافی حد تک خوشحال ہو جائیں گے...... ان

کے پھل اور سبزیاں ضائع ہونے سے بچ جائیں گی۔ کولڈ سٹور کے لیے ملازمین کی ضرورت ہوگی اور ہمارے اپنے علاقے کے لوگ صاحب روزگار ہو جائیں گے۔ جب اچھا ذہن رکھنے والے سارے لوگ باہر کی طرف بھاگ جائیں گے تو ہمارے ملک کو ترقی کون دے گا؟''

مبرم کے بولنے سے پہلے ہی ویرا نے بہت ہی شستہ' رواں لہجے میں اپنی بات بہت اچھی طرح سے چاچا جی تک پہنچا دی تھی اور وہ نجانے کس طرح غصے کو قابو کر کے بمشکل بولے۔

''بیٹی! یہ عورتوں کے معاملات نہیں ہیں۔'' دوسرے لفظوں میں انہوں نے اسے خاموش رہنے کے لیے کہا تھا۔

''ویرا! ٹھیک کہہ رہی ہے ابو! میں کچھ دنوں تک تعمیراتی کام شروع کروانے والا ہوں۔'' اس نے کمال اطمینان سے انہیں بے اطمینان کر دیا تھا۔

''کیا مطلب؟ مجھ سے پوچھے بغیر۔ کیا میری اتنی بھی اہمیت نہیں۔'' وہ گویا چیخ پڑے۔

''دیکھ رہی ہو اپنے نافرمان بیٹے کو۔ مجھ سے مشورہ لینا بھی گوارا نہیں کیا۔ یہ کب سے اتنا خودمختار ہو گیا ہے۔'' وہ میراں چاچی پر چڑھ دوڑے تھے' جو کہ گم صم سی بس ان کے غصیلے چہرے کو دیکھتی جا رہی تھیں۔

''ہانڈی کے نیچے آگ سلگائے رکھیں تو ایک دن وہ ابل ہی پڑتی ہے۔'' وہ زیرلب بڑبڑاتے ہوئے ویرا کے پیچھے ہی ڈائننگ روم سے باہر نکل گئی تھیں' جبکہ عزیز نیازی گویا خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئے۔

''اس مبرم کو لگتا ہے دوسرے طریقے سے ہی سمجھ آئے گی۔ رسی کے سارے بل نکالنا مجھے آتے ہیں۔'' وہ زہرخند سے سوچ رہے تھے۔

✦❃✦

مبرم ان دنوں بہت مصروف تھا۔ کولڈ سٹور کا تعمیراتی کام شروع ہو چکا تھا۔ بینک میں سے رقم بھی نکلنے لگی تھی' جس کی وجہ سے عزیز نیازی آگ بگولا ہوئے جا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کمی کمین خوشحال ہو گئے تو ان کے کام بھلا کون کرے گا۔

بہت دنوں بعد مبرم کا شہر کی طرف چکر لگا تھا۔ سو ویرا پاپا کے مجبور کرنے پر گاؤں جانے پر رضامند ہو گئی تھی۔

مبرم نے کچھ مشینری اور بجلی کا سامان خریدنا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ویرا کو لینے آ گیا تھا۔ وہ اپنے روزمرہ کے کام کاج سے فارغ ہو چکی تھی۔ پاپا کے لیے دو تین سالن بھی بنا دیئے تھے۔ ویسے وہ زیادہ جوس اور فروٹ ہی کھاتے تھے۔ سو ویرا کچھ مطمئن تھی۔

شام تک وہ لوگ گاؤں پہنچ گئے تھے۔ اس دفعہ پہلے سے بھی اچھا استقبال کیا گیا تھا۔ ثمرہ' سمانہ اور سمن خوشی سے کھل اٹھی تھیں۔ گوشی کچن میں جا گھسی تھی۔ نجانے کیوں وہ مبرم سے چھپنا چاہتی تھی۔ شاید اسے یہ بھی

خوف لاحق تھا کہ اس کا جھوٹ کھل نہ گیا ہو۔ وہ ویرا کا سامنا کرنے سے بھی کترا رہی تھی، مگر ویرا خود ہی اسے ڈھونڈتی ہوئی کچن میں آ گئی۔

''تم کہاں چھپ گئی ہو؟''

''ویرا باجی آپ ......'' وہ جو سبزی کاٹنے میں خود کو مصروف ظاہر کر رہی تھی۔ ایک دم بھنڈی کی ٹوکری اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

''ارے، تمہیں کیا ہوا؟ اس قدر کیوں گھبرا رہی ہو۔'' ویرا حیران سی اسے تھام کر بولی تھی۔ وہ بے اختیار ویرا سے لپٹ کر رونے لگی۔

''مجھے معاف کر دیں ویرا باجی! میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے تو خالو جی نے مجبور کیا تھا۔ میں نے کچھ بھی نہیں سنا۔ ظاہر ہے، میں آپ کے گھر گئی نہیں تھی پھر سنتی کہاں سے۔ مگر خالو جی کے خوف سے۔''

وہ بے ربط سی بولے جا رہی تھی اور ویرا تو کچھ بھی نہیں سمجھ پائی، تب ہی مبرم بھی کچن میں آ گیا تھا۔ وہ مزدوروں کے لیے میٹھا پانی بنوانے کے لیے آیا تھا، مگر اس جذباتی سین کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''گوشی! یہ کیا بچپنا ہے؟'' مبرم کو بالآخر بولنا پڑا۔ ''اس میں تمہارا کیا قصور؟'' وہ حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

مبرم نے مختصر الفاظ میں سارا قصہ اسے بھی سنا دیا تھا۔

''چاچو جی نجانے کس قسم کی سوچ رکھتے ہیں؟'' ویرا کو ایک دم جھرجھری سی آ گئی تھی۔

✦❋✦

ان دنوں مبرم تعمیراتی کام زور و شور سے ختم کروا رہا تھا جب پاپا اچھے بھلے گاؤں آئے اور ایک رات معمولی سے درد کو نہ سہتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس صدمے نے کئی دن تک ویرا کو ہوش و حواس سے عاری رکھا۔

پاپا کی دائمی جدائی کے دکھ نے اسے بیمار کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ کئی دن تک ہسپتال میں ایڈمٹ رہی تھی۔

گوشی اور سمانہ ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ اب وہ رات کو واک کے لیے بھی جانے لگی تھی' پھر بھی اسے افاقہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے اصرار پر مبرم اسے گاؤں لے آیا تھا۔

آج پھر وہ گوشی کے ہمراہ آم کے باغ کی سیر کرنے نکل آئی تھی۔ آم کا پھل تو اتارا جا چکا تھا۔ تاہم گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھایا کے نیچے ٹہلنا ویرا کو بہت پسند تھا۔ نجانے کہاں سے مبرم بھی ادھر آ نکلا تھا۔ انہیں چہل قدمی کرتے دیکھ کر اس نے کسی کو آواز دے کر چارپائی بھی منگوا لی تھی۔

''یہاں آ کر بیٹھو...... تھک جاؤ گی۔''

''آج میں بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں اور مجھے آم کے یہ درخت بہت پسند ہیں۔'' بہت دنوں بعد وہ کافی فریش موڈ میں دکھائی دے رہی تھی۔

''ویرا! کیا ہم شہر نہ چلیں ...... یہاں تم بہت بجھ کر رہ گئی ہو۔''

''مجھے لگتا ہے گاؤں مجھے راس نہیں آیا۔ شہر واپس جانا پڑے گا۔'' وہ آزردگی سے بولی۔

''تو کیا آج شام کو واپس چلیں۔''

''اتنی جلدی ......'' گوشی بے ساختہ بولی۔ ''ہم کیا کریں گے ویرا باجی! ابھی کچھ دن اور رہ لیں' ویسے بھی آپ کی صحت اتنی بھی اچھی نہیں ہوئی۔ شہر میں آپ کا خیال کون رکھے گا۔''

''تو تم ہمارے ساتھ چلو نا ...... باجی کا خیال بھی رکھ لینا۔'' مبرم نے اچانک کہا تھا۔ ویرا کو یہ آئیڈیا خاصا پسند آیا۔

''میں ...... مگر کیسے؟'' گوشی کچھ گھبرا گئی۔

''کیا مطلب کیسے ہمارے ساتھ چلو گی۔'' ویرا بگڑی۔

"مگر خالو جی۔" اصل خوف خالو جی کی طرف سے لاحق تھا۔

"خالو جی کا ہوا سر پر سوار کر رکھا ہے۔ اب ایسے بھی وہ جنگجو نہیں ہیں۔" ویرا نے خفگی سے کہا۔

"ویرا باجی! آپ جانتی نہیں ہیں۔ خالو جی تو ہمیں کہیں بھی نہیں جانے دیتے۔"

"خالو جی تو سانس بھی نہ لینے دیتے اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو" مبرم نے تلخی سے کہا تھا۔ اب وہ اٹھ کر کچے راستے سے ہوتے ہوئے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

واپسی پر مبرم ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ دونوں اب پکی سڑک کی طرف جا رہی تھیں۔ کچھ ہی دور گھر کی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ گیٹ کے سامنے چاچو جی کی گاڑی کھڑی تھی۔ گوشی تو گاڑی دیکھ کر ہی گھبرا گئی۔

"لگتا ہے...... خالو جی گھر آ گئے ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟"

"ویرا باجی! ہم پچھلے دروازے سے اندر چلے جاتے ہیں۔" وہ بے ساختہ اس کا بازو تھام کر اسے بھی روک چکی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ تم میرے ساتھ آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر داخلی دروازے سے اندر آ گئی تھی۔ جوں ہی انہوں نے برآمدے میں قدم رکھا تھا۔ چاچو جی کی گرج دار آواز سنائی دی۔

"کہاں تھیں تم دونوں؟"

"ذرا باغ میں نکل گئے تھے۔" ویرا اطمینان سے بولتی ہوئی اندر آ گئی جبکہ گوشی وہیں جمی رہی۔ خوف سے اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ ویرا پلٹ کر اس تک آئی تھی اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر آ گئی۔

"تم نے اگر یہاں رہنا ہے تو پرانے طور طریقے بھول جاؤ۔ ہماری لڑکیاں یوں آزادانہ نہیں گھومتیں۔" وہ تڑخ کر بولے تھے۔ ویرا کے سوال جواب انہیں ہرگز بھی پسند نہیں آتے تھے۔ اس کے جرح کرنے والے انداز سے تو انہیں اور بھی چڑ تھی۔

"تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تھے۔ مبرم ہمارے ساتھ تھا۔" ویرا نے نرمی سے وضاحت کی۔ وہ ایک دفعہ پھر ہلکا ہلکا بخار محسوس کر رہی تھی۔ شاید تھکاوٹ کی وجہ سے حرارت ہو گئی تھی۔

"مبرم کو بھی میں دیکھ لوں گا۔ یوں آزادی دے رکھی ہے۔ اگر شتر بے مہار پھرنا ہے تو پھر گاؤں آنے کی ضرورت نہیں۔ شہر میں ہی رہو دونوں۔"

"اگر آپ کو برا لگا ہے تو معذرت چاہتی ہوں۔" وہ بات کو ختم کرنا چاہتی تھی۔

"گوشی کیوں گئی تھی میری اجازت کے بغیر گھر سے باہر۔" انہوں نے دھاڑ کر پوچھا تھا۔ یوں کہ سمانہ اور ثمرہ سہم کر ماں کی اوٹ میں ہو گئیں۔

"خالو جی! مجھے معاف کر دیں۔" وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بولی۔

''کیا ملاقات کرنے گئی تھیں اس خبیث سے۔'' انہوں نے اویس کو ایک موٹی سی گالی دی۔
''نہیں ......نہیں، کبھی نہیں مم' میں' تو ویرا باجی کے ساتھ گئی تھی۔'' گوشی خوف کے مارے سرد ہوگئی۔
''جھوٹ مت بولو۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر گوشی کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ وہ لہرا کر فرش پر جا گری تھی۔
''چاچو جی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' ویرا گویا وحشت زدہ رہ گئی۔
''تم بیچ میں مت بولو۔'' وہ چلا اٹھے تھے۔ یقیناً انہیں گوشی کی غداری کی خبر بھی ہوگئی تھی کہ اس نے ان کے جھوٹ کا پول کھول دیا ہے۔
''آپ کو ذرا احساس نہیں کہ ایک بیٹی پر ہاتھ اٹھا رہے ہیں۔'' ویرا بھلا خاموش رہ سکتی تھی۔
''ہماری بیٹیوں کو زبان درازی کا سبق مت دو۔'' غصے سے ان کی آنکھیں انگارہ ہوگئی تھیں۔ ویرا بھی گویا ضبط کی کڑی منزلوں سے گزر رہی تھی۔
''میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کا خون ہوں چاچو جی! آپ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں مجھ سے۔''
''ایسی بے حیا اور بدزبان ہماری بیٹی نہیں ہو سکتی۔'' ان کے لہجے میں تنفر ہی تنفر تھا۔ اب وہ میراں چاچی کی طرف رخ کیے بول رہے تھے۔
''تمہارے بیٹے نے بیاہ کیا ہے ایک ٹٹ پونجیے وکیل کی بیٹی سے۔ اگر نواب مرزا کی بیٹی بیاہ لاتا تو تین مربع زمین بھی مل جاتا تھی اور اگر تمہاری اس بھانجی سے شادی کر لیتا تو آٹھ ایکڑ زمین بھی اسی لاکھ کی مالیت کی تھی۔ اس سے بیاہ رچایا ہے جو خالی ہاتھ اٹھ آئی ہے۔ نہ زمین نہ جائیداد' اس کے عیاش باپ نے تو ساری زندگی کچھ بنایا ہی نہیں' جو کچھ لوگوں نے اسے دیا' وہ بھی بانٹتا رہا۔ ہونہہ' ہم نے ایسے سخی نہیں دیکھے آج تک۔''
''چاچو جی! میرے باپ کو گالی مت دیجیے۔'' ویرا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ''ایسا نہ ہو رشتوں سے میرا اعتماد اٹھ جائے۔ پھر کوئی بھتیجی کسی چچا کو باپ بھلا کیسے مانے گی؟''
''یہ جذباتی باتیں مجھے متاثر نہیں کر سکتیں۔ سامان سمیٹو اور شوہر کے ساتھ چلتی بنو۔ اگر اتنا ہی مجھے باپ مانتی ہوتا ......تو پھر میری بیٹی بن کر دکھاؤ۔ میری عزت اور مان کو واپس لوٹاؤ۔'' وہ گویا ایک دم پینترا بدل گئے تھے۔
''کیا مطلب ......؟'' ویرا ٹھٹک کر رہ گئی۔
''مبرم نے مجھے ذلیل کرنے اور مجھے بھائی جی کی نظر میں گرانے کے لیے آناً فاناً تم سے نکاح کیا تھا۔ اگر میری بیٹی ہو تو مبرم کو اس نیچ حرکت پر جھکانے کے لیے میرا ساتھ دو۔'' اب وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے قریب آ گئے تھے۔
''آپ کا ساتھ مگر کیسے؟''

''مبرم کو چھوڑ کے۔ ابھی میرا اور اس کا جھگڑا ہوا ہے۔ وہ ڈیرے پر ہے اور تمہیں لینے کے لیے آرہا ہے۔تم یہاں رہو میرے پاس اس کے ساتھ مت جانا۔ میں اسے جھکانا چاہتا ہوں۔تم میری بیٹی ہو تمہیں میرا مان بنتا ہے۔اسے جواب دے دینا۔آخر کتنے دن باہر دھکے کھائے گا۔سات ہزار ماہوار تنخواہ میں ایک کمرہ بھی کرائے کا نہیں ملے گا اور جو تمہارا گھر ہے وہ تو مالک مکان نے خالی کروا لیا ہے۔تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر ذلیل کرے گا۔ نہ اس کے پاس کوئی ٹھکانہ ہے' نہ جیب میں پیسہ۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھے گویا التجا کر رہے تھے۔

''مالک مکان نے گھر خالی کروا لیا؟'' ویرا کو دھچکا لگا تھا گویا۔

''بھائی جی کی وفات کے آٹھ دن بعد ہی تو کروا لیا تھا۔کیا تمہیں مبرم نے نہیں بتایا۔'' اب وہ معصوم بنے پوچھ رہے تھے۔

''نہیں تو۔'' اس کا بے اختیار نفی میں سر ہل گیا۔

''نجانے یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' وہ گویا چکرا کر رہ گئی تھی۔

''مبرم بھلا کیوں بتائے گا۔'' وہ تنفر سے بولے۔

''بہت اکڑ ہے اس میں چار دن گھر سے باہر رہے گا تو دن میں تارے نظر آ جائیں گے۔ سارا نخرا بھول جائے گا۔بس تم ثابت قدم رہنا۔''

''مجھے مبرم کے ساتھ جانا ہے۔'' ویرا کے مضبوط لہجے نے ان کے یقین کو ڈگمگا دیا تھا۔

''جذباتیت میں فیصلہ نہ کرو بیٹی! خوب سوچ سمجھ لو۔مبرم کے ساتھ دھکے کھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے' جب تک چاہے رہو۔مبرم بھی ذلیل و خوار ہو کر واپس ہی آئے گا۔تم فکر مت کرنا۔''

''مجھے ہر صوت میں مبرم کے ساتھ ہی جانا ہے۔ یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔'' ویرا تڑخ کر بولی۔

''تو پھر واپسی کے راستوں کو بھول جانا۔ یہاں تمہارے باپ کی قبر ہے۔ فاتحہ پڑھنے کے لیے بھی قبرستان نہیں جانے دوں گا۔'' وہ پھر سے سفاک ہو گئے تھے۔

''میں اس گاؤں کے سارے راستوں کو بھول کر ہی جاؤں گی۔''

''ویرا بیٹی! بس کرو غصہ نہ کرو ان باپ بیٹے کی جنگ تو یوں ہی چلتی رہے گی۔ بھلا اس میں ہمارا تمہارا کیا قصور ہے؟'' میراں چاچی جو نجانے کب سے گھٹ گھٹ کر رو رہی تھیں' ایک دم بھرائی آواز میں بول پڑیں۔

''چاچی! قصور نہ جانے کس کا ہے۔ میں تو ابھی تک ایک ہی الجھن کا شکار ہوں اور مجھے آج تک اس الجھن کا کوئی سرا نہیں ملا۔'' وہ گویا تھک کر رہ گئی تھی۔ ادھر چاچو جی اس کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلے گئے تھے۔

''گوشی ابھی تک سسک رہی تھی۔ ویرا نے جھک کر اسے اٹھایا۔ثمرہ اس کے لیے پانی لے آئی تھی۔ جسے

اس نے منہ تک نہیں لگایا تھا۔

''ویرا باجی! مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا۔ میں بھی اس قید خانے سے تنگ آ چکی ہوں۔'' گوشی سسکتے ہوئے اس سے لپٹ گئی تھی۔ میراں چاچی منہ پر کپڑا رکھ کر رونے لگیں۔

''میری یتیم بچی! مجھے معاف کر دینا۔ میں تیرا ساتھ نہیں دے پاتی۔''

''آپ کا بھلا کیا قصور' قسمت تو میری خراب ہے۔''

''قسمت تو ہم سب کی خراب ہے۔ کوئی سکھ نصیب نہیں ہوتا۔ ہر وقت ایک دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اللہ ہمارے بھائی کو سلامت رکھے۔'' سمانہ بھی بری طرح سے رو دی تھی۔

''ویرا باجی! مجھے اپنے ساتھ لے جانا۔'' گوشی کا ذہن ایک نقطے پر اٹک گیا تھا۔

''تم سچ مچ ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہو؟''

''ہاں۔'' وہ گویا اس زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔

''اور چاچو جی' وہ کیا کہیں گے؟ کیا وہ مان جائیں گے؟''

''ان کو اللہ ہی سمجھے۔ بس تم گوشی کو اپنے ساتھ لے جانا۔'' چاچی نے بھی گویا التجا کی تھی۔ ''اور پھر میرے بھائی کو بلوا کر اویس کے ساتھ سادگی سے اسے رخصت کر دینا بیٹی! یہی شاید ہم سب کے حق میں بہتر ہو گا۔''

''نکاح۔'' ویرا چونک گئی۔

''ہاں' بس یہی کام چپکے سے کر دینا۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔'' وہ خود بھی بہت خوف زدہ تھیں۔

''مگر اتنی جلدی کیسے؟''

''یہ جو تمہارا چاچا ہے نا۔ اب کوئی نیا چن چڑھائے گا۔'' وہ زخمی لہجے میں بولیں۔

''کیا مطلب؟''

''گوشی کی کہیں اور بات چلانے لگے ہیں۔'' سمانہ نے دبی آواز میں بتایا۔

''مگر کیوں ...... ؟ چاچو ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کیوں جذبات و احساسات سے کھیل کر انہیں تسکین محسوس ہوتی ہے۔'' ویرا گویا تھک گئی۔

''یہ ہم بھی نہیں جانتے۔ نجانے ان کے ذہن میں کیسی کیسی الجھنیں ہیں' جو وہ دوسروں کی زندگیوں کو بھی الجھا کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔''

ثمرہ کا لہجہ زہر زہر تھا۔

کچھ دیر بعد مبرم آ گیا۔ وہ بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ نجانے باپ بیٹے میں کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ مبرم نے آتے ہی اس سے کہا۔

''ویرا اپنا ضروری سامان رکھ لو۔ ہمیں ابھی نکلنا ہے اور گوشی کا سامان بھی تیار کر دو۔ یہ ہمارے ساتھ

جائے گی۔"

"مبرم! ایک دفعہ میری بات سن لو۔" میراں چاچی اس کے بے حد سرخ چہرے اور سرخ انگارہ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ابھی وقت نہیں پھر سہی۔" مبرم نے عجیب سے رکھائی بھرے انداز میں کہا تھا۔ وہ ایک دم بے قرار ہو گئیں۔

"میری بات تو سنو تم یوں مجھ سے بدگمان ہو کر نہ جاؤ بیٹا۔" وہ گویا التجا کر رہی تھیں۔ "ایک دفعہ اپنے ابو سے مل لو۔ وہ بڑے ہیں، اگر کچھ کہہ دیا تو درگزر کر دو۔"

"آج تک درگزر ہی کرتا رہا ہوں۔ اب ان سے ایک ہی ملاقات کروں گا۔ یہ ملاقات آخری ہو گی یعنی کورٹ میں۔" وہ سر سے لے کر پیر تک سلگ رہا تھا۔ میراں چاچی کا چہرہ فق ہو گیا۔

"عدالت میں گھسیٹو گے اس عمر میں انہیں۔"

"انہوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے کیا کروں؟ یہ میری مجبوری ہے اور میں اپنا حق کسی بھی طرح چھوڑوں گا نہیں۔ میرے حصے کا رزق کیوں کسی اور کے پیٹ میں جائے۔ کبھی کبھی سچائی ظاہر ہونے میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں مزید کٹھ پتلی نہیں بنا۔" مبرم اپنے ضروری کاغذات سمیٹ رہا تھا۔ میراں چاچی مسلسل رو رہی تھیں۔ سمانہ اور ثمرہ اداس نظروں سے انہیں جاتا دیکھنے لگیں۔ مبرم گاڑی میں سامان رکھوا کر پلٹ آیا۔

"تم تینوں میری بہنیں ہو اور میں بہت جلد تم تینوں کو بھی یہاں سے لے جاؤں گا۔" اس نے فرداً فرداً تینوں کے سروں پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر ذرا دور بیٹھی میراں چاچی کے پاس چلا آیا۔

"اماں! آپ کو بھی میرے ساتھ جانا ہو گا۔"

"نہیں، میں اس بڑھاپے میں اپنا گھر بار اور شوہر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"چاہے آپ کا شوہر خود آپ کو یہاں سے نکال دے۔" مبرم کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"وہ ایسا کیوں کریں گے؟"

بہت چاہنے کے باوجود بھی ان کا لہجہ مضبوط نہیں بن سکا۔

"وہ ایسا ضرور کریں گے۔ وہ آدمی آپ کو چین سے نہیں رہنے دے گا۔ پلیز اماں! میری بات مان جائیے۔ میں آپ کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"وہ آدمی میرا شوہر ہے۔" وہ چیخ پڑی تھیں۔

"صرف آپ کا ہی نہیں، نگینہ بائی کا بھی شوہر ہے۔ اس کی بھی تین بیٹیوں کا باپ ہے۔" مبرم نے گویا دھماکہ کیا تھا۔ ان سب کے ساتھ ساتھ ویرا بھی ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو مبرم!'' بالآخر ویرا نے ہی سنبھل کر پوچھا تھا۔ وہ سب تو گویا پتھر کے وجود میں ڈھل گئی تھیں۔

''یہی سچ ہے پچھلے سترہ سال سے یہ آدمی میری ماں کو دھوکا دے رہا ہے۔ نجانے کتنے چہرے ہیں' اس آدمی کے' نجانے کتنے نقاب چڑھا رکھے ہیں۔ اگر مجھے منشی اسلم نہ بتاتا تو مجھے ہمیشہ بے خبر ہی رہنا تھا اور اس نے تو مجھے کچھ اور بھی بتایا ہے اماں! ابھی مجھ میں حوصلہ نہیں۔ قیامت کا صبر اور ضبط لاؤں گا۔ تب ہی آپ سے چند ایک سوال پوچھنے کی جرأت کر پاؤں گا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میری وجہ سے آپ کو کچھ دکھ پہنچا ہو تو۔ اماں! میری ذات ریت کے ذروں کی مانند بکھر گئی ہے۔ مجھے خود کو سمیٹ کر ایک جنگ کے لیے تیار کرنا ہے۔ میرے لیے دعا کیجئے گا۔''

وہ ماں کے سامنے جھک گیا تھا۔ میراں چاچی نے اس کا چہرہ ہاتھ کے پیالے میں تھام کر چوما۔

''تجھے اللہ کی امان میں دیا پر بچہ! مجھ سے کوئی سوال جواب مت پوچھنا۔ میں تیرے کسی سوال کا سامنا نہیں کر پاؤں گی۔'' وہ گویا سسک رہی تھیں۔ عزیز نیازی ان کے لیے تو کبھی بھی کچھ بھی نہیں تھے' مگر پھر بھی دل تھا کہ اس صدمے کو سہار نہیں پا رہا تھا۔ اوپر سے بیٹے کی جدائی کا دکھ۔ جدائی کا یہ دردناک منظر ہر آنکھ کو نم کر گیا تھا۔ میراں بیگم جانتی تھیں' مبرم کبھی نہ لوٹنے کے لیے جا رہا ہے۔ وہ اس گھر میں کبھی واپس نہیں آئے گا۔ ان کی آنکھیں اس کے انتظار میں تھک جائیں گی۔

وہ ستون کے ساتھ ٹیک لگائے اپنے پردیسی بچوں کو دیکھ رہی تھیں' جو دھیرے دھیرے ان کی نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے۔

✦❃✦

''ارباب! میرے ساتھ دیہاڑی پر چلو گے؟'' بڑی شرمندگی کے عالم میں اپنے کھردرے' پھٹی پھٹی جلد والے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے نظر جھکائے مستری اقبال نے کہا تھا۔ بڑی دقتوں کے بعد یہ الفاظ ان کے منہ سے برآمد ہوئے تھے۔ تین ساڑھے تین ماہ کے بیمار مہمان کو جس کے پیر اور بازو کے زخم بھی کچے تھے' جو ابھی ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے کام کے لیے کہنا مستری اقبال جیسے نرم دل' ہمدرد اور مخلص آدمی کے لیے بہت مشکل کام تھا۔

''ہاں ......'' ارباب نے ان ہی کے انداز میں سر جھکا کر جواب دیا۔

''میں آپ کے ساتھ کام پر چلوں گا۔'' وہ جانتا تھا۔ مستری اقبال بہت غریب آدمی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اپنے بھائی کے بیٹے کی کفالت بھی ان ہی کے ذمے ہے۔ اوپر سے یہ دونوں باپ بیٹی بلا کے مہمان نواز بھی تھے۔

مستری اقبال جب بھی دیہاڑی لگا کر واپس آتے تو ہاتھ میں دو تین شاپرز پکڑے ہوتے تھے۔ وہ سیدھا

باورچی خانے میں چلے جاتے تھے اور ارباب بغیر سنے بھی جانتا تھا۔ مستری اقبال بیٹی سے کہہ رہے ہوں گے۔
''یہ مہمان کے لیے پھل اور گوشت ...... ارباب کو قیمہ پکا کر دو۔ اس کے کچے ٹانکے اور زخم جلدی بھرنے لگیں گے۔''

''جی اچھا ابا!''

ماہ کامل باپ سے بھی بڑھ کر مہمان نواز تھی۔ فوراً لہسن اور پیاز چھیلنے بیٹھ جاتی۔ اس وقت بھی وہ باپ اور ارباب کے سامنے ناشتہ رکھ رہی تھی جب باپ کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ سن کر ٹھٹک گئی۔ ''ابا! یہ دیہاڑی پر کیسے جائے گا؟ یہ تو بیمار ہے۔ فاتح بھی تو امتحان کے بعد فارغ ہو گیا ہے کیا آج کے دن آپ کے ساتھ دیہاڑی پر نہیں جا سکتا۔''

ماہ کامل نے کافی کٹیلے لہجے میں کہا تھا۔

''بات تو ٹھیک ہے' پر فاتح کو آج شہر جانا ہے اور میں اکیلا نواب صاحب کا کام نہیں کر پاؤں گا۔ دوسرے لڑکے بھی آج چھٹی پر ہیں۔ اینٹیں' مسالہ (سیمنٹ اور ریت کا مکسچر) کون بنوائے گا۔'' وہ سچ مچ لاچار تھے۔ ظاہر ہے تنہا آدمی اتنا کام تو نہیں کر سکتا اور معمار' راج تو صرف تعمیراتی کام کرتے تھے اوپر کا کام تو مزدور کو کرنا ہوتا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا چاچا!''

ارباب نے کہا۔

''تم نہیں جاؤ گے۔'' ماہ کامل کا انداز دوٹوک تھا۔ عجیب سی تمکنت اور وقار اس کی شخصیت میں جھلکتا تھا۔ اسی پل فاتح گھر میں داخل ہوا تھا۔

''چاچا! میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ ارباب کے تو زخم بھی ٹھیک نہیں۔ یہ اتنا مشکل کام نہیں کر سکے گا۔''

''پر تم نے تو شہر جانا ہے۔'' وہ کچھ تذبذب کا شکار تھے۔ فاتح کے لیے بھی وہ اسی طرح سے حساس تھے۔ اس کی تعلیم اور نوکری کے حصول تک کا یہ عرصہ ایک پل صراط کی مانند تھا۔ بڑا صبر آزما انتظار کیا تھا انہوں نے فاتح کے جوان ہونے تک۔ نہیں گویا یقین تھا کہ فاتح کی نوکری لگنے کے بعد ان کے دن پھر جائیں گے اور اس کے بعد فاتح اور ماہ کامل کی شادی۔ کتنے خوش رنگ اور سنہرے خواب تھے' جن کی تعبیر صرف دو قدم کے فاصلے پر تھی۔

''چاچا! اب تو نوکری کا سندیسہ گھر آ جائے گا۔ ہمارا کام ہو چکا ہے۔''

وہ بے حد مطمئن تھا۔

''چلو' پھر چلتے ہیں۔'' وہ دونوں آگے پیچھے گھر سے باہر نکل گئے تھے۔ ماہ کامل گھر کے کام کاج میں مصروف ہو چکی تھی' مگر گاہے بگاہے' وہ مٹی کے اونچے سے ٹیلے پر بیٹھے ارباب کو بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ گھر کے

ایک طرف مٹی کی اونچی سی پہاڑی بنائی گئی تھی' جس کے اطراف میں گلاب اور موتیا کے پھول ایک ترتیب سے لگائے گئے تھے۔ یہ جگہ ماہ کامل کی پسندیدہ جگہ تھی اور آج کل اسی ٹیلے پر ارباب نے قبضہ جما رکھا تھا۔ ماہ کامل برتن دھو کر ایک ٹوکری میں سبزی اٹھائے سیدھی اسی پھولوں کی پھلواری کے قریب آ گئی تھی۔

''ارباب!''

وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ ماہ کامل کی آواز سن کر چونکا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ وہیں پھسکڑا مارے بیٹھ گئی تھی۔

''سوچتا ہوں کب واپسی کے لیے رخت سفر باندھوں گا؟''

ارباب گہری سانس کھینچتا بول رہا تھا۔

''میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں ارباب!'' وہ چھری اور پیاز ٹوکری میں رکھ کر گویا اپنی ہمتیں مجتمع کر رہی تھی۔

''میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔''

وہ جانتا تھا کہ ماہ کامل کون سے درد کی کہانیاں سنانا شروع ہو جائے گی۔ وہ اس درد کا پہلے سے ہی آشنا تھا۔

''اگر تم مان جاؤ تو ابا میری محبت میں فاتح کو بھی جواب دے دیں گے۔ وہ میری خوشی اور میرے دل کو عزیز رکھتے ہیں۔ اگر تم مان جاؤ تو میں تمہارے دل کے ہر زخم کی مسیحائی کروں گی۔'' وہ گویا سسک پڑی اور طاق میں رکھی محبت کے چراغ نے بھی کوئی درد بھرا نوحہ پڑھا تھا۔

''جن راستوں کی خبر نہ ہو۔ اس سفر پر نکلنے سے پہلے سوچ تو لیتے ہیں۔'' ارباب نے ایک نازم سی مرجھائی کلی کو کچی زمین سے اٹھا کر سونگھا۔

''دل سوچ سمجھ کر محبت کے اسباق نہیں پڑھاتا۔''

''لاحاصل سفر کے لیے خود کو تھکانے والے ایک دن ہار جاتے ہیں۔''

''تم مجھے ٹھکرا رہے ہو ارباب!''

ماہ نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''نہیں ...... میری یہ مجال کہاں' میں تو ایک حقیر سا انسان ہوں اور زخم خوردہ بھی ...... میری زندگی کا صرف ایک مقصد ہے ماہ! اگر اس مقصد میں مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو میں بھسم ہو جاؤں گا۔ آگ تو ہر وقت میرے سینے میں بھڑکتی رہتی ہے۔''

اس کے لہجے میں عجیب سا زہر بھر گیا تھا۔

''کیا کسی اور کے اسیر ہو؟''

''ہاں۔''

''کون تھی وہ؟ کہاں گئی؟''

''مجھے چھوڑ گئی۔''

''جس نے چھوڑ دیا' اس کی خاطر جوگ لو گے کیا؟ جو منتظر ہے' اسے کیوں نہیں اپنا لیتے۔'' اس کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔

''خود کو روگ لگانے اور جوگ لینے کی منزل سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔ اب صرف انتقام کی آگ ہے میرے دل میں۔''

''ارباب! ایک بات تو بتاؤ؟''

''ہاں' پوچھو۔'' وہ گویا اس کے موضوع بدلنے پر ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

ماہ کامل کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر جب بولی تو لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

''تم نے اس سے محبت کیوں کی؟''

وہ پوچھ رہی تھی۔

''کی کہاں تھی وہ تو خود بخود ہو گئی تھی۔''

ارباب گویا اسے لاجواب کرنا چاہتا تھا۔

''محبت ہمیشہ خود بخود ہی ہو جاتی ہے۔ جب میں نے تمہیں نہر کے کنارے زخمی حالت میں پڑا دیکھا تھا تم اجنبی تھے' میں جانتی تھی' پردیسی تھے' یہ بھی جانتی تھی' مجھے خبر تھی تم نے پلٹ جانا ہے' مگر اس دل پر اختیار نہیں تھا۔''

وہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں تھی' بلکہ تیزی سے اٹھ کر باورچی خانے میں جا گھسی' جبکہ ارباب گویا پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا اس کے وجود میں جان تک باقی نہیں۔

بانسری کی آواز اسے اپنے کمرے سے باہر لے آئی تھی۔ اسے دیکھ کر فاتح نے بانسری رکھ دی تھی۔

''رُک کیوں گئے؟' بجاؤ نا۔''

''تمہیں بانسری پسند ہے؟''

''بہت ...... اسی لیے تو آیا ہوں۔'' اس نے فاتح کے کمرے پر نظر دوڑائی۔ موسیقی کے کئی آلات ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ سارنگی' دف' ترمبی بیلا' جانجھ اور ہارمونیم بھی تھا۔

''یہ سارا موسیقی کا سامان تمہارا ہے؟''

''نہیں۔'' وہ مسکرا دیا۔

''یہاں ایک بابا جی ہوا کرتے تھے' میراثی تھے' پتا نہیں کہاں سے آئے تھے۔ یہ سارا سامان ان ہی کا تھا۔ میں نے بانسری بجانا بھی ان ہی سے سیکھی تھی۔ جب وہ وفات پا گئے تو میں ان کا واحد شاگرد تھا' اس سارے سامان پر اپنا حق سمجھ کر لے آیا۔''

فاتح نے بڑے مزے سے ساری بات بتائی تھی۔

''تم بانسری بہت اچھی بجاتے ہو؟''

''شکریہ جناب کا' کچھ لوگوں کو تو میری بانسری سے شدید قسم کی چڑ ہے۔'' ماہ کامل کو اندر آتے دیکھ کر فاتح شرارتی انداز سے بولا۔

''ڈھنگ کی بجانی جو نہیں آتی۔''

وہ ان کے لیے قہوہ بنا کر لائی تھی۔ سبز الائچی والا مزے دار سا قہوہ ارباب کو بھی بہت پسند تھا۔

✦❋✦

فاتح کی نوکری کیا لگی' مستری اقبال کے گھر گویا خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔
فاتح ان دنوں ہواؤں میں اڑتا پھر رہا تھا اور ماہ کامل اس کی کامیابی پر دل سے خوش ہونے کے باوجود بھی بجھی بجھی سی تھی۔
فاتح کی پہلی تقرری کسی اور ڈسٹرکٹ میں تھی اور وہ اسی سلسلے میں آج کل تیاریاں بھی کر رہا تھا۔ روانگی سے ایک گھنٹہ پہلے اس نے ارباب سے کہا۔
''کل تمہارا چیک اپ ہوگا اور جو تمہیں پاؤں میں معمولی سی تکلیف ہے' اس کے لیے بھی میں نے ڈاکٹر سے ٹائم لے رکھا ہے۔ سو تم ضرور وقت پر پہنچ جانا۔''
ارباب کبھی کبھی ان اجنبی اور غیر لوگوں کے خلوص کو دیکھ کر عجیب سے احساسات کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس گھر کے یہ تین افراد اس کے لیے بھلا کیا تھے۔ انسان یا انسان کی شکل میں فرشتے۔
اس کے علاج معالجے پر ایک بھاری رقم خرچ کرنے کے باوجود آج تک انہوں نے اظہار نہیں کیا تھا۔ کبھی جتانے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی اس کے ماضی' حال حتیٰ کہ خاندان تک کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔
ان دنوں وہ کافی ٹھیک تھا۔ پہلے کی طرح چل پھر سکتا تھا۔ اس کے زخم بھی بھرنے کے قریب قریب تھے۔ بس کبھی کبھی پاؤں میں معمولی سی تکلیف ہوتی تھی' جو چیک اپ اور دوائیوں کے بعد ٹھیک ہو رہی تھی۔
اس کے باوجود وہ ابھی واپسی کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ اسے ابھی کچھ اور وقت درکار تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا۔ بہت ذہانت سے لائحہ عمل ترتیب دینا تھا۔
اس دن ارباب گھر کے پچھواڑے مستری اقبال کی دکان میں چلا آیا تھا۔ مستری جی لوہے کا کام بھی جانتے تھے۔ فارغ اوقات میں اس دکان پر بیٹھتے تھے۔ اکثر زمین داروں کے ہل کے پھلکوں' درانتی وغیرہ کو ٹانکا لگا دیتے تھے اور درانتی تیز کر کے دیتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بڑی مہارت تھی۔
شام تک وہ ساتھ رہا تھا۔ چھوٹے موٹے کاموں میں ان کی مدد کرتا رہا۔ مغرب کی اذان کے بعد وہ سیدھا مسجد چلے جاتے تھے۔ ارباب بھی انہیں دکان بند کرتا دیکھ کر اٹھ گیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہی نماز پڑھنے مسجد چلا گیا تھا۔ واپسی پر وہ اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھ گئے تھے' جبکہ ارباب سست روی سے چلتا ہوا گھر آ

گیا۔
''کہاں تھے تم؟'' وہ تھانیدارنی بنی برآمدے میں نتھنے پھلائے کھڑی تھی۔
''کیوں بھئی۔'' ارباب صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ شام کے وقت کمروں میں بہت گھٹن ہو جاتی تھی' سو اسی لیے ماہ کامل سرشام ہی چارپائیاں بچھا کر پنکھا بھی نکال کر لگا دیتی تھی۔
''بیس چکر لگائے ہیں چھت کے۔ اوپر آ جا کر میری ٹانگیں دکھ گئی ہیں۔'' وہ بھنا کر چلتی ہوئی صحن میں آ گئی۔
''میں نے ادھر ہی تو واپس آنا تھا ناں۔ چاہے جتنی مرضی بھی باہر رہتا۔'' ارباب کا لہجہ سادہ سا تھا تاہم وہ اپنی مرضی کے معنی میں خودبخود بات کو بدل گئی۔
''وہ تو مجھے یقین ہے۔ تم لوٹ کر ادھر ہی آؤ گے۔ تمہاری دوائی کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' وہ گولیاں اس کی طرف بڑھا کر بولی۔
''پلیز ماہے! مجھے یہ رنگ برنگی گولیاں نہیں کھانا۔'' وہ بدک کر دور ہٹ گیا۔ اب تو دوائیوں کی خوشبو دماغ میں سما گئی تھی۔ نام سنتے ہی ابکائی آنے لگتی۔
''آرام سے دوائی کھا لو' ورنہ آج بھوکا رہنا پڑے گا۔'' وہ تو اپنے ہی دھیان میں گم تھی' جب ارباب ایک دم پھر سے گویا ٹھٹک گیا۔ چہرے کی رنگت یک لخت متغیر ہو گئی تھی۔ ایک بازگشت ہوا کے دوش پر لہراتی پھر سے سنائی دی تھی۔ وہ بمشکل سوچوں اور خیالوں سے پیچھا چھڑاتا ہوا بولا۔
''مجھے بھوکا رکھ کر کیوں گناہ گار ہوتی ہو۔ کیا تمہیں مہمانوں کے حقوق کے بارے میں نہیں پتا؟ ساری رات میری انتڑیاں تمہیں بددعائیں دیں گی۔''
''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مہمان صرف تین دن کا ہوتا ہے۔'' اس نے ناک چڑھا کر کہا۔
''اور تین دن کے بعد بلائے جان بن جاتا ہے۔'' ارباب خوامخواہ اداس ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔
''جی نہیں' بلائے جان کیوں' اگر کوئی مہمان زیادہ عرصہ رہے تو وہ گھر کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ جیسے کہ تم۔'' اس نے فوراً اسے ٹوک دیا تھا۔ ''اگر دل کا مہمان بن جائے تو پھر بھلا کیا بنتا ہے؟'' ماہے کی آنکھیں ایک دم چمکنے لگیں۔
''تم ......'' وہ لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔
''تم ماہے! کیوں مجھے سب کی نظر میں گرا دینا چاہتی ہو؟ کیوں مجھے رسوا کرنا چاہتی ہو؟ اللہ کا واسطہ ہے تمہیں۔ میں ایک زخمی دل کا مالک ہوں۔ مجھے مزید زخم زخم نہ کرو۔'' وہ گویا تھک کر رہ گیا۔
''مجھے تمہارا دل ہر حال میں قبول ہے۔''
''ماہے!'' ارباب وحشت زدہ رہ گیا تھا۔ ''تم فاتح کا دل دکھاؤ گی؟''

نجانے کتنا وقت ہو چکا تھا۔ باتوں کے دوران انہیں خبر تک نہیں ہوئی تھی۔ رات آنگن میں اتر آئی تھی اور ماہے ابھی تک چھوٹی سی کاغذ کی پڑیا کو ہاتھ میں دبائے بیٹھی تھی۔ یوں ہی بے سبب نظر دروازے کی طرف اٹھی تھی۔ ارباب نے بھی اس کی نظر کے تعاقب میں دیکھا تھا۔ بس لحہ بھر کو یوں محسوس ہوا تھا' گویا ایک سایہ ہو' جو چپکے سے دروازے کا کواڑ کھول کر باہر نکل گیا ہو۔

''گھر میں کوئی آیا تھا؟'' ارباب اب ماہ کامل سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں' مسافر تھا پلٹ گیا ہے۔'' وہ مطمئن اور پر سکون تھی۔

''مگر کیوں؟'' ارباب کچھ بے چین ہو اٹھا۔

''یہ جگہ اس مسافر کی منزل نہیں تھی۔ وہ کسی اور کی منزل پر کیوں آ کر ٹھہرتا۔''

''میری ماں نے مجھے زہریلا دودھ نہیں پلایا تھا جو میں کسی مخلص کی محبت کو ڈس لوں۔ اپنے جذبوں کو لگام دو' ماہ کامل! اپنے قدموں کو اسی مقام پر روک لو۔''

''ارباب! میری محبت کو یوں بے مول نہ کرو۔'' وہ سسک اٹھی۔

ارباب کا دل چاہا' وہ یہاں سے دور بہت دور بھاگ جائے یا اس آدم خور نہر میں چھلانگ لگا کر جان دے دے' جس نہر کا لقمہ بننے سے فاتح نے اسے بچا لیا تھا۔

''میں کیا کروں ارباب!'' ماہ کامل جیسے ہار کر بولی۔ اس نے دل پر اترتی قیامت کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ پل صراط پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''مجھے بھول جاؤ۔ میں کسی کی بھی منزل نہیں بن سکتا۔ یہ سوچ کر صبر کر لینا کہ کسی ارباب کا کبھی تمہارے گھر کی دہلیز پر سے گزر نہیں ہوا تھا۔ اپنی زندگی کا آغاز کرنا۔ دل کی ہر چوٹ بھلا کر۔''

وہ گہری شام کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ ایسی ہی ایک شام ماہ کامل کے دل پر اتر آئی تھی۔

✦❋✦

رات بھر ہونے والی بارش نے موسم کی شدت کو کم کر دیا تھا۔ اب دھوپ میں اس قدر تپش نہیں رہی تھی۔ پرندے بھی خاصے خوشگوار موڈ میں گنگناتے پھر رہے تھے۔ آج پھر ایک کٹھورا اپنی تیز دھار چونچ سے درخت کے تنے میں سوراخ کرنے کی کوشش میں بے حال ہو رہا تھا۔ تیتر اور بٹیر ایک ہی پنجرے میں رہائش پذیر تھے...... آج کل دونوں میں پکی صلح چل رہی تھی۔

انار کی شاخوں کے ڈھیروں نازک پتے چڑیوں کے پھدکنے کی وجہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔ کیاریوں میں بے شمار پھل اور پھول' پتوں کا ڈھیر لگ چکا تھا۔

ماہ کامل نے سویرے سویرے چاٹی میں مدھانی لگا کر جھاڑو اٹھا لی تھی۔ بے حد سلیقے سے پورا صحن صاف ہوتا جا رہا تھا۔

وہ جھاڑو اٹھا کر پتے سمیٹنے لگی تھی جب دروازہ کھول کر نجانے کون چپکے سے اندر داخل ہوا تھا۔ کامل نے مڑ کر دیکھا تو پھر ٹھٹک کر رہ گئی۔

''تم ...... اچانک بغیر بتائے؟'' وہ بے ساختہ امڈ نے والی خوشی کو چھپا کر بولی تھی۔

''میرا گھر ہے' جب چاہے آؤں۔ تمہیں اس سے کیا۔'' فاتح کا لہجہ سخت کٹیلا اور اجنبی سا تھا۔ وہ کچھ چونک کر فاتح کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں نے کب کہا' یہ تمہارا گھر نہیں۔'' وہ بھی برا مان کر بولی تھی۔ ''اتنی سویرے سویرے پہنچ گئے ہو نا۔ اسی لیے کچھ پوچھ لیا۔'' اس نے گویا وضاحت کی تھی۔

''سویرے پہنچوں یا شام ڈھلے' تمہیں اس سے کیا غرض۔'' فاتح کس قدر روکھا بول رہا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ بھلا آج تک فاتح نے کبھی اس سے اتنے کٹھور پن سے بات کی تھی؟

''کیوں غرض نہیں۔'' ہمیشہ کی طرح ماہ کامل بھڑک اٹھی۔ ''کیا آج سے پہلے کبھی تمہارے لیے تردد نہیں کیا۔ ساری ساری رات جاگ جاگ کر پڑھتے تھے تم اور ہر دس منٹ بعد تمہاری چائے کے لیے پکار اٹھتی تھی۔ بھلا اس وقت کون تردد کرتا تھا؟''

''تب تم صرف میری ماہے تھیں۔ مگر اب میری نہیں رہیں۔ اب تم مکمل چاند ہو ماہے۔''

''فاتح ......'' ماہ کامل کا دل گویا اتھاہ گہرائیوں میں گرنے لگا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ فاتح اوائل عمر سے ہی اس کی محبت میں مبتلا رہا ہے اور صرف تین چار ماہ پہلے تک وہ بھی تو فاتح کی محبت پر دل ہی دل میں مسرور اور مغرور رہتی تھی۔

فاتح عقیق' جو اس کے پورے خاندان میں سب سے الگ اور سب سے جدا تھا۔ جسے دیکھ دیکھ کر لڑکیاں ماہ کامل کے نصیب پر رشک کرتی تھیں۔ اگر بیچ میں ارباب نامی وہ اجنبی نہ آتا تو آج اس کی خوشیاں ہر لحاظ سے مکمل ہو جاتا تھیں۔

فاتح دو دن کی چھٹی کے لیے آیا تھا' مگر سارا سارا دن گھر سے باہر ہی رہتا یا پھر ابا کے پاس دکان میں بیٹھ جاتا۔ اباب اور فاتح کے درمیان آج کل لمبی لمبی بحثیں ہو رہی تھیں۔ وہ دراصل ان دونوں کو لینے کے لیے آیا تھا' مگر بابا تھے کہ مان ہی نہیں رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ فاتح اور ماہ کامل کی شادی کر دیں' پھر ماہ کو بے شک فاتح اپنے ساتھ لے جائے۔

''پتر! ایک تناور درخت کی جڑوں کو کاٹ دیا جائے تو وہ کب تک ہرا بھرا رہ سکے گا۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ میں اپنے لوگوں میں مطمئن ہوں۔'' وہ ہل کے پھلکے کو جوڑ لگانے میں مصروف تھے۔

''اور میں بھی تو شہر میں غیر مطمئن ہوں نا ...... ہر وقت آپ کی اور ماہے کی فکر لگی رہتی ہے۔'' عجیب سا اضطراب اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔

''تو پتر! اپنی اس فکر کو دور کر لو نا۔'' اب وہ پیچ کس سے رنگ آلود بھاری پیچ کو پورے زور کے ساتھ فٹ کر کے لگا رہے تھے۔ ان کا پورا وجود پسینہ پسینہ تھا۔

''بھلا کیسے کر لوں؟ آپ مانتے بھی تو نہیں۔'' وہ کچی زمین کو جوتے کی ٹوہ سے کھرچ رہا تھا۔ وہ شہر جانے کے لیے رضا مند نہیں تھے سو وہ اسی حساب سے کہہ رہا تھا۔

''نہ ماننے والی بھلا کیا بات ہوئی؟'' ان کی آنکھوں میں بڑے مشفق سے رنگ ابھرے۔ ''نئے چاند کی کوئی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' فاتح کچھ حیران ہوا۔

''میں تمہارا چاچا ہی نہیں' باپ بھی تو ہوں۔ لڑکے کی طرف کے معاملات بھی تو خود ہی دیکھنے ہیں۔'' انہوں نے مونڈھے پر رکھے صافے سے چہرہ اور ہاتھ پونچھے۔

''چاچا جی! ایک بات کہنا تھی۔'' وہ ایک دم سے بے قرار سا ہو گیا۔

''بولو پتر......!'' وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر لوہے کے پایوں والے پیڑے پر بیٹھ گئے تھے۔

''چاچا! اگر آپ ایک دفعہ پھر سے ماہے سے پوچھ لیں تو کیا یہ بہتر نہیں؟'' اس نے بہت جھجکتے ہوئے کہہ دیا تھا۔

''ماہے سے کیا پوچھنا ...... بات تو طے ہے۔ بس سادگی سے نکاح کریں گے۔'' وہ گویا سب کچھ طے کر چکے تھے۔ وہ جو چائے کی پیالیاں اٹھائے دکان کی طرف آ رہی تھی' ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔

''پھر بھی چاچا جی! ایک دفعہ آپ پوچھ تو لیں ...... کیا پتا' اسے میرا ساتھ منظور نہ ہو۔'' فاتح نے عجیب سے سلگتے لہجے میں کہا تھا۔ ماہے کا پورا وجود گویا سنسنا اٹھا۔

''نہ پتر! ہماری اولاد نافرمان نہیں ہے۔ تم اور ماہے تو میرا مان ہو۔ تمہیں کیا ماہے کی طرف سے کوئی غلط فہمی لاحق ہوئی ہے؟'' ان کی زیرک نظریں فاتح کے اردگرد گھوم رہی تھیں۔ فاتح اپنے اندرونی تاثرات چھپا گیا تھا۔

''ایسی بات نہیں۔'' وہ بھلا ان سے کس انداز میں اپنے خدشات کا اظہار کر سکتا تھا۔

اور ادھر ماہ کامل گویا سن کھڑی رہ گئی تھی۔

''تم اور ماہے میرا مان ہو اور مجھے یقین ہے کہ میرے بچے میرا مان ہرگز نہیں توڑیں گے۔'' بابا کی آواز اس کے کانوں میں ہی نہیں' اس کے دل و دماغ میں گویا کھب کر رہ گئی تھی۔

✦❋✦

گلابی سی سلونی سلونی شام کا منظر تھا۔ ماہ کامل صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کرنے کے بعد چارپائیاں بچھا رہی تھی جب ارباب کمرے سے باہر نکلا۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ ماہ کامل اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''کہاں جارہے ہو؟'' اس نے غیر ارادتاً ہی پوچھ لیا تھا۔
''واپس۔'' وہ مختصر بولا۔
''اتنی جلدی؟'' آن کی آن میں مایوسیوں کے بادل اس کے اردگرد چھا گئے تھے۔
''واپس آؤ گے؟''
''نہیں۔'' اس کا انداز بڑا اجنبی قسم کا تھا۔
''میری محبت کی خاطر بھی نہیں۔''
''محبت۔'' وہ ایک دم تلخ ہو گیا۔ ''محبت' بھلا کیسی محبت! وقتی انسیت یا ہمدردی کو محبت کا نام مت دو۔ محبت دھیرے دھیرے' لمحہ بہ لمحہ اپنا اثر دکھاتی ہے۔ پانی کے اوپر موجود جھاگ جیسی محبت' محبت نہیں بلکہ وقتی کشش ہوتی ہے۔''
''تو پھر تم ہی بتادو' محبت کیا ہے؟'' وہ سلگ کر بول اٹھی۔
''محبت وہ ہے جو فاتح عقیق نے تم سے کی ہے۔ بے لوث' بغیر کسی صلے کے۔ یادرکھنا ماہ کامل! جو ہاتھ آئی نعمت کو ٹھکرا دیتا ہے' وہ کبھی بامراد نہیں ہوسکتا۔''
''محبت نے تمہیں بامراد کیوں نہیں کیا؟'' اس کے چہرے کا کرب ماہ کامل کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔
''محبت نے تو مجھے بامراد کیا تھا' مجھے میرے اپنوں نے نامراد کیا ہے۔ مگر وہ اپنے تھے کہاں؟'' اس کے اندر گویا آگ کے بھانبھڑ جل اٹھے۔
''تم کون ہو ارباب!'' اب وہ بہت نرمی سے پوچھ رہی تھی۔ شاید پانی کے اوپر اٹھی جھاگ منتشر ہو کر بیٹھنے کے قریب تھی یا پھر وہ اس کے چلے جانے کی حقیقت کو تسلیم کر چکی تھی' مگر جو بھی تھا۔ دل عجیب سی خاموشی کی بکل میں دبک کر رہ گیا تھا۔
''میں مبرم ارباب نیازی ہوں ......'' ایک زخم خوردہ انسان۔ جتنے زخم میرے وجود پر دیکھ کر تمہیں مجھ سے ہمدردی نما محبت ہو گئی تھی۔ اتنے ہی گھاؤ میرے دل پر لگے ہیں۔ میرے ہر زخم کے پیچھے ایک داستان ہے۔ مگر ایسے تم بات کو کیسے سمجھو گی۔ چلو' تمہیں شروع سے بتاتا ہوں۔ ایک تھا مبرم اور ایک تھی ویرا۔ مبرم اور ویرا کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی تھی۔ پھر پتا ہے کیا ہوا؟''
وہ دھیرے دھیرے ایک ایک پرت کو کھول رہا تھا۔ ماہ کامل ہمہ تن گوش تھی۔ اس داستان کو سننے کے لیے تو وہ کب سے بے چین تھی' منتظر تھی۔
''میں یعنی مبرم ارباب نجانے کب سے ویرا کا اسیر تھا۔ شاید اس وقت سے جب پہلے پہل میں نے ویرا کو پاپا جی کے گھر میں دیکھا تھا...... اس کی ذہانت' اس کا اعتماد مجھے ہمیشہ متاثر کرتا تھا اور میں اس کے متاثرین میں سرفہرست تھا۔''

مبرم نے اسے اپنی اور ویرا کی ساری کہانی سنائی تھی اور کہانی کے اس موڑ پر اس کی آنکھوں میں چراغ جل رہے تھے۔

"ویرا نے میری زندگی کو ہر رنگ سے سجا دیا تھا۔ہم ایک دوسرے کی ہمراہی میں بہت خوش تھے۔مگر کچھ لوگ ہمیں خوش دیکھ کر خوش نہیں تھے۔ پاپا جی کی وفات کے بعد پتا چلا کہ وہ ویرا کے نام کیا کچھ چھوڑ کر گئے ہیں۔

بابا جی وہ گھر جسے وہ ہمیشہ کرائے کا گھر کہتے رہے تھے۔ کروڑوں کی مالیت کا تھا۔ بے شمار بینک بیلنس اور زیورات تھے' مگر ویرا ان باتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔

پھر ایک رات اماں نے مجھے بتایا تھا کہ ابو گوشی کی شادی کہیں اور طے کر رہے ہیں۔ اماں نے مجھ سے کہا۔ میں گھر چھوڑ دوں اور گوشی کو بھی ساتھ لے جاؤں۔

میں ویرا اور گوشی ...... ہم رات کے اندھیرے میں گھر چھوڑ آئے تھے۔ ہمارا پہلا ٹھکانہ ماموں کا گھر تھا۔ یہیں گوشی اور اویس کا نکاح بھی ہو گیا تھا اور اس سے تین ماہ بعد مجھے خبر ملی کہ میری بہنیں ثمرہ اور سمن' سانہ کے بھی نکاح ہو گئے ہیں۔ ابو نے آناً فاناً انہیں رخصت کر دیا تھا۔

اماں بھی شاید بیٹیوں کی رخصتی تک کا انتظار کر رہی تھیں۔ ایک رات گھر میں اچانک آگ لگنے سے وہ بری طرح جھلس کر ختم ہو گئیں۔ ان کا چہرہ' جسم خاک ہو گیا تھا۔

ابو نے مجھے اماں کی چارپائی کو کاندھا بھی نہیں دینے دیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے مجھے نماز جنازہ بھی نہیں پڑھنے دی۔

ان دنوں مجھے لگتا تھا کہ غم کی شدت سے میرا دل پھٹ جائے گا۔ اگر ویرا نہ ہوتی تو شاید میں مر ہی جاتا۔ یہ ویرا کا حوصلہ اور ہمت تھی کہ وہ بھری پنچائیت اور فاتحہ کی مجلس میں ابو کے گریبان تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے کئی برادریوں کے لوگوں کے سامنے ابو کے چہرے کو بے نقاب کر دیا تھا۔

"یہ باپ نہیں ایک ناگ ہے۔ جو اپنی اولاد کو خود پیدا کرتا ہے اور خود ہی ڈس لیتا ہے۔ میں نہیں مانتی کہ یہ مبرم کا باپ ہو سکتا ہے۔ کوئی باپ اتنا ظالم اور خود غرض نہیں ہو سکتا کہ اپنی "میں" کو بچانے کی خاطر اولاد کے سینے کو چھلنی کر دے۔ یہ آدم خور ہے۔ یہ ظالم اور جابر ہے یہ آدمی خود غرض اور لالچی ہے۔ پہلے اپنے سگے بھائی کو نگل گیا' پھر بیوی اور اب اکلوتے بیٹے کو مار دینے کے چکر میں ہے۔"

ویرا کے الفاظ نے ایک نہ ختم ہونے والی اور نہ بجھنے والی آگ کو بھڑکا دیا تھا۔ اوپر سے ویرا کا ایک اور فیصلہ'

"ہم اسی گھر میں رہیں گے۔ اس گھر میں میرا بھی حصہ ہے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔" وہ ابو کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے بے خوف اور نڈر تھی۔

ابو کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہو کر سمانہ نے ویرا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''تم بھایا کو لے کر یہاں سے چلی جاؤ ویرا! تم دونوں کی جان کو خطرہ ہے۔ تم ابو کو نہیں جانتیں۔ اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لئے وہ ہر حد سے گزر جائیں گے۔''

''بزدلوں کی طرح کیوں بھاگ جائیں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے کہ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ ابھی تو منشی اور پٹواری کو بلوایا ہے میں نے ...... پرانی فائلیں اور کاغذ کھلیں گے۔ دادا جی کی وصیت بھی پڑھوں گی تاکہ مجھے بھی پتہ چل سکے کہ میرے اور مبرم کے نام کیا کچھ ہے؟'' اس کا فیصلہ گویا اٹل تھا اور میں بھی اگرچہ اس کا ہمنوا ضرور تھا' مگر فی الحال اس گھٹن سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر ویرا میری کوئی بات نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''تم کولڈ سٹور کے لیے جو مشینری لے کر آنا چاہتے ہو لے آؤ' میں اتنے دن تک یہیں رہوں گی۔'' مجھے کراچی تو جانا ہی تھا۔ سو میں اگلے دن ہی چلا بھی گیا۔ اسی رات ڈیڑھ بجے ویرا نے مجھے بتایا تھا کہ ابو اپنی دوسری بیوی اور بچوں کو گھر لے آئے ہیں۔

یہاں سے ایک اور تلخ ترین دور کا آغاز ہو گیا تھا۔ ویرا اور نگینہ دونوں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر پاتی تھیں۔ نگینہ نے آتے کے ساتھ ہی پورے گھر پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔

سمانہ اور ثمرہ کے میکے آنے پر پابندی لگ گئی تھی۔ نگینہ نہیں چاہتی تھی کہ ویرا کے ساتھ کسی کا بھی کوئی تعلق قائم ہو سکے اور نہ ہی کوئی ویرا سے مل پائے۔

پھر ایک دن منشی اسلم نے نجانے کیسے اور کس طرح سے ویرا کو پیغام دے کر گھر سے باہر ملنے کے لیے کہا تھا۔ منشی اسلم اسے کچھ بتانا چاہتا تھا۔ کوئی خاص بات یا راز۔

یہاں ویرا نے ایک غلطی کی تھی۔ وہ بغیر مجھے بتائے یا میرا انتظار کیے' منشی اسلم کی بات سننے چلی گئی تھی اور پھر کبھی واپس نہیں آئی۔''

مبرم کی آنکھ سے کئی ستارے ٹوٹ کے بکھر گئے تھے۔ وہ کچھ پل کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ تبھی تو ماہ کامل بے چین ہو کر بول اٹھی۔

''پھر کیا ہوا ارباب!''

اس کے دکھ نے ماہے کے دل پر گویا پنجہ مار دیا تھا۔ ایک دم ویرا اور مبرم کی جدائی نے اسے سر تا پا آنسو بنا دیا۔ اس کے دل میں وہ ہی ہمدردی ٹھاٹھیں مارنے لگی تھی' جسے وہ محبت کا نام دے چکی تھی' مگر وہ سچ مچ ہمدردی تھی۔ انسانیت کے درد میں لپٹی محبت۔ وہ جو تیتر اور بٹیر کو زخمی حالت میں دیکھ کر سینے سے لگائے گھر لے آتی تھی۔

''ویرا کی گمشدگی کی اطلاع سنتے ہی میں واپس آ گیا۔ مارا مارا اسے ڈھونڈتا رہا۔ ہر جگہ' ہر سو پاگلوں کی

طرح مگر کہیں اس کا نشان نہیں ملا تھا۔ اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا۔ پورے گاؤں میں ویرا کے بھاگ جانے کی خبر نشر ہو گئی تھی۔" وہ گویا تھک کر ٹوٹ گیا تھا۔

"مگر وہ بھاگی کس کے ساتھ؟ یہ تو سراسر ایک جھوٹی کہانی لگتی ہے۔ تم نے تحقیق کیوں نہیں کی اور وہ منشی اسلم کہاں گیا؟" مبرم کے خاموش ہوتے ہی ماہ کامل بے قراری سے گویا ہوئی۔

"پورے نو مہینے ہو چکے ہیں۔ جگہ جگہ اسے ڈھونڈ رہا ہوں' مگر منشی اسلم کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ مجھے اطلاع ملی تھی کہ منشی اسلم اسی گاؤں میں رہائش پذیر ہے۔ میرا انتقام مجھے یہاں لے آیا تھا۔ مگر یہاں آنا بھی بے سود رہا ہے۔ میں منشی اسلم کو کتے کی موت مارنا چاہتا تھا۔"

"بے سود نہیں' میرے دوست! منشی اسلم کے بارے میں تمہیں میں بتاتا ہوں۔" فاتح نجانے کب اس کے برابر آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کا دباؤ مبرم نے اپنے کندھے پر محسوس کر کے ذرا سا گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"تم کیسے جانتے ہو منشی اسلم کو؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ یہاں ایک بابا جی ہوا کرتے تھے۔ ذات کے میراثی تھے۔ شادی بیاہ میں گیت گاتے اور دف بجاتے تھے۔ ان ہی سے میں نے بانسری بجانا سیکھی تھی۔ وہ بابا جی منشی اسلم کے نام سے جانے جاتے تھے۔ بہت عرصہ نیاز پور کے زمیندار ارباب نیازی کی زمینوں کے منشی رہے تھے۔ پھر ان کے مر جانے کے بعد واپس اپنے آبائی گاؤں یعنی یہاں آ گئے تھے۔" فاتح نے مبرم کو حیران ہی تو کر دیا تھا۔

"ارباب نیازی؟" وہ الجھ کر رہ گیا۔

"نیاز پور کے ایک جاگیردار تھے۔" فاتح شاید ارباب نیازی کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا تھا۔

"منشی اسلم اگر مر چکے ہیں تو پھر ویرا کا بھلا کیسے پتا چلے گا۔ میں نے جو منشی کو ڈھونڈنے کے لیے اتنی ریاضت کی تھی' سب رائیگاں چلی گئی؟" مبرم کو یوں محسوس ہونے لگا تھا۔ گویا وہ کسی بھاری بوجھ کے نیچے دب کر رہ گیا ہے۔

"ویرا کا پتہ چل گیا ہے میرے دوست! تم فکر مت کرو۔ جس کام میں فاتح عقیق ہاتھ ڈال لے' اسے پورا کر کے ہی دم لیتا ہے۔" اس کا ہاتھ ابھی تک مبرم کے کندھے پر تھا۔ مبرم اب کے پورا اس کی طرف گھوم گیا۔ "تم ان دنوں کہاں تعینات ہو؟"

"میں تمہارے علاقے کی تحصیل کا ایس پی ہوں۔ یہ چند دن پہلے کی بات ہے۔ جب مجھے ایک فون کال موصول ہوئی تھی۔ یہ کال نیاز پور کے کھاتے پیتے گھرانے کی ایک عورت نے کی تھی۔ اس عورت کا نام نگینہ تھا اور وہ اپنے شوہر پر کچھ الزامات لگا رہی تھی۔ نگینہ نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر ذہنی مریض ہے۔ وہ اس کی بیٹیوں پر شدید قسم کا تشدد کرتا ہے اور نگینہ کو بھی زدوکوب کیا جاتا ہے۔ سو وہ قانون سے تحفظ چاہتی تھی کہ اس کی جان کو

شدید قسم کا خطرہ لاحق تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس عورت نے دوبارہ کال کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جس گھر میں وہ قیام پذیر ہے' اس کے نیچے ایک خفیہ تہہ خانہ بنایا گیا ہے' جہاں سے ایک عورت کے چیخنے کی آواز آتی ہے۔ یہ تہہ خانہ بہت قدیم دور کا بنا ہوا ہے اور اس کے دروازے بہت بھاری اور دیمک زدہ ہیں۔ میں نے فوری ایکشن لے کر وہاں چھاپہ مارا تھا۔ وہاں ایک نہیں دو عورتیں قید تھیں۔''

فاتح جو بتا رہا تھا مبرم کا دماغ گویا بھک سے اڑ گیا۔

''دو عورتیں؟'' اس کے لبوں سے سرسراہٹ نما آواز نکلی۔

''ہاں دو عورتیں ...... ایک تمہاری ماں میراں بیگم اور دوسری عورت تمہاری بیوی۔''

✦❋✦

پورے نو ماہ بعد وہ اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ مبرم کا دل گویا بھر بھر آ رہا تھا اور ویرا کے آنسوؤں کا سیلاب اسے بہائے لے جا رہا تھا۔

''بس کرو، میری جان!'' مبرم نے بمشکل اسے چپ کروایا تھا۔ وہ اس وقت اپنے ماموں کے گھر میں تھا۔ اویس اور گوشی اماں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کی ذہنی حالت بھی بے حد ابتر تھی۔ پورے نو ماہ ایک تاریک کمرے کی قید میں گزارے تھے۔ ابھی تک تو وہ چہروں اور آوازوں سے بھی مانوس نہیں ہو پا رہی تھیں۔ بس روئے چلی جا رہی تھیں۔

''اگر ویرا نہ ہوتی میرے ساتھ تو میری لاش تک گل سڑ جانی تھی۔ گھٹ گھٹ کر مر جانا تھا میں نے۔ ویرا کے حوصلے اور ہمت نے مجھے زندگی بخشی ہوئی تھی ورنہ میں کب کی آنکھیں موند چکی ہوتی۔''

گوشی اور اویس انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ اب قدرے ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔

ویرا اور مبرم اس وقت تنہا تھے۔ وہ تنہائی میں مبرم کو بہت کچھ بتانا چاہتی تھی۔ وہ سب کچھ جو منشی اسلم نے اسے بتا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے قید میں ڈال دیا گیا...... اور منشی کو دھمکیاں دے کر اس کا منہ بند کروا دیا گیا۔ وہ مبرم کے بازو پر سر رکھے بولنے لگی۔

''میں کبھی بھی اس راز سے پردہ نہ اٹھاتی جسے آج تک چاچی بھی تمہیں بتانے کا حوصلہ نہیں پا سکیں۔'' وہ سوچ سوچ کر اور تول تول کر بول رہی تھی۔

''ایسی کیا بات ہے؟''

''پاپا اور چاچا چچی سگے بھائی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کس قدر مختلف تھے۔ شاید یہ فرق تعلیم کی وجہ سے زیادہ محسوس ہوتا تھا۔ چاچو ان پڑھ تھے اور پاپا اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ دیکھا جائے تو پاپا کی پرسنالٹی چاچو کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ مگر پھر بھی ہر کوئی پاپا کا شیدائی تھا۔

انہی میں میری امی وجیہہ بھی شامل تھیں چونکہ پاپا اور امی دونوں آپس میں کزنز بھی تھے۔ سو ان کے درمیان خاصی بے تکلفی بھی قائم ہو گئی تھی۔ پاپا اور امی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ چاچا کی بھی خواہش تھی کہ وہ امی سے شادی کر لیں، مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ امی اور پاپا کی شادی ہو گئی تھی اور شادی کے بعد پاپا کی

پریکٹس بھی خوب چل پڑی۔ یوں سمجھو' پاپا کے لیے کامیابیوں کے دروازے کھل گئے تھے۔

''پاپا کی خوشحال زندگی چاچو کو ہمیشہ حسد میں مبتلا کر دیتی تھی۔ چاچو' پاپا کی برابری کرنا چاہتے تھے' مگر ایسا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔

بعض لوگ فطرتاً حاسد ہوتے ہیں۔ اپنے بہن بھائیوں تک سے جلنے لگتے ہیں۔ ان کی پسندیدہ چیز کو چھین لینے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ چاچو کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ تھا۔ وہ خوب صورت تھے اور بچپن میں والدین سے بے تحاشا محبت وصول کرتے رہے تھے۔ چاچو کے مقابلے میں پاپا کو ذرا کم ہی اہمیت ملتی تھی۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ پاپا اپنی اچھی عادت اور ذہانت کی وجہ سے سب کے دلوں کو تسخیر کرتے رہے جبکہ چاچو کہیں پس پردہ چلے گئے۔ یہیں سے ان کی ذہنی تباہی کی ابتدا ہوئی تھی۔

پاپا کی شادی کے بعد چاچو اور بھی ان سے متنفر ہو گئے تھے۔ مگر اپنی منافقانہ فطرت کی وجہ سے انہوں نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

چاچو کے پاس تعلیم تو تھی نہیں اور پیسہ بھی خاص کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے حصے کی زمین بیچ کر کاروبار شروع کیا' مگر کاروبار میں سارا پیسہ ضائع ہو گیا۔

مالی حالات جب بے حد خراب ہو گئے تب دادا نے اپنے بھتیجے ارباب کی بیوہ سے ان کی مرضی کے بغیر ہی چاچا کی شادی کر دی۔ وہ میراں بیگم سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے' مگر باپ کے سامنے بے بس ہو گئے۔

میراں بیگم اپنے ساتھ جہیز میں اپنے پہلے شوہر کی بے شمار جائیداد کے ساتھ ایک بیٹا بھی لائی تھیں۔

ان جاگیروں اور زمینوں کو حاصل کر کے وقتی طور پر چاچو بہل گئے تھے' مگر دل ہی دل میں نفرت کا ناسور پلتا رہا تھا۔

پاپا اور امی سے نفرت' چاچی سے نفرت' اپنی تینوں بیٹیوں سے بیزاری کے ساتھ ساتھ مبرم ارباب نیازی سے بھی ان کی نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

وہ ہر صورت میں تمہیں دبائے رکھنا چاہتے تھے تاکہ کبھی بھی تم جان نہ سکو کہ یہ تمام جائیداد تمہارے حقیقی باپ کی ہے۔ وہ تمہاری خواہشوں اور تمناؤں کو کچل کر اپنے جیسا بنا دینا چاہتے تھے۔ نجانے یہ انتقام کی کون سی قسم تھی۔ مگر جب ان کی پلاننگ ناکام ہو گئی۔ پاپا نے ہمارا نکاح کر دیا تو وہ مزید مشتعل ہو گئے۔ جس حکمرانی کی انہیں عادت ہو چکی تھی اور جس رعایا پر وہ حکومت کر رہے تھے اس کی بغاوت نے انہیں بہت گہری چوٹ لگا دی تھی۔

سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ تمہاری نہ تو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی گوشی سے۔ ان کا بنیادی مقصد صرف میری اور گوشی کی جائیداد حاصل کرنا تھا۔

پاپا کے بعد میری جائیداد کے سارے کاغذات ان کے ہاتھ لگ چکے تھے۔ اب وہ اپنی دوسری پلاننگ

پر غور کر رہے تھے' یعنی تمہاری دوسری شادی گوشی سے کروانا چاہتے تھے۔ یہاں پھر سے انہیں مات ہوئی تھی۔ گوشی کا نکاح تمہارے توسط سے اویس سے کیا ہوا' ان کے اندر شعلے بھڑک اٹھے۔ وہ ہر صورت تم سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔

چاچو کو جب میراں چاچی سے خدشہ لاحق ہو گیا کہ یہ تمہیں کچھ بتا نہ دیں تو انہوں نے چاچی کو تہہ خانے میں ڈال دیا اور ان کے کمرے میں آگ لگا کر ان کی موت کی خبر پھیلا دی۔ نہ جانے کون بدنصیب تھی جو ان کے اس ظلم کا نشانہ بنی۔ اسی دوران میرا منشی سے رابطہ ہو گیا تھا۔ منشی نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ تمہاری زمین' جائیداد اور اثاثے ...... میرے اندر اس دھوکے اور فریب کی وجہ سے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ میری جلد بازی چاچو کو چوکنا کر گئی۔ انہوں نے چاچی کو لوگوں کی نظروں میں مار دینے کے بعد مجھے بھی قید خانے میں ڈال کر ہر طرف نشر کروا دیا کہ میں بھاگ گئی ہوں۔

ان نو مہینوں میں بے تحاشا غور و فکر کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ چاچا ذہنی بیماری کا شکار تھے۔ حسد کے جذبے نے کبھی انہیں مطمئن نہیں رہنے دیا تھا۔ دوسروں کی خوشیوں سے جل جل کر وہ اپنے گھر کو آگ لگاتے رہے تھے۔

دوسری شادی بھی انہیں آسودہ حال نہیں کر سکی تھی۔ دراصل وہ مطمئن ہو جانے والے لوگوں میں سے تھے ہی نہیں۔ حسد' بغض اور نفرت نے انہیں اپنے تمام اپنوں سے دور کر دیا تھا۔

آج عزیز نیازی ڈیرے کے ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ نگینہ ان کی ذہنی حالت کے پیش نظر گھر کے دروازے ان کے لیے کبھی نہیں کھولتی۔ ملازمین ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ چھ بچوں میں سے کسی کے پاس فرصت نہیں ہے کہ وہ دو گھڑی کے لیے ہی سہی باپ کو دیکھ آئیں۔''

''اس تمام داستان میں قابل غور اور باعث مسرت چیز' تمہیں پتا ہے کیا ہے؟'' وہ اس کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو چوم رہا تھا۔

''نہیں پتا۔'' وہ اس کی پیش قدمی پر قدرے بدکی۔ اتنی سنجیدہ گفتگو کے اختتام پر مبرم کے موڈ کی شگفتگی ویرا کو مصنوعی ناراضی کے اظہار پر مجبور کر گئی۔

''ہمارا ملن ...... یوں لگتا ہے آج ہی شب عروس ہے۔ دیکھو تو ستاروں کی بارات اتر آئی ہے۔ گیتوں کی دھنیں سنائی دے رہی ہیں ...... اور کہیں دور بہت دور ایک چھوٹے سے گاؤں کی چھت پر بیٹھا فاتح عقیق بانسری بجا رہا ہے اور اس کے قریب ماہ کامل کھڑی ہے۔ کچھ روٹھی روٹھی سی۔ بانسری کی آواز نے اسے کچی نیند سے جگا دیا ہے نا...... مگر فاتح عقیق آج ماہ کامل کی بات پر توجہ نہیں دے رہا۔ آج وہ ہم دونوں کے لیے ملن کا کوئی سر' کوئی گیت' کوئی دھن چھیڑ رہا ہے۔ دیکھو تو ویرا! خوشبو کی کلیاں جابجا بکھر گئی ہیں۔ سرخ گلابوں کے موسم خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ گلابی شامیں سایہ فگن ہیں۔ آؤ' دریچہ کھول کر جدائیوں کی اس گھٹن کو باہر نکال

دیتے ہیں اور کیا آج ہم پر لازم نہیں کہ سجدہ شکر بجالائیں۔''

وہ اس کے ہاتھ تھامے' کھڑا ہو گیا تھا۔ ویرا نے اس کی تقلید میں قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔ سجدہ شکر تو ان پر واجب تھا ہی اور اپنے ملن کی خوشیوں میں وہ کسی اور کے ملن کی دعا کرنا نہیں بھولے تھے' کیونکہ خلوص' ایثار' پیار اور محبت کا یہی تقاضا تھا۔ ماہ کامل کی خدمت' میزبانی اور ہمدردی میں لپٹی وہ محبت اور فاتح عقیق کے خلوص اور یاری نے مبرم ارباب کو خلوص اور محبت کی ایک مالا میں پرو دیا تھا۔

اور آج پورے تین مہینے بعد وہ سب ماہ کامل اور فاتح عقیق کی شادی میں شرکت کی غرض سے جا رہے تھے۔

میراں بیگم' اویس' گوشی اور اس کی تینوں بہنیں ...... اور جب مبرم نے ایک خوب صورت موتیوں کی تھیلی کے منہ کو کھول کر ماہ کامل کی جھولی میں کچھ ڈالنا شروع کیا تو وہ دلہناپے کی پروا کیے بغیر چیخ اٹھی۔

''ارباب! یہ چیٹنگ ہے ہماری محبت اور خلوص کو واپس لوٹانا چاہتے ہو۔ وہ نہ قرض تھا نہ ادھار۔'' اس کی ناراضی کے جواب میں مبرم مسکرا دیا تھا۔

''یہ نہ قرض ہے نا ادھار'' اس نے ساری تھیلی کو اس کی جھولی میں الٹ دیا۔

''اس میں شامل ہے ہمارا ڈھیر سارا پیار۔ اس بے حد پیاری لڑکی کے لیے' جسے ہر زخمی انسان' سے محبت ہو جاتی ہے۔'' ویرا اس کے برابر بیٹھ رہی تھی۔

''اور اس محبت کا خمیازہ مجھ مسکین کو بھگتنا پڑتا ہے۔'' فاتح نے چہرے پر مصنوعی مسکینی طاری کر کے دہائی دی اور پوری محفل میں گویا ہنسی کے شگوفے کھل اٹھے تھے۔ رنگ و نور کی اس محفل میں ویرا اور مبرم نے ان دونوں کے لیے ڈھیر ساری خوشیوں کی دعا کی تھی اور آسمان کے سب سے روشن ستارے نے گویا ان کی ہاں میں ہاں ملا کر صدق دل سے آمین کہا۔

✦❃✦

ادھر مبرم ارباب نیاز پور کی زمینوں پر ہمیشہ کی طرح مضبوط قدموں سے چلتا تھا مگر اس کی چال میں اور قدموں کی دھمک میں تکبر کی جھلک تک نظر نہیں آتی تھی۔ وہ عام لوگوں کی بیٹھک میں بیٹھ کر ان کے مسائل سنتا تھا۔ ان کی پریشانیوں کو حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان کے لیے روزگار مہیا کرنے کے لیے ایک اور فروٹ فارم تعمیر کروا رہا تھا۔

وہ چاہتا تو بڑے طریقے کے ساتھ ان کی ہر زیادتی کا بدلہ عزیز نیازی کی حقیقی اولاد سے لے سکتا تھا' مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔

وہ چاہتا تو نگینہ اور اس کے بچوں کو جائیداد سے بھی بے دخل کر سکتا تھا۔ یہی سمجھتے ہوئے کہ عزیز نیازی ان پر جو کچھ لٹا چکے ہیں' بس وہ ہی کافی ہے' مگر اس کے باوجود اس نے تحمل' صبر اور رحم کو دل سے جانے نہیں دیا۔

اپنے ذاتی اثاثوں کی تقسیم کی اور عزیز نیازی کی اولادوں کو بھی زمین کے کچھ حصے کا حق دار بنایا۔

مبرم نے عزیز نیازی کو نہ صرف معاف کیا تھا' نہ سزا سنائی۔ ان کے لیے یہی سزا کافی تھی کہ وہ اپنوں کے سامنے بے نقاب ہو گئے تھے اور اس سزا کا کوئی اختتام بھی نہیں تھا۔

ویرا اور اس نے اپنے لیے محبت بھرے ایک گھر کی بنیاد رکھی تھی۔

اپنی جنت میں مگن وہ کبھی کبھی نیاز پور کے اس حاکم کے بارے میں بے اختیار سوچنے لگتا تھا' جسے ایک گھر اور ایک نسل کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ بنایا گیا تھا' مگر اس نے وقتی لالچ اور خودغرضی کی بنا پر اپنے لیے ان دیکھی آگ خرید لی تھی۔

(تمت بالخیر)